۲۶-۲۷

ششماہی کتابی سلسلہ

قندیلِ سلیمان

جنوری تا دسمبر ۲۰۲۲ء

نظامیہ دارالاشاعت خانقاہِ معلّٰی حضرت مولانا محمد علی مکھڈی ـ مکھڈ شریف (اٹک)

مقالہ نویسی کے لیے قواعد وضوابط

۱۔ مقالہ غیر مطبوعہ ہو اور کسی دوسری جگہ اشاعت کی غرض سے نہ بھیجا گیا ہو۔

۲۔ مقالہ ایم۔ ایس۔ ورڈ میں ۱۲ حجم کے حروف میں کمپوز شدہ ہو اور سوفٹ وہارڈ کاپی کی صورت میں ارسال کیا جائے۔

۳۔ مقالے کے پہلے صفحے پر درج ذیل معلومات بالترتیب درج کی جائیں۔

۴۔ مقالہ نگار کا مکمل نام، عہدہ، ادارہ، ڈاک کا پتہ، گھر / دفتر کا فون نمبر، گشتی فون نمبر، برقی ڈاک کا پتہ، مقالے کے غیر مطبوعہ ہونے کا اعلان دستخط۔

۵۔ ہر مقالے کے ساتھ اس کا انگریزی یا اُردو میں خلاصہ بھی تحریر فرمائیں جو کم از کم ۱۰۰ اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ الفاظ پر مشتمل ہو۔ خلاصے میں ان الفاظ کو خط کشیدہ ہونا چاہیے جو انٹرنیٹ سرچ کے لیے کلیدی الفاظ کے طور پر استعمال ہو سکیں۔ کم از کم پانچ ایسے الفاظ خلاصے میں ضرور شامل کریں جو مقالے کے مختلف پہلوؤں کو محیط ہوں۔ مثلاً اگر کوئی مقالہ جنوبی ایشیا کے ادب سے متعلق ہے تو لفظ خط کشیدہ ہونا چاہیے۔ اگر اس میں کسی خاص شخصیت یا مصنف کا ذکر ہے تو اس شخصیت کا نام خط کشیدہ کر دیا جائے۔ اسی طرح مقالہ جن موضوعات کا احاطہ کرتا ہے انھیں بھی خط کشیدہ کیا جانا چاہیے۔

۶۔ مقالے میں جب پہلی بار کسی اہم شخصیت کا ذکر آئے تو قوسین ( ) میں اس کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات حسبِ موقع درج کیجیے۔ حکمران یا بادشاہ کے تذکرے کی صورت میں دورِ حکومت کے سنین اور کسی اہم کتاب کی صورت میں اس کا سنہ اشاعت لکھا جائے۔

۷۔ اُردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں شخصیات کے نام، کتب کے عنوانات قوسین میں انگریزی حروف میں درج کیے جائیں۔

۸۔ حوالہ جات اور کتابیات کے لیے "قندیلِ سلیمان" کے مروجہ طریق کار کی پیروی کی جائے۔ مثال کے طور پر:

کتاب کا حوالہ:

محرابِ تحقیق، ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر، ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی، ۲۰۱۲ء

فہرست ماخذ / کتابیات میں اندراج۔

گیان نامے بنامِ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مرتبہ: ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، سرمد اکادمی، اٹک، ۲۰۱۳ء

مضمون کا حوالہ:

ڈاکٹر معین نظامی، حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی اور مولانا محمد رمضان مہی شہید، قندیلِ سلیمان، شمارہ نمبر ۱۹ (جولائی تا دسمبر ۲۰۱۸ء) ۲۵۔

ماخذ / کتابیات میں اندراج:

ڈاکٹر عارف نوشاہی، مخطوطاتِ فارسی کتب خانہ مولانا محمد علی مکھڈی، قندیلِ سلیمان، شمارہ نمبر ۲۰ (جنوری تا جون ۲۰۱۹) ۱۳۔ ۲۰

برقی ماخذ:

متعلقہ ویب سائٹ گاہ مکمل پتا اور اس سے استفسادے کی تاریخ ضرور درج کریں نیز اگر ممکن ہو تو جس مضمون کا حوالہ دیا گیا ہے اس کا عنوان اور اس کے مصنف کا نام بھی دیں۔

بہ فیضان

حضرت خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ

بہ یاد

حضرت مولانا محمد علی مکھڈی رحمۃ اللہ علیہ

علم وعرفان کا ترجمان

ششماہی کتابی سلسلہ

قندیلِ سلیمان

جنوری تا دسمبر ۲۰۲۲ء

شمارہ : ۲۷-۲۶

نظامیہ دار الاشاعت

خانقاہِ معلیٰ حضرت مولانا محمد علی مکھڈی ، مکھڈ شریف۔ اٹک

ہدیہ : سالانہ : ۱۰۰۰ روپے

فی شمارہ : ۵۰۰ روپے

رابطہ مدیران : ۰۳۴۳-۵۸۹۴۷۳۷ / ۰۳۴۶۸۵۰۶۳۴۳ / ۰۳۳۳۵۴۵۶۵۵۵

E - mail : sajidnizami۷۷@gmail.com

فہرستِ مندرجات

سفر نامے:

خاکے:

دریچۂ انتقاد:

گوشۂ

حضرت مولانا فتح الدین چشتی نظامیؒ

اداریہ

"فوائد الفواد" ملفوظات حضرت نظام الدین محبوبِ الٰہیؒ کے مرتب امیر حسن سنجریؒ لکھتے ہیں۔

ماہِ محرم کی تئیسویں تاریخ بدھ کے دن سنہ سات سوبارہ (ہجری) قدم بوسی کی دولت حاصل ہوئی۔ اس روز کاتب حسن علائی سجزی کی کتاب "مُخ المعانی" حضرت کی خدمت میں لے گیا تھا۔ بہت تعریف وتوصیف فرمائی۔ اس روز میری بیعت کی تجدید بھی ہوگئی اور اپنے مبارک سر سے کلاہ اُتار کر اس بے چارے غلام (حسن علائی سجزی) کے سر پر رکھی اور دو دفعہ یہ شعر زبانِ گوہر بیان پر آیا۔

در عشقِ تو کارِ خویش ہر روز

از سر گیرم زہے سروکار

(آپ کے عشق میں اپنے کام کو ہر روز نئے سرے سے شروع کرتا ہوں۔ اس تعلق کے کیا کہنے۔)

میں جو کتاب لے گیا تھا۔ اس کی مناسبت سے فرمایا کہ کتابوں میں سے جو مشائخ نے لکھی ہیں۔ "روح الارواح" بہت راحت بخش اور بہت اچھی کتاب ہے۔ زبان مبارک سے ارشاد ہوا کہ قاضی حمید الدین ناگوری کو یہ کتاب حفظ تھی۔ بر سر منبر اس میں سے بہت کچھ بیان فرماتے۔ اور ان کتابوں میں سے جو قدیم لوگوں نے لکھی ہیں۔ "قوت القلوب" عربی میں اور "روح الارواح" فارسی میں اچھی کتابیں ہیں۔ بندے نے عرض کی کہ "مکتوباتِ عین القضاۃ" بھی ایک اچھی کتاب ہے۔ البتہ اس پر پوری طرح عبور نہیں ہوتا۔ ارشاد ہوا کہ ہاں وہ ایک حال کے عالم میں لکھی گئی ہے۔ وقتِ خاص جو انھیں کا حصہ تھا اس وقت لکھی ہے۔ اس کے بعد زبانِ مبارک سے ارشاد فرمایا کہ وہ پچیس سال ہی کے تھے کہ انھیں سوختہ کیا گیا۔ (جلایا گیا)

عجب کام تھا اس عمر میں کہ جوانی کے جوش کی انتہا ہوتی ہے۔ ان کا اس قدر حق میں مشغول ہونا اور تعلق رکھنا۔ یہ بہت ہی حیرت ناک کام تھا۔

سلسلہ چشت کے صوفیہ کے ہاں کتاب کے ساتھ جو جڑت رہی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ صوفی کی خانقاہ میں لنگر خانہ اور مہمان خانہ کے ساتھ ایک شاندار مدرسہ اور کتب خانہ بھی ہوا کرتا تھا۔ جو اب صرف لنگر خانہ و مہمان خانہ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ البتہ بعض خانقاہوں میں اب بھی مدارس و کتب خانہ کی باقیات موجود ہیں۔ لیکن وہ اس طرح فعال نہیں جیسے آج سے ایک دو صدی

قبل تھے۔ اِسے زمانے کا پھیر کہیں یا کوئی اور نام دیں۔ ۲۱ویں صدی کی تیسری دہائی ہم پر بیت رہی ہے۔ پرنٹ میڈیا، سوشل میڈیا اور نہ جانے کون کون سے میڈیا میدان میں اُتر آئے ہیں۔ اِن کی دیکھا دیکھی بعض خانقاہوں میں مدارس اور کتب خانوں کی فعالیت پر کام ہو رہا ہے۔ اب کس خلوص کے ساتھ اور کن پیرامیٹرز پر ہو رہا ہے۔ وقت اس کا فیصلہ کرے گا۔

مکھڈ شریف میں خانقاہ حضرت مولانا محمد علی مکھڈیؒ پر بھی کئی صدیوں سے کتاب اور کتب خانہ کی روایت چلی آتی ہے۔ اڑھائی صدی قبل حضرت یہاں تشریف لائے۔ ایک روایت کے مطابق آپ ۱۷۷۲ء کے بعد ایک طالب علم کی حیثیت سے "بٹالہ" ضلع گورداس پور سے تشریف لائے تھے۔ آپ کے استادِ گرامی مولانا محکم الدین مکھڈیؒ کی کشش انھیں اس دور دراز خطے تک لے آئی تھی۔ بٹالہ سے بہاولپور، پھر جسیال، تلہ گنگ (حال، چکوال) اور آخرِکار دریائے سندھ کے کنارے آباد اس چھوٹے سے قصبے مکھڈ میں آن ڈیرے جمائے۔ جہاں اُس وقت ہندو آبادی زیادہ تھی۔ وہی تجارت و معیشت پر قابض تھے۔ سکھ بھی ایک بڑی تعداد میں موجود تھے لیکن مسلمانوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی اور وہ اس آبادی میں اپنا اثر ورسوخ بھی رکھتے تھے۔ اگرچہ ہندو انھیں یہاں اپنے کاروبار میں شامل نہیں کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ بخارا و سمرقند اور ایران و جنوبی ہندوستان تک اپنے کاروبار کو پھیلائے ہوئے تھے۔

اٹھارویں صدی کی ساتویں دہائی میں اہلیانِ مکھڈ کا اپنے دھرم کے ساتھ تعلق بہت مضبوط تھا۔ مولانا محکم الدین مکھڈیؒ کا دینی مدرسہ مکھڈ کی مرکزی جامع مسجد میں قائم تھا۔ جو دریائے سندھ کے تجارتی پتن "لونڑاں والا پتن" سے مکھڈ کے مرکزی اور تجارتی رستے "لونڑاں والی گلی" سے ہوتا ہوا بازار کے گنجان آباد حصے میں جا نکلتا۔ مولانا محکم الدین مکھڈیؒ کا مسجد و مدرسہ اہلِ علم کے لیے کسی اسلامی علمی مرکز سے کم نہ تھا۔ بعد ازاں اسی مسجد و مدرسہ کی خدمت حضرت مولانا محمد علی مکھڈیؒ کے سپرد ہوئی۔ آپ کو قبولیت کا وہ درجہ ملا کہ مسجد آپ کے نام سے جانی اور پہچانی جانے لگی۔ صدیوں پر محیط اس مسجد و مدرسہ کی تاریخ اور اس کی عمارت آج بھی اس عظیم دورِ رفتہ کی یاد دلاتی ہے۔ آج یہ مسجد مولوی صاحب کے نام سے جانی اور پہچانی جاتی ہے۔

۱۷۸۴ء / ۸۵ء میں مولانا محمد علی مکھڈی کے استادِ محترم مولانا محکم الدین مکھڈیؒ کا مکھڈ سے باہر کسی اور مقام پر وصال ہونا اور مولانا مکھڈیؒ کا یہاں سے کوچ کا ارادہ، مکھڈ کے باسیوں کا اس علمی مرکز سے وابستگی کا ثبوت اس اسلامی علمی مرکز کی نئی تاریخ رقم کرنے جا رہا تھا۔ مولانا مکھڈی جب بڑی بے تابی سے اپنا سامان لپیٹ رہے تھے اور اپنے ذہن میں کسی اور علمی مرکز کی تلاش کا خواب بُن رہے تھے۔ خدائے علیم و خبیر اہلیانِ مکھڈ کی تقدیر کو ایک علمی و تربیتی خانقاہی نظام کے زیر اثر لا کر انھیں سرخیل و بامراد کرنے کے ارادے باندھ رہا تھا۔ پھر زمانہ شاہد ہے کہ یہ مرکز پیر پٹھان شاہ محمد سلیمان تونسویؒ کی جلائی ہوئی شمع "قندیلِ سلیمان" کے فیضان اور

توجۂ خاص سے اپنے دور کی ایک اسلامی یونیورسٹی کے طور پر علمی دُنیا پر آشکار ہوا۔ زمانے نے دیکھا کہ جب اہلِ مکھڈ نے اپنی مرادیں مولانا سے وابستہ کیں تو ان کی نسلیں تک سنورتی چلی گئیں۔ پھر کیا تھا یک ایک مسجد کے حجروں میں قائم یہ ادارہ مہار شریف (بہا ولنگر) سے میاں عابد جی مہارویؒ، انگہ شریف (خوشاب) سے حضرت مولانا زین الدین المعروف بہ زینت الاولیاء، سیال شریف سے حضرت مولانا شمس الدین سیالویؒ جیسی ہستیوں کو اپنی جانب کشاں کشاں لے آیا۔

علاوہ ازیں یہاں ایک طرف سمرقند و بخارا، روس کی مختلف ریاستوں اور ایران و افغانستان سے اہلِ علم کے قافلے مکھڈ جیسی دور اُفتادہ بستی میں اُترنے لگے تو دوسری طرف لاہور و دہلی، ملتان و سندھ، اجمیر و دکن اور ممبئی و کلکتہ تک اس کا علمی شہرہ بڑھتا چلا گیا۔ علی گڑھ و رام پور، کان پور و لکھنؤ اور بٹالہ (گورداسپور) و امرت سر تک کے طلبا یہاں سے فیض حاصل کرنے جوق در جوق پہنچنے لگے۔

اسلامی دنیا کا کوئی مطبع یا پبلشر ایسا نہ تھا جو عربی و فارسی یا پنجابی و پشتو زبان میں کوئی کتاب شائع کرتا اور اُس کی کم از کم ایک کاپی مکھڈ کتب خانہ کے لیے بڑے اہتمام اور خلوص کے ساتھ پیش نہ کی جاتی۔ ان میں اواسط (مصر)، استنبول (ترکی)، عرب ممالک، ایرا ن و افغانستان، کان پور، نول کشور، (لکھنؤ)۔ دہلی، رام پور، کلکتہ، لاہور، ملتان۔ کراچی و پشاور اور حیدر آباد دکن کے مطابع شامل ہیں۔

خود مولانا ۱۷۸۴ء / ۸۵ء میں مسندِ تدریس پر براجمان ہوئے۔ تو قریباً ۲۳ سال بعد ۱۸۰۷ء میں سیال شریف کا شاہزادہ حضرت شمس الدین سیالوی میکی ڈھوک میں ابتدائی تعلیم حاصل کر لینے کے بعد اپنے ماموں احمد دینؒ کے ہم راہ مکھڈ وارد ہوا۔ آپ نے یہاں ۱۸۲۰ء تک تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں ۱۸۳۴ء میں گڑھی افغانہ (ٹیکسلا، راولپنڈی) سے سید محمد فاضل شاہؒ مولانا مکھڈی کی بیعت کے ارادے سے مکھڈ وارد ہوئے۔ مولانا مکھڈیؒ نے حسبِ معمول جو اُن کا طرزِ عمل تھا کہ عامی کو فوراً بہ حکمِ خواجہ پیر پٹھان بیعت فرما لیتے لیکن علما کو اپنے ساتھ تونسہ مقدسہ لے جا کر بارگاہِ پیر پٹھان میں پیش کرتے۔ حضرت سید فاضل شاہؒ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہوا۔ یوں آپ پیر پٹھان تونسویؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو کر فیض یافتگانِ پیر پٹھان میں شامل ہو گئے۔

مولانا محمد علی مکھڈیؒ کے وصال کے بعد یکے بعد دیگرے اُن کے خلفا نے علمی و تربیتی حوالوں سے اس درس گاہ کو عالمِ اسلام کی ایک اہم دینی و ملی درس گاہ کے طور پر علمی دُنیا کے سامنے روشناس کرایا۔ مولانا غلام محی الدین احمد اور ان کے تینوں صاحبزادوں مولانا احمد الدینؒ، مولانا محمد الدینؒ، مولانا غلام زین الدینؒ اور پھر اُن کی اولاد نے تاحال اپنے بزرگوں کے مشن کو جاری و ساری رکھا ہوا ہے اور روز بہ روز اس میں امکانی صورتوں کے ساتھ بڑھوتری ہو رہی ہے۔ اللھم زد فزد

***

قندیلِ سلیمان کا چھبیسواں اور ستائیسواں شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ اس شمارے میں سلسلۂ چشت کے سرخیل صوفیا کے احوال و آثار اور اُن کی تعلیمی و تربیتی خدمات پر گراں قدر تحریریں شامل ہیں۔ گوشۂ عقیدت میں شوکت محمود شوکت کی حمد، ناصر بشیر کی نعت اور جمشید کمبوہ کی منقبتِ پیر پٹھان شامل ہے۔

خیابانِ مضامین میں ڈاکٹر عارف نوشاہی کا "مخطوطاتِ فارسی، کتب خانہ مولانا محمد علی مکھڈی" کی قسط ششم شائع کی جارہی ہے۔ اس میں عددِ مسلسل نمبر "١٥١ تا ١٨٠" فارسی مخطوطات کو شامل کیا گیا ہے۔ موصوف مخطوطہ شناسی اور مخطوطات کی فہرست سازی کے میدان کے شہ سوار ہیں۔ فارسی مخطوطات پر تحقیقی و تنقیدی نظر رکھنے والا ایک ایسا نام جو اپنی ذات میں ایک ادارہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اہلِ فکر و نظر کے ہاں ان کے کام پذیرائی ہی اُن کی پہچان ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر غلام شمس الرحمٰن کا مقالہ "خواجہ حافظ جمال اللہ ملتانیؒ کے تذکار کا تعارفی و متنی مطالعہ" ایک ایسی تحریر ہے جس نے ١٣ویں صدی ہجری کے ابتدائی عشروں میں پروان چڑھنے والی سلسلۂ چشت کی ملتانی خانقاہ کی داستان کو ایک ایسے رنگ میں بیان کر دیا ہے کہ جو اپنی مثال آپ ہے۔ یہ مضمون بذاتِ خود ایک الگ کتاب کا موضوع ہے جو جلد ان شاء اللہ کتابی صورت میں شائع کیا جائے گا۔ پیر پٹھان کے پیر بھائی خواجہ حافظ جمال اللہ ملتانیؒ کی خانقاہ کا تدریسی و تربیتی نظام کا ایسا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ انسان اس کے سحر سے باہر نکل ہی نہیں سکتا۔ ایک ایسی تصویر جس میں گیان دھیان سب گم ہیں۔

صاحبزادہ منیب مسعود چشتی نظامی خانقاہ ناڑہ شریف، بسال (اٹک) کے چشم و چراغ ہیں۔ علم حدیث کے ساتھ اُن کا شغف اور محبت دیدنی ہے۔ علم حدیث کے طالب علم کی حیثیت سے ہمیشہ اس کی خدمت پر اپنے آپ کو مامور کیے ہوئے ہیں۔ "سلسلۂ عالیہ چشتیہ نظامیہ کی خدمتِ حدیث" ان کا اسی نوعیت کا ایک اہم کام ہے۔ جس میں خاص طور پر سلسلہ چشت کے ایک صوفی عالم حدیث حضرت خواجہ حسن الزماں حیدر آبادی کی خدماتِ حدیث کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر عطاء المصطفیٰ مظہری کا مقالہ "مختلف المسالک چکڑالوی علما: مولانا عبد اللہ چکڑالوی کی آرا کا تنقیدی جائزہ" علمی و تحقیقی لحاظ سے پُر مغز مقالہ ہے۔ میانوالی کے علمی و ادبی آثار پر ڈاکٹر صاحب کی خدمات لائقِ تحسین ہیں۔ گانگوی علما پر آپ کی شخصیت تخصص کا درجہ رکھتی ہے۔

علامہ محمد طفیل احمد مصباحی کی تحریر "حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے علمی و ادبی آثار" اور علامہ حافظ محمد دلشاد خاں چشتی لطیفی کا مضمون "قطب الاقطاب حضرت شاہ عبد اللطیف چشتی۔ احوال و آثار" اپنی نوعیت کی منفرد تحریریں ہیں۔ یہ دونوں

صاحبان سرحد پار سے ہمارے مہربان لکھاری ہیں۔ ان کی محبت اور خلوص کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ امید ہے کہ آئندہ بھی ان کا علمی تعاون ہمیں حاصل رہے گا۔

نوجوان لکھاری احمد سہر وردی کا مضمون "محمد تاج الدین تاج۔ احوال و آثار" درس گاہ مولانا کھڈی کے ایک طالب علم کے احوال پر مشتمل ہے جو مولانا محمد احمد الدین کھڈی کے شاگرد اور دامن گرفتہ تھے۔

"قندیل سلیمان" کے باقی سلسلے گذشتہ سے پیوستہ ہیں۔ البتہ "خاکے" کے عنوان سے دو تحریریں اس بار شامل کی گئی ہیں۔ ایک تحریر میں استادِ مکرم "ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد" کا خاکہ اور دوسری میں "بابا عبد الرحمٰن" کلید بردار کتب خانہ مولانا محمد علی کھڈی کا خاکہ شامل ہے۔ دونوں تحریریں منفرد اور دلچسپی سے بھرپور ہیں۔ جناب یاسر اقبال اور پروفیسر شوکت محمود شوکت کی خاکہ نگاری نئے در وا کرتی نظر آتی ہے۔

----

۲۴ محرم الحرام ۱۴۴۴ھ / ۲۳، اگست ۲۰۲۲ء کو والدِ گرامی ہمارے سرپرست و مربی مولانا فتح الدین چشتی نظامی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ اُن کی علمی و سماجی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ دردِ دل رکھنے والے عظیم انسان تھے۔ ہمیشہ دوسروں کی خیر خواہی کا سوچتے رہتے تھے اور عملی طور پر بغیر کسی تفریق کے دوسروں کی مدد کرنے کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اُن کی علمی و سماجی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے "قندیلِ سلیمان" میں اُن کے نام کا ایک گوشہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ تشنگی ابھی باقی ہے۔ لیکن جن اساتذہ اور احباب نے اپنی یادیں و ملاقاتیں اور منظومے بھیجے ہیں۔ ادارہ اُن کی اس محبت کے لیے ممنون ہے۔

مدیر

گوشۂ عقیدت

حمدِ باری تعالیٰ

شوکت محمود شوکتؔ☆

خداوندا ! عطا کر دے مجھے نورِ ایمانی
کہ مہر و مہ کو شرما دے ، مرے چہرے کی تابانی

تری تعریف ہو مجھ سے ، نہیں ممکن ،نہیں ممکن
کہاں یہ بندۂ خاکی ، کہاں تری ثنا خوانی

تری وحدت ، زبان و قلب سے تسلیم کرتا ہوں
نہ ہے ہم سر ترا کوئی ، نہ ہے تیرا کوئی ثانی

عطا مجھ کو مرے مولا! حیاتِ جاودانی ہو
کہ دنیا مختصر ہے اور تیرا ذکر طولانی

ترے احکام جو مانے ، وہی تو سرخ رو ٹھہرا
اسے خوار و زبوں دیکھا ، تری جس نے نہیں مانی

نظر جس سمت اُٹھتی ہے ، نظر آئے ترا جلوہ
یہی عشقِ حقیقی ہے ، یہی رمزِ مسلمانی

وہ دنیا ہو کہ عقبیٰ ہو ، نہیں ہے خوف شوکتؔ کو
ترا جب آسرا ہے تو بھلا کیا ہو پریشانی

☆☆☆

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

ناصر بشیر

عالَمِ جہل میں نُور ، آپ کے پیغام سے ہے
یہ جو خُورشید ہے ، یہ اور کسی کام سے ہے

سر جھکائے ہوئے آتے ہیں شہنشاہ جہاں
بھیک اُس دَر کی فزوں خلعت و اِنعام سے ہے

آپ کے روضے کی دیوار سے لگ کر جو کٹی
لُطف جینے کا اُسی صبح ، اُسی شام سے ہے

ایک دِن ساقیِ کوثر جو پلائیں گے مجھے
میری رَگ رَگ میں نشہ ایک اُسی جام سے ہے

لے کے جائے گی یہی سُوئے مدینہ اِک دِن
ایک اُمید مجھے گردشِ ایّام سے ہے

میرے کانوں میں جو اُترا تھا اذاں کے رَستے
"نَبضِ ہستی ، تپش آمادہ اُسی نام سے ہے "

آپ کی نسبتِ عالی کے سبب ہے ناصرؔ
جو عقیدت مجھے طیبہ کے در و بام سے ہے

☆☆☆

صدرِ ایوانِ ولایت حضرت خواجہ شاہ سلیماں تونسوی رحمۃ اللہ علیہ

جمشید کمبوہ

دینِ حق کے ترجماں ہیں ، شَہ سلیماں تونسوی
عکسِ نقشِ جاوِداں ہیں ، شَہ سلیماں تونسوی

معرفت کا آسماں ہیں ، شَہ سلیماں تونسوی
مثلِ خاور ، ضَو فِشاں ہیں ، شَہ سلیماں تونسوی

خسروِ فقر و تصوف ، باغ بانِ معرفت
شہر یارِ ہر زماں ہیں ، شَہ سلیماں تونسوی

بُوذر و سَلمان کے زُہد و ورَع کے عکس گر
فقر کے رُوحِ رواں ہیں ، شَہ سلیماں تونسوی

صدرِ ایوانِ فضیلت ، مہبطِ صدق و صفا
نازِشِ کرّو بیاں ہیں ، شَہ سلیماں تونسوی

مَشعلِ بزمِ وِلا ، فانوسِ قصرِ اصفیا
فخر و نازِ نُوریاں ہیں ، شَہ سلیماں تونسوی

آیئے ! اُن کے سخی دربار میں ، با صدقِ دل
دُر فشاں صاحبِ قراں ہیں ، شَہ سلیماں تونسوی

تکیہ گاہِ عارفان و دُودمانِ مُقبِلاں
قبلہ گاہِ عاشِقاں ہیں ، شَہ سلیماں تونسوی

فیض بخش و فیض بیز و فیض خیر و فیض دِہ
فیض کا گنجِ گراں ہیں ، شَہ سلیماں تونسوی

حق فروغ و حق فروز و حق نگار و حق مدار
حق زُبان و حق بَیاں ہیں ، شَہ سلیماں تونسوی

ہاتھ میں ، تبلیغِ ملت کا عَلَم تھامے ہوئے
ہِند میں ، حق کی اذاں ہیں ، شَہ سلیماں تونسوی

از پئے نُورِ محمد ، فخرِ دِیں ، گنجِ شکر
ارمُغانِ چشتیاں ہیں ، شَہ سلیماں تونسوی

ہوں کھڈی ، مِیر احمد ، مِہر یا جان و قمر
سب کے ، مِیرِ کارواں ہیں ، شَہ سلیماں تونسوی

اُن کے درسِ پاک میں ہے ، عشق و مستی کا چلَن
عشق و مستی کا جہاں ہیں ، شَہ سلیماں تونسوی

عُمر بھر ، اسلام کی ترویج میں کوشاں رہے
شرع و دِیں کے نغمہ خواں ہیں ، شَہ سلیماں تونسوی

مدح گویانِ کرامت ، ہیں زَمَن اندر زَمَن
ہر صدی کی داستان ہیں ، شَہ سلیماں تونسوی

روز و شب ،سیراب ہوتی ہیں ، دِلوں کی کھیتیاں
کیف کی جوئے رواں ہیں ، شَہ سلیماں تونسوی

اَنجمن در اَنجمن ہے ، اُن کا ذکرِ دِل نشیں
راحتِ قلبِ تپاں ہیں ،شَہ سلیماں تونسوی

اُن کے ہیں اَلطافِ سَرمد ، ہند و پاکستان میں
کارواں در کارواں ہیں ، شَہ سلیماں تونسوی

کس طرح ، جمشیدؔ ، اُن کی عظمتیں ، ہوں گی رَقم ؟
جگمگاتی کہکشاں ہیں ، شَہ سلیماں تونسوی

☆☆☆

خیابانِ مضامین

مخطوطاتِ فارسی کتب خانہ مولانا محمد علی مکھڈی

ڈاکٹر عارف نوشاہی☆

قسط ششم

(مخطوطات ۱۵۱ تا ۱۸۰)

(۱۵۱)

شرح مخزن الاسرار

موئف: نظامی

شارح: محمد بن رستم بن احمد بن محمود بدر خزانۃ البلخی المعروف بکری (دیباچہ)

آغاز (شرح): ہست کلید در گنج حکیم...در افتتاح کتاب تقدیم مصراع اول بر تسمیہ بہ سبب آن کرد کہ تسمیہ.

ö نستعلیق، نام کاتب و تاریخ کتابت ندارد، قرن ۱۲ق،۲۴۱ ورق ،ناقص الاول.

(۱۵۲)

شرح مخزن الاسرار

موئف: نظامی

شارح: ابراہیم تہتہی (دیباچہ). معنون بہ امیری با نام یوسف محمد خان.

آغاز:شکر بی حد و سپاس بی عد حکیمی را سزد کہ بہ مقتضای حکمت بالغہ قدرتِ کاملہ لسان را.

شرح: ہست کلید درگنج حکیم... مراد از گنج،فرقان حکیم حمید و قرآنِ مجید است کہ گنج لطایف جواہر احکام.

ö نستعلیق، کاتب میان روزی ولدِ میان روشن مرحوم سکنہ ترک(ترگ، تحصیل عیسیٰ خیل،میانوالی) ، دویم شہر ذی الحج ۱۲۷۶،۱۳۵ورق.

☆ ادارۂ معارف نوشاہیہ،۶۹ ماڈل ٹاؤن، ہمک،اسلام آباد

naushahiarif@gmail.com

(۱۵۳)

شرح یوسف وزلیخا/ شرح محبت نامہ

مولف: جامی

شارح: محمد گل بن محمد نور بن محمد قاسم بن حضرت عبداللہ المعروف حاجی بہادر نقشبندی کوہاٹی (دیباچہ)

آغاز: حمد مر صانع کہ مصر فلک را بہ یوسف بہ آراستہ و حمام دلوہ را بہ شمسہ شمس پیراستہ... و اطناب سرادقات خیمہ رسالتِ محمدی را بہ اوتاد چہار یار اعنی صحابہ کبار متعلق فرمودہ.

شرح: الہی غنچہ امید بگشای... یاء الہی برای خطاب است و تواند کہ برای نفس کلمہ باشد چنانچہ در فلانی و الہی منادا باشد.

ö نستعلیق، گل حسین ،بہ روز سہ شنبہ بیستم ماہِ رمضان مبارک ، پنجم ماہ چیتر ۱۲۴۵ق، با حواشی متعدد،۵۳ ورق.

(۱۵۴)

شرح یوسف وزلیخا/ شرح محبت نامہ

مولف: جامی

شارح: محمد بن غلام محمد گلہوی.

نستعلیق، عبدالمجید،کاتب نے تاریخ معکوس ۹۴۱۲ لکھی ہے، وہ ۱۲۹۴ لکھنا چاہتا ہے، نزد روضہ مطہرہ مولوی صاحب[مولوی محمد علی مکھڈ شریف]،۲۴۱ورق.

(۱۵۵)

محمدیہ/ شرح پندنامہ

مولف: منسوب بہ فرید الدین عطار.

شارح: محمد بن غلام محمد گلہوی.

ö نستعلیق، حافظ اللہ جوایامہاروی،۱۲۸۸ق،۹۶ ورق.

(۱۵۶)

ہدیۃ الروایح فی حل تحفۃ النصایح (فقہ)

مولف: مولانا یوسف جونپوری مرید خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی (دیباچہ)، بعض مآخذ میں یوسف گدا معروف بہ شاہ راجو قتال دہلوی

شارح: محمد بن غلام محمد گلہوی.

آغاز: الحمد لمن نورالسموات والارض حمدا کثیرا... اما بعد می گوید... چون کتاب والا نصاب تحفۃ نصایح ... متداول بین الانام و پسند خاطر خاص و عام است.

شرح: حمدی بگویم بی عدد مر خالق جن و بشر... حمدی بہ یای عظمتہ است چنانکہ لفظ بی عدد بران دال است.

ö نستعلیق، حافظ اللہ جوایامہاروی، بہ وقت قبل زوال، چہار شنبہ، ۱۶ ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ، ۱۹۷ ورق.

(۱۵۷)

بوستان

سعدی شیرازی

آغاز:

بہ نام جہاندار جان آفرین/ حکیم سخن بر زبان آفرین

ö نستعلیق، کاتب عبدالجید، روزشنبہ، بہ وقت نیم روز، موضع گاڑ، علاقہ پنج بھاٹہ، تھانہ حسن ابدال، تحصیل ہزرو [کذا: حضرو]، ضلہ [کذا: ضلع] راول پنڈی، ۱۲۶ ورق.

(۱۵۸)

بوستان سعدی

ö نستعلیق، سدہ ۱۳ق، ۱۰۵ ورق، ناقص الآخر.

(۱۵۹)

بوستان سعدی

ۃ نستعلیق، سده ۱۳ق،نادر شاه، ۱۶۹ورق.

(۱۶۰)

بوستان سعدی

ۃ نستعلیق، سده ۱۳ق، آخرین ورق ندارد، ۱۴۹ورق.

(۱۶۱)

بوستان سعدی

ۃ نستعلیق، سده ۱۳ق،۱۳۸ ورق.

(۱۶۲)

بوستان سعدی

ۃ نستعلیق، سده ۱۳ق،۱۵۰ ورق.

(۱۶۳)

بوستان سعدی

ۃ نستعلیق، سده ۱۳ق،۱۶۸ ورق.ناقص الآخر

(۱۶۴)

گلستان سعدی

ö نستعلیق، سدہ ۱۳اق،۸۷ورق، در آغاز یادداشتی مورخ ۱۵ ذیقعدہ ۱۲۴۶ در عمل حکومت ملک اللہ یار خان باغوال.

(۱۶۵)

گلستان سعدی

ö نستعلیق، میاں قطب الدین، سدہ ۱۳اق،۶۶ورق.

(۱۶۶)

گلستان سعدی

ö نستعلیق، تاریخ ر روز چہارشنبہ وقت ضحیٰ. کاتب نے سال کتابت معکوس ۲۷۱۱ لکھا ہے وہ ۱۱۲۷ لکھنا چاہتا ہے، ۱۰۸ ورق.

(۱۶۷)

گلستان سعدی

ö نستعلیق، قرن ۱۲اق، ۱۵۶ ورق.

(۱۶۸)

گلستان سعدی

ö نستعلیق، قرن ۱۲اق، ۱۱۴ورق.

(۱۶۹)

گلستان سعدی

ö نستعلیق، کاتب دراب ساکن موضع کنڈ عرف اورمال؟ اورعبداللہ ساکن کنڈ مورخ ۱۲۶۳ کے دستخط،با دو مہر: عبدہ دراب؛ محمد علی، حواشی منقول از شرح محمد اکرم ملتانی، ۹۰ ورق.

(۱۷۰)

شرح بوستان سعدی

شارح: عبدالواسع ہانسوی.

آغاز: ربنا لا تواخذنا ان نسینا او اخطانا... معترف بہ عجز و نادانی در فہم الفاظ و درک معانی عبدالواسع ہانسوی کہ اگرچہ این ہیچدان را طاقت و لیاقت و بضاعت و استطاعت آن نبود.

شرح: بہ نام جہاندار جان آفرین... مضمون این بیت قایم مقام ترجمہ بسم اللہ الرحمن الرحیم است.

ö نستعلیق، کاتب قل احمد بن یار محمد بن عبدالرسول، روز چہارشنبہ، وقت چاشت ،۱۹محرم ۱۲۰۷ھ، ۸۴ ورق.

(۱۷۱)

شرح گلستان سعدی / شرح عربی گلستان سعدی

شارح: اگرچہ نسخہ ناقص الاول ہے لیکن مقابلے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ مصطفیٰ بن شعبان سروری ترک (م:۹۶۹ھ) کی عربی شرح ہے۔

ö نستعلیق، بہ روز سہ شنبہ، در ماہ ربیع الآخر سیزدہم ۱۲۸۶ھ، در موضع لنگریال، برای پاس خاطر صاحب مولانا و مرشدی میان صاحب کھڈ شریف والہ [والا]، از دستخط فضل احمد عرف قریشی موضع جبی شاہ دلاور والی،۲۲۹ورق.

(۱۷۲)

شرح گلستان سعدی / محمدیہ

شارح: محمد اکرم ملتانی.

آغاز: منت خدایی را کہ نضارت بہار نامش بر ورق زمان شرح گلستان نمود.

ۃ نستعلیق، وقت الزوال، یوم الخمیس فی سنہ ۱۲۷۶، ۱۶۱ورق.

(۱۷۳)

شرح بوستان سعدی / محمدیہ

شارح: محمد بن غلام محمد گلہوی

آغاز: الحمد للہ رب العالمین...امابعد عرض می رساند راجی الی رحمتہ اللہ تعالی العلام الصمد محمد بن غلام محمد.

شرح: بہ نام جہان دار جان آفرین... پس مضمون این بیت با بیت بیت لاحقہ مودی حمد است و ہم قایم مقام بسم اللہ الرحمان الرحیم.

ۃ نستعلیق، سید نادر شاہ، ربیع الآخر ۱۲۸۲ ہجری ،۱۹۳ورق.

(۱۷۴)

شرح بوستان سعدی / محمدیہ

شارح: محمد بن غلام محمد گلہوی

ۃ نستعلیق، قرن ۱۳ق، ۲۱۷ورق.

(۱۷۵)

شرح بوستان سعدی

شارح: محمد بن غلام محمد گلہوی.

ۃ نستعلیق، قرن ۱۲ھ، ۱۲۵ ورق ،ناقص الآخر.

(۱۷۶)

شرح بوستان سعدی

شارح: عبدالواسع ہانسوی.

ۃ نستعلیق، قرن ۱۳ق، ناقص الآخر،۲۷۹ورق.

(۱۷۷)

سکندرنامہ(برّی)/شرف نامہ

مؤلف: نظامی گنجوی.

آغاز: خدایا جہان پادشاہی تراست.

ۃ نستعلیق، قرن ۱۲ق، آخر سے ایک ورق ناقص ہے.

(۱۷۸)

سکندرنامہ(برّی)/شرف نامہ

مؤلف: نظامی گنجوی.

ۃ نستعلیق، محمد بن جان محمد،۶ ذی الحجہ، روز پنجشنبہ، وقت ظہر، در مسجد قاضی صاحب، ۱۸۰ورق.

(۱۷۹)

سکندرنامہ(بحری)

مؤلف: نظامی گنجوی.

آغاز: خرد ہر کجا گنجی آرد پدید

ۃ نستعلیق، عبدالرحمان، موحل یںگری ؟در قصبہ راہوان؟ من مضاف صوبہ لاہور،۱۳۸ ورق.

(۱۸۰)

سکندرنامہ برّی

نظامی گنجوی.

ö نستعلیق، حیات الله بن محمد مراد کھوکھر، ۲۴ محرم ۱۰۸۵، در بلده دارالخلافه شاه جهان آباد، در مسجد اکبر آباد، ۳۹۱ ورق.

☆☆☆

خواجہ حافظ جمال اللہ ملتانیؒ کے تذکار کا تعارفی و متنی مطالعہ

پروفیسر ڈاکٹر غلام شمس الرحمن☆

اٹھارویں صدی عیسوی کے آخری دو عشروں میں خواجہ حافظ محمد جمال اللہ ملتانیؒ (۵ جمادی الاول، ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء) نے ملتان میں چشتی درگاہ قائم کی۔ جہاں انھوں نے روحانی تربیت کے ساتھ علوم و فنون کی بھی تعلیم دی۔ جس کے نتیجے میں متعدد علماء و فضلاء اس خطہ میں پیدا ہوئے، باوجود اس کے کہ اس دور کے سیاسی و سماجی حالات بہت دگرگوں تھے۔ مشرقی طرف دہلی زوال پذیر تھا جبکہ مغربی طرف درانی حکمرانوں کے باہمی تنازعات کے باعث کابل اپنی طاقت برقرار نہ رکھ سکا اور اس کا کنٹرول اپنے زیر انتظام ملتان پر بھی کمزور پڑ گیا تھا۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ ملتان مسلسل سکھوں کے حملوں کی زد میں تھا۔ جس کے باعث مقامی طور پر خوف وہراس کی کیفیت تھی۔ چنانچہ اس عہد کے ملتان کی تاریخ افغان۔ سکھ اور بعد ازاں سکھ۔ انگریز تصادم کے تناظر میں مرتب کی گئی۔ جس میں سماجی و ثقافتی اور علمی زندگی کے حوالے سے بہت کم ریکارڈ کئے گئے۔ تاہم اس دور میں مرتب کیے گئے چشتی صوفیہ کے تذکرہ جات اور ملفوظاتی ادب تاریخ کے ان نظر انداز پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے، جس سے خاص کر ملتان اور جنوبی پنجاب کی تہذیبی و علمی روایت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

خواجہ نور محمد مہارویؒ (۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰ء) اور ان کے خلفاء کے حوالے سے مرتب کیے گئے یہ تذکار اہم علماء و مشائخ اور ان کی علمی و فکری مساعی اور اعیان سلطنت کے ان کے تعلقات کے علاوہ عام آدمی کی زندگی اور اس کے مشاغل کے حوالے سے بھی مفید معلومات اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہیں۔ یہ تذکار زیادہ تر فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں اور متعدد ابھی تک زیورِ طباعت سے محروم ہیں۔ گذشتہ پچاس دہائیوں سے بعض اہلِ علم نے اس ورثہ کی طرف توجہ دی ہے۔ جس کی وجہ سے ان میں سے بعض کتابوں کے اُردو تراجم منظر عام پر آئے۔ تاہم ان کا مطالعہ اس انداز سے نہیں کیا گیا کہ جس سے ان کو اس عہد کی تعلیمی و سماجی تاریخ کی تفہیم ہو سکے۔

زیر نظر مقالہ میں حافظ جمالؒ کے حوالے سے لکھے گئے تین تذکار (خصالِ رضیہ، انوارِ جمالیہ اور اسرار الکمالیہ) کا تعارفی و متنی مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہ تینوں تذکرے حافظ جمال کے شاگردوں نے مرتب کیے ہیں جو ان کے براہِ راست مشاہدے اور استفادے پر مبنی ہیں۔ خصالِ رضیہ، علامہ عبدالعزیز پرھاڑویؒ (۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) نے حافظ جمالؒ کی وفات کے تیسرے دن مرتب کی جو کہ بنیادی طور پر ان کی یاداشتوں کا مجموعہ ہے اور عربی زبان میں تحریر کیا گیا ہے۔ جس کو بعد میں فارسی اور اُردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا گیا۔ انوارِ جمالیہ منشی غلام حسن شہیدؒ (۱۲۶۵ھ / ۱۸۵۰ء) کی فارسی تالیف ہے جو تاحال شائع نہیں ہو سکی، البتہ اس کے اُردو تراجم کیے گئے ہیں جو شائع ہو چکے ہیں۔ اسرار الکمالیہ، سید محمد زاہد شاہؒ (۱۲۴۵ھ / ۱۸۲۹ء) کی فارسی تالیف ہے۔ یہ بھی ابھی تک طبع نہیں ہوئی۔

☆چیئرمین: شعبہ مطالعات بین المذاہب، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

اس کتاب کے دو ابواب ہیں۔ پہلے باب میں حافظ جمالؒ کی حیات و خدمات جبکہ دوسرے میں وحدت الوجود کے حوالے سے مصنف نے اپنے افکار بیان کیے ہیں جن کی تشکیل حافظ جمالؒ اور خواجہ خدا بخش خیر پوریؒ (یکم صفر ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء) کی صحبت میں رہ کر ہوئی تھی۔ کتاب کے صرف پہلے باب کا جزوی طور پر اُردو ترجمہ ہو چکا ہے۔

یہ تینوں تذکرہ جات اس لحاظ سے بہت اہمیت کے حامل ہیں کہ حافظ جمالؒ کے حوالے سے مرتب کیے گئے دیگر تمام تذکرہ جات انھیں سے مستفاد ہیں۔ یہ متنی مطالعہ اس طریقہ سے کیا گیا ہے کہ ان تذکرہ جات کے مندرجات کی با آسانی تفہیم ہو سکے۔ اور اس عہد کی علمی و فکری روایت کو جاننے میں مدد مل سکے۔ جس نے زیر اثر اس پر آشوب دور میں بھی ملتان اور اس کے نواح میں عربی، فارسی، اُردو اور سرائیکی کے بلند پایہ علماء و فضلا، ادیب دانشور اور شعراء پروان چڑھے۔ اس حوالے سے علامہ اللہ بخش رضاؒ نے تذکرہ جمالؒ کے عنوان سے حافظ جمالؒ کے احوال و ملفوظات مرتب کیے ہیں۔ جس میں انھوں نے مذکورہ بالا تینوں تذکرہ جات کے ساتھ خواجہ گل محمد احمد پوریؒ (۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء) کی تکملہ سیر الاولیاء، حاجی نجم الدین سلیمانیؒ (۱۲۸۷ھ / ۱۸۷۰ء) کی مناقب المحبوبین اور خواجہ امام بخش مہارویؒ (۲۰ صفر ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۲ء) کی گلشنِ ابرار کے منتخب حصوں کا بھی اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان اہم مصادر سے قارئین کی شناسائی ممکن ہو سکی۔ تاہم یہ مقالہ اول الذکر تینوں مصادر کا متنی مطالعہ ہے۔ خاص کر اسرار الکمالیہ کے دوسرے باب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، جس میں وحدت الوجود اور تصوف کی تعلیمات کے حوالے سے عمدہ مباحث ہیں۔ کتاب کے اس باب کے حوالے نہ تو قدیم تذکروں میں ملتے ہیں اور نہ ہی معاصر محققین نے اب تک اس پر خاص توجہ دی ہے۔

۱۔ حافظ جمالؒ کا تاریخی و علمی پس منظر

اٹھارویں صدی کے برصغیر میں مغل سلطنت کمزور ہو چکی تھی۔ جس میں داخلی و خارجی سطح پر متعدد عوامل کار فرما تھے۔ اس سیاسی و فکری بحران سے عملی طور پر تو مسلمانانِ برصغیر آج بھی باہر نہیں نکل پائے، تاہم اس صورتِ حال نے مسلم مفکرین اور دانشوروں کو سوچنے پر ضرور مجبور کیا اور انھیں اپنے علمی ورثہ پر نظر ثانی کرنے پر آمادہ کیا۔ اس طرح سیاسی زوال کسی حد تک فکری بیداری کا پیش خیمہ بنا۔ چنانچہ اس صدی میں متنوع علمی و روحانی تحریکات وجود میں آئیں جن میں خانوادہ شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی ،(۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء)، متعدد نقش بندی علماء و مشائخ اور علماء فرنگی محل خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن کی مساعی کے باعث سلطنت کے زوال کے باوجود مسلمان اپنی علمی و دینی اور سماجی اقدار و روایات کا وجود برقرار رکھنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔ اسی عہد میں سلسلہ چشتیہ کی بھی تشکیل جدید ہوئی اور جس میں شاہ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ (۲۴ ربیع الاول ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ء) اور ان کے خلیفہ نظام

الدین اورنگ آبادیؒ (۱۲ذی قعد ۱۱۴۲ھ/ ۱۷۳۰ء)کے فرزند ارجمند خواجہ فخر الدین دہلویؒ (۲۷ جمادی الثانی ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۴ء) نے اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر خلیق احمد نظامی (۱۹۹۷ء) اسی بنیاد پر اس عہد کو سلسلہ چشت کی تجدید واحیاء سے تعبیر کرتے ہیں۔[1]

شاہ کلیم اللہ جہان آبادیؒ کا شمار سلسلہ چشت کے ان اکابرین میں ہوتا ہے جنہوں نے تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ قیامِ حجاز نے ان کی فکر پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ جہاں انھوں نے چشتی، نقش بندی اور قادری مشائخ سے اکتساب فیض کیا[2] اور اپنے افکار کو عربی و فارسی میں قلمبند کیا۔ انھوں نے تفسیر، تصوف اور فلسفہ کے میادین میں متعدد کتب تحریر کیں۔ انھوں نے جلالین کی طرز پر قرآنِ مجید کی تفسیر کی اور احکام کی تعبیر فقہ حنفی کے اصولوں کے مطابق کی۔[3] خواجہ کلیم اللہؒ کے مکتوبات کا مجموعہ اس عہد کی علمی، سماجی اور سیاسی منظر نامہ کو واضح کرتا ہے۔ اس مجموعہ میں بیشتر خطوط وہ ہیں جو آپ نے خواجہ شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ کو لکھے۔[4] خواجہ کلیم اللہؒ معاملات میں فقہ حنفی، اعتقاد میں ماتریدی اور طرزِ فکر و سلوک میں صوفی اور فلسفیانہ فکر کے حامل تھے۔ یہ روایت ان کے خلیفہ شاہ نظام الدینؒ اور ان کے بیٹے مولانا فخر الدین دہلویؒ کے ہاں بھی واضح انداز میں پائی جاتی ہے۔

---

[1] نظامی، خلیق احمد، تاریخ مشائخ چشت، تدوین و تخریج: محمد حامد مرتضی چشتی، نثار احمد چشتی، (لاہور: اسلم عصمت پرنٹرز، [ناشر: مشتاق بک کارنر، لاہور] سن ندارد)، ص، ۳۶۷۔

[2] مہارویؒ، خواجہ امام بخش، مخزن چشت، مترجم: پروفیسر افتخار احمد چشتی، (بہاولنگر: مہاروی چشتیہ رباط پبلی کیشنز، ۲۱۰) ص ۲۷۷؛ الکھنوی، عبد الحیی، نزھۃ الخواطر و بھجۃ المسامع والنواظر، (بیروت: دار ابن حزم، ۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء)، ۷۸۹؛ آزاد، سید غلام علی بلگرامی، مآثر الکرام، (لاہور: مکتبہ احیاء العلوم الشرقیہ، [لیتھو اشرف پریس]، ۱۹۷۱ء)، ص، ۱۴۱۔ نوٹ: بلگرامی کے نزدیک آپ کی وفات ۱۱۴۳ھ میں ہوئی اور آپ کی تاریخ ابجد میں ہادی دہر ہے۔

[3] اس تفسیر کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد میں محفوظ ہے۔ جس کے مطابق یہ تفسیر ۱۱۲۵ھ/ ۱۷۱۳ء میں مکمل ہوئی اور صاحب تفسیر نے واضح انداز میں اپنا نقطہ نظر بیان کیا ہے کہ وہ مذہباً حنفی اور مشرباً چشتی صوفی ہیں۔ احمد اختر مرزا، مناقب فریدی، (دہلی: مطبع احمدی، ۱۳۱۴ھ)؛ محمد سالم قدوائی، ڈاکٹر، ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں، (لاہور: ادارہ معارف اسلامی، ۱۹۹۳ء) ص، ۹۸-۹۹

[4] جہان آبادی، شاہ کلیم اللہ، مکتوبات، (دہلی: مطبع یوسفی، ۱۸۸۳ء)۔

[5] مولانا فخر الدینؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے والدِ گرامی سے حاصل کی لیکن وہ ابھی سولہ برس کے تھے کہ ان کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ تاہم انھوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ حافظ اسعد الانصاریؒ سے حدیث، مولانا عبدالحکیمؒ سے فقہ اور میاں محمد جانؒ سے تصوف اور شیخ اکبر محی الدین ابن العربیؒ (۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء) کی تصانیف کا درس لیا۔[6] بعد ازاں آپ دہلی تشریف لے گئے جہاں تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسی شہر کو اپنی دعوتی و تعلیمی مساعی کا مرکز بنایا۔ ان کے حلقہ درس میں حدیث اور تصوف کی خاص طور پر تعلیم دی جاتی تھی۔ تدریس کے ساتھ ساتھ انھوں نے تالیف و تصنیف پر بھی توجہ مرکوز رکھی۔ ان کی تالیفات نظام العقائد، رسالہ مرجیہ، فخر الحسن اور مکتوبات ہیں جو ان کے علم عقیدہ و حدیث پر دسترس کے شاہد عادل ہیں۔[7] سر سید احمد خان (۱۸۹۸ء) نے بھی آپ کی علمیت کا اعتراف کیا اور آثار الصنادید میں لکھا ہے: انکے کمالات ظاہری و باطنی شہرہ آفاق ہیں۔[8]

خواجہ فخر الدین دہلوی قریباً نصف صدی تک دہلی میں تدریس و تربیت دیتے رہے۔ جس کے نتیجے میں علماء و صوفیہ کی ایک ایسی جماعت تیار ہوئی جو مذہباً حنفی اور مشرباً چشتی صوفی تھے۔ جنھوں نے مدرسہ اور خانقاہی نظام کو فروغ دیا۔ آپ کے خلفاء میں سے شاہ نیاز احمد بریلویؒ (۶ جمادی الثانی ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء) نے یوپی، مولانا جمال الدینؒ ۲۹ جمادی الاول ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء) نے رام پور، میر ضیاء الدینؒ نے جے پور، میر شمس الدینؒ نے اجمیر، حاجی لعل محمدؒ (۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) اور میر محمدیؒ (۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۷ء) نے دہلی میں

---

[5] کاکوروی، میر نذر علی درد، مقدمہ در ملفوظات و حالات شاہ فخر دہلویؒ، اردو ترجمہ فخر الطالبین و مناقب فخریہ، مترجم: میر نذر علی درد کاکوروی، (کراچی: سلیمان اکیڈیمی، مشہور آرٹسٹ پریس، ۱۹۶۱ء)، ص، ۲۵ ؛ محمد اسحاق قریشی، ڈاکٹر، بہار چشت، (لاہور: قطب پرنٹرز، ۲۰۱۳ء)، ص، ۱۲۱۔

[6] احمد پوری، خواجہ گل محمد، تکملہ سیر الاولیاء، (دہلی: مطبع رضوی، ۱۳۱۷ھ) ص ۱۰۸؛ کاکوروی، مقدمہ در ملفوظات و حالات شاہ فخر دہلویؒ، ص ۲۰، ۱۹

[7] کاکوروی، مقدمہ در ملفوظات و حالات شاہ فخر دہلویؒ، ص ۲۵؛ قریشی، محمد اسحق، ڈاکٹر بہار چشت، ص ۱۲۵-۱۲۶۔ محمد عزیز الدین نے دکن سے ۱۳۱۳ھ میں فخر الحسن دوسری دفعہ شائع کروائی۔ بعد ازاں عربی متن بمعہ اردو ترجمہ چشتیہ اکیڈمی، ہارون پرنٹنگ پریس سے فیصل آباد سے ۱۹۹۳ء میں شائع کرایا۔ پروفیسر افتخار احمد چشتی نے اس کا ترجمہ کیا۔ مولانا احسن الزمان نے اس کی عربی میں مبسوط شرح القول المستحسن فی فخر الحسن کے نام سے حیدر آباد دکن سے شائع کروائی۔ چشتیہ اکیڈمی نے آپ کے مکتوبات بھی اردو ترجمہ کے ساتھ ۱۹۹۱ میں شائع کیے۔ ان کا ترجمہ بھی پروفیسر افتخار احمد چشتی نے کیا۔ اسی طرح نظام العقائد (فارسی) اور اس کا اردو ترجمہ ظرف الفوائد کے نام سے مطبع دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔

[8] سر سید احمد خان، آثار الصنادید، (لکھنو: مطبع نامی نول کشور، ۱۹۰۰ء)، ص، ۳۶؛ نوٹ: آثار الصنادید پہلی مرتبہ ۱۸۴۹ء میں سید الاخبار نے طبع کی۔

چشتی خانقاہیں قائم کیں۔ جبکہ پنجاب میں خواجہ نور محمد مہارویؒ کو خاص طور پر قبولیتِ عامہ نصیب ہوئی۔[9] خواجہ نور محمد مہارویؒ قریباً اٹھارہ برس خواجہ فخر الدین دہلویؒ کے پاس دہلی میں مقیم رہے۔ جہاں انھوں نے اپنے شیخ کے مدرسہ میں علوم وفنون اور روحانی تربیت حاصل کی۔ تعلیم و تعلم کا یہ سلسلہ صرف خانقاہ اور مکتب تک محدود نہ تھا بلکہ خواجہ نور محمد مہارویؒ اپنے شیخ کے ساتھ سفر و حضر میں شریک رہتے تھے۔ سید نورالدین حسینیؒ لکھتے ہیں کہ خواجہ فخر الدینؒ آپ کے بارے میں کہتے تھے: "ان سے جب سے ملاقات ہوئی آج تک انھوں نے میری مرضی کے خلاف کوئی بات نہیں کی اور ان کا دِل میری طرف سے کبھی غبار آلود نہیں ہوا اور یہ بات ان کی ذات کے لیے مخصوص ہے ورنہ اکثر لوگوں سے کوئی نہ کوئی خطا ہو جاتی ہے اور اس کے بعد اس کی معافی چاہتے ہیں۔"[10] تذکرہ نگاروں نے ان مجالس اور اسفار کو قلمبند کیا ہے۔ مثلاً جب خواجہ فخر الدینؒ نے ۱۷۵۱ء میں لاہور اور پاکپتن کا سفر اختیار کیا، تو آپ نے ان کی معیت اختیار کی۔[11]

ڈاکٹر ساجدہ سلطانہ علوی نے اس امر کا جائزہ لیا ہے کہ دیہی پس منظر رکھنے والے خواجہ نور محمد مہارویؒ نے کس طرح شہری پس منظر والے خواجہ فخر الدین دہلویؒ سے اکتساب کیا۔ جن کے اس عہد کی اشرافیہ سے گہرے روابط تھے۔ اس لحاظ سے خواجہ نور محمد مہارویؒ کا دہلی میں طویل قیام نہ صرف علمی و روحانی تربیت کا باعث تھا بلکہ مرکز میں رہنے سے، اشرافیہ اور ان کے طرزِ عمل سے بھی ان کو آگاہی ہوئی۔[12]

اس عہد میں چشتی صوفیہ کے اشرافیہ اور مقتدر طبقات سے گہرے روابط تھے۔ متعدد اعیانِ مملکت اور سیاسی عمائدین خواجہ فخر الدین دہلویؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے۔ اور بعد ازاں ان کی اولاد کے دہلی کے حکمرانوں کے ساتھ خوشگوار مراسم تھے۔ اسی طرح خواجہ نور محمد مہارویؒ اور ان کے خلفاء کے بہاولپور، ملتان اور افغان حکمرانوں کے ساتھ اچھے تعلقات رہے۔ جس کے

---

[9] لکھنوی، نزھۃ الخواطر، ص، ۹۷۷۔۷۸۱؛ نظامی، تاریخ مشائخ چشت، ۵۰۰۔۵۰۹، مناقب، ۳۲ خلفا کا تذکرہ ہے، ص، ۱۳۳

[10] حسینی، سید میر نورالدین، فخر الطالبین، (مشمولہ در: ملفوظات وحالات شاہ فخر دہلوی، اردو ترجمہ فخر الطالبین و مناقب فخریہ، مترجم: میر نذر علی درد کاکوروی، (کراچی: سلیمان اکیڈیمی، مشہور آرٹسٹ پریس، ۱۹۶۱ء)، ص، ۴۵۔

[11] مہارویؒ، خواجہ امام بخش، گلشن ابرار، مترجم: پروفیسر محمد عبدالغفور غوثوی، (چشتیہ رباط صوفی پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ص، ۴۸، ۶۲۔

[12] Sajida Sultana Alvi, Citi Sufis and the Culture of Books Eighteen Century India: The Punjab, Deccan Connection, Nuova, Anno ۹۲, Mr. ۳۲, Faith and Practice in South Asian Sufism (۲۰۱۲), pp.۲۵۹-۲۸۸

باعث ان صوفیہ نے جنوبی پنجاب کی ثقافتی وسیاسی اور علمی ومذہبی زندگی میں بھرپور کردار ادا کیا۔[۱۳] خواجہ نور محمد مہارویؒ کے مکتب سے اٹھارویں صدی میں علماء وصوفیہ کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آیا جو خاص کر پنجاب میں سلسلہ چشتیہ کے فروغ کا باعث بنا۔ خواجہ امام بخش مہارویؒ (۲۰ صفر ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۲ء) نے آپ کے مندرجہ ذیل دس ممتاز خلفاء کا ذکر کیا ہے:

۱۔ خواجہ نور محمد ثانی نارووالہؒ (م ۶ جمادی الاول ۱۲۰۳ھ / ۱۷۹۱ء) حاجی پور، راجن پور ۲۔ حافظ محمد جمال اللہ ملتانیؒ (م ۵ جمادی الاول ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء)، ملتان، ۳۔ قاضی محمد عاقلؒ (۸ رجب ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء)، کوٹ مٹھن ۴۔ خواجہ محمد سلیمان تونسویؒ (۷ صفر ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۰ء)، تونسہ شریف، ضلع ڈیرہ غازی خان، ۵۔ قاری عزیز اللہؒ (م ۵ ذی القعدہ ۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۴ء)، چشتیاں شریف، بہاولنگر، ۶۔ قاری صبغت اللہؒ (۲۱ شعبان ۱۲۱۰ھ / ۱۷۹۱ء)، چشتیاں شریف، بہاولنگر، ۷۔ میاں محمد فاضل نیکو کارہؒ (م ۲۵ ربیع الاول ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء)، چشتیاں شریف، بہاولنگر ۸۔ حافظ غلام حسن بھٹیؒ (م ۹ ذی قعد ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۵ء)، چشتیاں شریف، بہاولنگر، ۹۔ حافظ محمد ناصرؒ، چشتیاں شریف، بہاولنگر، ۱۰۔ حافظ غلام محمد المعروف کڑیوالہؒ (م ۱۲ محرم ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء)، چشتیاں شریف، بہاولنگر۔ خواجہ امام بخش مہارویؒ نے مخزن چشت میں مندرجہ بالا دس خلفا کا اجمالی تعارف بھی دیا ہے اور لکھا: تلک عشرۃ کاملۃ۔ اس کے علاوہ انھوں نے چھبیس (۲۶) مشائخ کی فہرست بھی دی ہے جن کو حضرت مہارویؒ نے خلافت عطا کی تھی۔ اسی طرح گلشن ابرار میں انھوں نے ان دس کے علاوہ تین اور خلفا کا بھی اجمالی تذکرہ کیا ہے اور وہ مندرجہ ذیل ہیں: مولانا محمد مسعودؒ (۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۶ء)، مولانا محمد حسین چترؒ، حافظ غلام نبیؒ۔ تاہم انھوں نے حافظ جمالؒ کے خلیفہ اعظم مولانا خدا بخش خیر پوریؒ (یکم صفر ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء) کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے، جن سے وہ خود بھی دستِ بیعت تھے۔[۱۴]

۲۔ حافظ جمالؒ: تعارف وعلمی مساعی:

آپ کا نام محمد جمال الدینؒ اور آپ کے والد کا نام محمد یوسفؒ تھا۔ آپ کے دادا حافظ عبدالرشیدؒ ملتان میں قلعہ کے باہر مشرقی جانب اقامت پذیر تھے۔ آپ اعوان قوم سے تعلق رکھتے تھے۔[۱۵] آپ کے جدِ امجد اعوان قاری کی روایت سے منسلک تھے۔

---

[۱۳] ملاحظہ ہو: فخر الطالبین از سید نور الدین حسینی، مناقب فخریہ از غازی الدین نظام، مناقب المحبوبین حاجی نجم الدین سلیمانی، گلشن ابرار از امام بخش مہاروی میں اس عہد چشتی صوفیاء کے اشرافیہ کے ساتھ تعلقات کی متعدد حوالے ملتے ہیں۔

[۱۴] مہاروی، مخزن چشت، ۳۵۵۔۳۵۷؛ مہاروی، گلشن ابرار، ص، ۱۹۷۔۳۹۵۔

[۱۵] مہاروی، گلشن ابرار، ص، ۲۲۲۔

اعوان قاری سے مراد اعوان علماء کا وہ گروہ تھا جنھوں نے علمِ قرأت سیکھا اور دعوتِ دین کے لیے اپنے مقامی علاقے خوشاب سے نکل کر دیگر بستیوں اور شہروں کی طرف ہجرت کی۔ آپ کی پیدائش ۱۱۶۰ھ /۱۷۴۷ء میں ہوئی، تاہم حتمی تاریخ واضح نہیں۔[16]

آپ نے نے حفظِ قرآن اور دینی علوم ملتان کے علماء سے حاصل کیے اور بعد ازاں مہار شریف رہ کر خواجہ نور محمد مہارویؒ سے سلوک و تصوف کی تعلیم حاصل کی۔ اپنے شیخ کے ہمراہ دہلی میں مولانا فخر الدین دہلویؒ سے بھی کتبِ حدیث و تصوف پڑھیں۔[17] جب آپ پہلی دفعہ خواجہ نور محمد مہارویؒ سے ملے تو انھوں نے آپ سے تعلیم کے بارے میں پوچھا تو آپ نے جواب دیا، میں نے قرآن مجید حفظ کیا ہوا ہے۔ اس دوران حضرت مہارویؒ کے ایک مرید مولوی محمد حسین چنڑ بلاول پوریؒ وہاں آئے۔ جو بہت جید عالم تھے اور جن کو بعد میں حضرت مہارویؒ نے خلافت بھی عطا کی تھی۔ وہ حافظ جمالؒ سے پر تپاک انداز میں ملے اور حضرت مہارویؒ کو بتایا کہ وہ ملتان میں ایک ہی استاد کے پاس ہم درس رہے ہیں۔ علوم میں رسوخ کے باوصف اس وقت بھی ہم انھیں علامۃ العصر کہتے تھے۔ اس پر حضرت مہارویؒ نے ان سے پوچھا: آپ نے یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی؟ حافظ جمالؒ نے جواب دیا کہ اس اندیشہ کی بنا پر کہ کہیں آپ مجھ سے اعراض نہ کریں کیونکہ میں نے سنا تھا کہ اہلِ تصوف، علماء سے اجتناب کرتے ہیں۔ اس پر آپ نے کہا: "برخوردار ہمارا کام تو علماء سے ہی ہے۔ جاہل افراد سے تو ہم کوئی سروکار نہیں رکھا کرتے"۔[18] حضرت مہارویؒ کے زیرِ تربیت آپ نے تصوف کی بنیادی کتب کو درساً پڑھا اور پھر ان کتب کی اپنے مریدین کو تدریس کی۔ حافظ جمالؒ نے کچھ کتب دہلی میں مولانا فخر الدین دہلویؒ سے بھی پڑھیں۔ خاص کر کتاب سواء السبیل کا درس حضرت مہارویؒ کے تینوں بڑے خلفاء خواجہ نور محمد نارووالہؒ، خواجہ محمد عاقلؒ اور حافظ جمالؒ نے حضرت مولانا سے اکٹھے لیا۔[19] جس کا تفصیلی تذکرہ آئندہ صفحات میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

حاجی نجم الدین سلیمانیؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حافظ جمالؒ اپنے شیخ حضرت مہارویؒ کے ساتھ مولانا فخر الدین دہلویؒ کی مجلس میں بیٹھے تھے اور ملتان کا تذکرہ ہونے لگا کہ وہاں حضرت بہاء الدین زکریاؒ (۶۶۱ھ / ۱۲۶۲ء) کا اس قدر تصرف ہے کہ کوئی کسی اور سلسلہ میں بیعت بھی نہیں کرتا۔ اس وقت مولانا دہلویؒ نے خواجہ نور محمد مہارویؒ سے فرمایا کہ اب تک ملتان کی ولایت حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے تصرف میں تھی۔ اب یہ ہمارے تصرف میں ہے۔ اپنے کسی مرید کو وہاں بھیجیں اور اسے کہیں کہ حضرت

---

[16] اللہ بخش رضا: تذکرہ جمالؒ، (ملتان: مکتبہ الجمال، ۲۰۱۵ء)، ص، ۶۵۔

[17] مہاروی، مخزن چشت، ص، ۳۵۹۔۳۶۰؛ مہاروی، گلشن ابرار، ص، ۲۲۲۔۲۲۴۔

[18] مہاروی، مخزن چشت، ص، ۳۵۸؛ مہاروی، گلشن ابرار، ص ۲۲۴؛ سلیمانی، حاجی نجم الدینؒ، مناقب المحبوبین، مترجم: پروفیسر افتخار احمد چشتی، (لاہور: حسن بشیر پرنٹرز، [ناشر: چشتیہ اکیڈمی، فیصل آباد] ۱۴۰۸ھ /۱۹۸۷ء)، ص، ۲۴۷۔

[19] سلیمانی، مناقب المحبوبین، ۲۴۰۔۲۴۱۔

بہاء الدین زکریاؒ کی خانقاہ میں بیٹھ کر لوگوں کو اپنے حلقہ ارادت میں شامل کرے۔[20] چنانچہ حضرت مہارویؒ نے حافظ جمالؒ کو ملتان میں اپنا خلیفہ بنا کر متعین کیا۔

خواجہ نور محمد مہارویؒ کی مساعی کے باعث پنجاب میں متعدد چشتی صوفی مراکز مدرسہ خانقاہ ماڈل پر قائم کیے، جہاں علوم دینیہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ملتان جو صدیوں سے سہروردیوں کا مرکز تھا، اس میں باقاعدہ حافظ جمالؒ نے چشتی خانقاہ کی بنیاد رکھی اور اس دور کے اکابر علماء وفضلاء اور روسا اس خانقاہ سے منسلک ہوئے۔ اگرچہ حافظ جمالؒ چاروں سلاسل میں بیعت کرتے تھے لیکن وہ ترجیح سلسلہ چشتیہ کو دیتے تھے۔ وہ اپنا گزر اوقات تجارت سے کرتے تھے۔ عمدہ لباس زیبِ تن کرتے تھے اور صفائی کا خاص خیال کرتے تھے۔ حافظ جمالؒ نے علوم وفنون کی خاص طور پر سرپرستی کی۔ ملتان میں عمدہ خطاطی کو رواج دینے میں آپ کے ادارے کا خاص کردار ہے۔ وہ اپنے شاگردوں کو واضح انداز میں لکھنے کی تلقین کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ کاتب کو چاہیے کہ وہ جلی انداز میں لکھے تاکہ پڑھنے والے کو زحمت نہ ہو۔ یہ بہت بڑے گناہ کی بات ہے کہ کاتب کی تحریر سے قاری کو تکلیف پہنچے۔ حافظ جمالؒ اور ان کے خلفاء نے فنِ خطاطی کو خوب ترقی دی۔ ملتان کے حاکم نواب محمد مظفر خانؒ (۱۲۳۳ھ /۱۸۱۸ء) خود بہترین کاتب تھے اور حافظ جمال اللہؒ کے عقیدت منداور شاگرد بھی تھے۔[21]

ڈاکٹر مہر عبدالحق آپ کے طریقۂ تدریس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ علم کے دقائق کو تفصیل، وضاحت اور تمثیل سے اس طرح سمجھاتے تھے کہ کند ذہن طالبِ علم بھی ایسے سمجھ لیتا جیسے ذہین۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ انھیں جناب عتیق فکری نے بتایا تھا کہ حافظ جمالؒ کا قلمی دیوان مولانا طالوت کے پاس تھا۔ جس میں فارسی، عربی اور سرائیکی کا کلام تھا۔ تاہم ان کی وفات کے بعد ان کی لائبریری محفوظ نہ رہ سکی اور یہ نایاب نسخہ ضائع ہو گیا۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق لکھتے ہیں کہ آپ عربی، فارسی اور سرائیکی کے بلند پایہ شاعر

---

[20] میاں نور محمد! تاہنوز ملتان ولایت بہاء الحقؒ بود۔ لہٰذا تصرف ولی دیگر کارگر نمی شد۔ اما حالا ملتان حوالہ مایاں شدہ است۔ لازم است کہ مریدے از مریدانِ خود را آنجا فریسند و بگویند کہ در عین خانقاہ بہاء الدین زکریاؒ خلق را مرید کند و تصرف خود کند۔ سلیمانی، حاجی نجم الدین، مناقب المحبوبین (فارسی)، (رام پور: مطبع محمد حسن ۱۲۸۹ھ /۱۸۷۲ء)، ص، ۱۲۶۔

نوٹ: امام بخش مہارویؒ کی روایت کے مطابق جب آپ نے بات کی تو حافظ جمالؒ وہاں موجود تھے۔ چنانچہ آپ نے حضرت مہارویؒ سے کہا "چاہیے کہ اپنے اسی دوست مظہر جمال رحمۃ اللہ علیہ کو حکم دیجئیے کہ ملتان شریف میں جاکر غوث العالمین مخدوم بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے دربار میں بیٹھ کر ارادت مندوں کو شرفِ بیعت سے مشرف فرمایا کریں۔ مہاروی، گلشن ابرار، ۴۰۱-۴۰۲۔

[21] پرھاڑوی، علامہ عبدالعزیزؒ: انوار جمالیہ، مترجم: مولانا محمد برخوردار، (کوٹ ادو (مظفر گڑھ): العزیز اکیڈمی، ۱۳۹۷ھ)، ۲۸؛ اکرام الحق، شیخ، ارض ملتان، (ملتان: بزم ثقافت)، ص، ۲۲۴

تھے۔ آپ کی سرائیکی سی حرفی آگرہ سے سے طبع ہو چکی ہے۔ جس کی تصحیح و تدوین جدید ڈاکٹر عبدالحق نے کی ہے۔ یہ سی حرفی انھوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے لکھی۔ کامیاب زندگی گذارنے کے لیے کچھ سادہ باتیں۔ اس سی حرفی کا پہلا بند ملاحظہ ہو۔

الف اٹھی دہیا، نت جاگ سویلے، سنٹر توں دھی سیانڑیں
گھن چرکھا، پا کتنڑ کھوڑی ، بہوں ہے رات وہانڑیں
ایھو ویلا ہتھ نہ آسی ،تیڈے دھی ایا نڑیں
اُتھ جمال سہاگنڑ سوہے، جو شوہ دے من بھانڑیں [۲۲]

اے میری سمجھدار بیٹی! صبح سویرے جاگ۔ بہت رات گذر گئی ہے۔ اب چو کی ڈال کر چرخے پہ سوت کا تنا شروع کرو۔ اے میری سمجھدار بیٹی! یہ وقت پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ کل تم نے اپنے سسرال چلے جانا ہے۔ جہاں سہاگن وہ بنتی ہے جو اپنے شوہر کا من موہ لیتی ہے۔

حافظ جمالؒ نے نہ صرف مبتدی جویانِ علم کی تربیت کی بلکہ جید علماء و مشائخ بھی آپ سے راہنمائی حاصل کرتے۔ یہاں تک کہ خواجہ نور محمد مہارویؒ کے خلفا اور ان سے وابستہ علماء و مشائخ نے بھی آپ سے اکتساب کیا۔ خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسویؒ اور خواجہ گل محمد احمد پوریؒ ایسے اکابرین بھی ان کے حلقہ درس سے فیضیاب ہوئے۔[۲۳] خواجہ امام بخش مہارویؒ نے آپ کے پانچ خلفا کا تذکرہ کیا ہے: ا۔ مولانا خدا بخش خیر پوریؒ، ۲-مولوی عبد الرزاقؒ (وفات ۵ جمادی الاول ۱۲۲۵ھ یا ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۰ء یا ۱۸۱۱ء) میلسی، ۳۔ مولوی محمد حامد فتح پوریؒ، ۴۔ سید محمد زاہد شاہؒ، ۵۔ سید بلند شاہؒ (جھکڑ امام)۔ تاہم آپ نے کچھ علما و مشائخ کا ذکر کیا ہے جو حافظ جمالؒ سے دستِ بیعت تھے لیکن آپ کی وفات کے بعد ان کو خلافت خواجہ خدا بخش خیر پوری نے عطا کی: وہ مندرجہ ذیل ہیں: ا۔ خواجہ غلام فرید مہارویؒ (والد امام بخش مہاروی)، ۲۔ قاضی محمد عیسیٰؒ (۱۲ صفر ۱۲۶۳ھ /۱۸۴۷ء)، ۳۔ علامہ محمد موسیٰ ملتانیؒ (۱۲ رجب ۱۲۶۱ھ /۱۸۴۵ء)، ۴۔ میاں محمد حسین ملانہؒ، ۵۔ منشی غلام حسن شہیدؒ، ۶۔ حضرت محمد بودھا شاہؒ (حضرت لال سوہانرا کی اولاد میں سے تھے)، ۷۔ سید شاہ محمد المعروف ولاں والی سرکارؒ، ۸۔ قاضی محمد یارؒ، ٹب، سانگھڑ۔[۲۴] خلیق احمد نظامی نے خواجہ غلام فرید مہارویؒ، قاضی محمد عیسیٰؒ، منشی غلام حسن شہیدؒ، مولانا عبید اللہ ملتانیؒ (٦ جمادی الاول ۱۳۰۵ھ /۱۸۸۸ء) اور مولانا عبدالعزیز پرہاڑوی ؒ کو آپ کے

---

[۲۲] عبدالحق، مہر ڈاکٹر، نورِ جمال، (لاہور: نوائے وقت پرنٹرز، ۱۹۷۴ء [ناشر: سرائیکی ادبی بورڈ، ملتان])، ص، ۲۶، ۴۲۔ ۴۳

[۲۳] احمد پوری، تکملہ سیر الاولیاء، ص، ۱۳۵؛ عبدالحق، نورِ جمال، ص، ۳٦؛ امام الدین، نافع السالکین، تذکرہ حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ، مترجم؛ صاحبزادہ محمد حسین للہی، (لاہور: مرکنسٹائل پریس، [ناشر: شعاع ادب، لاہور])، ص۔ ۵۴، ۱۵۸۔

[۲۴] مہاروی، گلشن ابرار، ص، ۲٦۴۔ ۲٦۵، ۴۸۵، ۴۸٦، ۴۹۱۔

خلفا میں شمار کیا۔ تاہم چشتی تذکرہ جات کے مطابق اول الذکر تینوں آپ کے مرید تھے اور ان کو خلافت خواجہ خدا بخش خیر پوریؒ نے دی۔ جب کہ علامہ پرھاڑویؒ، حافظ جمالؒ کے مرید تھے اور مولانا عبید اللہ ملتانیؒ، خواجہ خدا بخش خیر پوریؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔[25]

آپ کا وصال ۵ جمادی الاول ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء میں ۶۶ برس کی عمر میں ہوا۔ منشی غلام حسن شہیدؒ نے آپ کی تاریخِ وفات قرآنِ مجید کے ان الفاظ سے نکالی ہے: ان المتقین فی جنٰت ۱۲۲۶ ہجری۔ غازی الدین خان نظام نے آپ کے بارے میں لکھا ہے کہ "کمال باطنی تہذیب و اخلاق اور دوسرے کمالات سے بھی آراستہ تھے"۔[26]

۳۔ حافظ جمالؒ کے تذکرہ جات اور ان کے مولفین

انیسویں صدی کے چشتی تذکار میں حافظ جمالؒ کے سوانح حیات کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ تاہم مندرجہ ذیل تین تذکرے اساسی اہمیت کے حامل ہیں، جن کو آپ کے شاگردوں نے مرتب کیا ہے۔ اس لحاظ سے ان میں فراہم کردہ معلومات براہِ راست تعلق و مشاہدہ پر مبنی ہیں، جس کی وجہ سے یہ تذکرے بنیادی مصادر کی حیثیت رکھتے ہیں، جن پر مابعد کے تمام مصادر کا انحصار ہے۔ یہ تذکرے حسبِ ذیل ترتیب زمانی کے مطابق لکھے گئے:

الف۔ خصالِ رضیہ از علامہ عبد العزیز پرھارڑویؒ

ب۔ انوارِ جمالیہ از منشی غلام حسن شہیدؒ

ج۔ اسرار الکمالیہ سید محمد زاہد شاہؒ

خصالِ رضیہ در حقیقت ایک مختصر یادداشتوں کا مجموعہ ہے جسے علامہ عبد العزیز پرھاڑویؒ نے حافظ جمالؒ کی وفات کے بعد تیسرے دن تحریر کیا۔[27] جب کہ دیگر دونوں تذکرے نسبتاً طویل ہیں جن کی حتمی تاریخ کا علم نہیں تاہم یہ بات تو یقینی ہے کہ یہ دونوں تذکرے ۱۸۲۹ء سے قبل لکھے گئے، جو سید محمد زاہدؒ کا تاریخ وفات ہے۔ منشی غلام حسن شہیدؒ کی انوارِ جمالیہ پہلے تحریر کی گئی۔ اور سب سے آخر میں سید محمد زاہدؒ نے اسرار الکمالیہ تحریر کی جس کے مقدمہ میں یہ بات واضح طور پر تحریر کی ہے کہ ان کی تالیف سے قبل خصالِ رضیہ اور انوارِ جمالیہ لکھی جا چکی تھیں۔ علامہ پرھاڑویؒ اور سید محمد زاہدؒ کے تذکرہ جات میں حافظ جمالؒ کی سوانح عمری اور علمی افکار بیان کیے گئے ہیں۔ مؤخر الذکر نے تو کتاب کا دوسرا باب وحدۃ الوجود پر قائم کیا اور اس حوالے سے وہ نکات جو حافظ جمالؒ کی مجالس میں بیان

---

[25] نظامی، تاریخ مشائخ چشت، ص، ۵۸۰۔ گلشن ابرار ۴۹۷-۴۹۶

[26] غازی الدین نظام، مناقب فخریہ، (مشمولہ در: ملفوظات و حالات شاہ فخر دہلویؒ، اردو ترجمہ فخر الطالبین و مناقب فخریہ، مترجم: میر نذر علی درد کاکوروی، (کراچی: سلیمان اکیڈیمی، مشہور آرٹسٹ پریس، ۱۹۶۱ء)، ص، ۲۲۶۔

[27] پرھاڑوی، انوار جمالیہ، ص، ۲۔

ہوتے تھے، ان کو یکجا کر دیا۔ تاکہ حافظ جمالؒ کے نقطۂ نظر کو سمجھا جاسکے۔ بلاشبہ سید محمد زاہدؒ کا یہ کام علمی انداز سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ جس سے نہ صرف حافظ جمالؒ کی بلکہ سید محمد زاہدؒ کی علمی شخصیت اُجاگر ہوتی ہے۔ اس کے برعکس منشی غلام حسن شہیدؒ کا تذکرہ غالباً عامۃ الناس کے لیے لکھا گیا ہے۔ جس میں انھوں نے حافظ جمالؒ کو ایک ایسے صوفی کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس سے کرامات کا مسلسل ظہور ہوتا ہے۔ ان تین بنیادی مصادر کے علاوہ اسی دورانیہ میں مولانا گل محمد احمد پوریؒ (۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء) نے تکملہ سیر الاولیاء بھی تحریر کی جو بنیادی طور پر خواجہ محمد عاقلؒ (۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء) کے احوال و مناقب پر مشتمل ہے۔ تاہم اس میں ضمنی طور پر حافظ جمالؒ کے احوال و اقوال کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔[۲۸] اسی طرح دیگر تمام مئولفین جیسے حاجی نجم الدین سلیمانیؒ اور خواجہ امام بخش مہارویؒ نے حافظ جمالؒ کے سوانح حیات کے لیے انھی مصادر پر زیادہ تر انحصار کیا ہے۔[۲۹] ذیل میں ان تینوں مصادر کا متنی مطالعہ کیا گیا ہے تاکہ ان کے بنیادی مضامین اور اہم مباحث کی تفہیم کی جاسکے لیکن اس سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کے لیے ان کے مئولفین کا اجمالی تعارف پیش کر دیا جائے۔

۱۔ علامہ عبد العزیز پرہاڑویؒ

علامہ عبد العزیز پرہاڑویؒ کا پورا نام ابو عبد الرحمن عبد العزیز بن ابی حفص احمد بن حامد القرشی تھا۔ آپ کے والد افغانستان سے ہجرت کر کے کوٹ ادو، ضلع مظفر گڑھ کے قریب پرہاڑ گاؤں میں سکونت پذیر ہوئے۔ آپ کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے تین روایات ملتی ہیں۔ ۱۲۰۶ھ / [۱۷۹۲ء]، ۱۲۰۷ھ اور ۱۲۰۹ھ۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور بعد ازاں حافظ جمالؒ کی زیر تربیت علومِ نقلیہ و عقلیہ سیکھے اور بعض کتب ان کے بعد خواجہ خدا بخش خیر پوریؒ سے بھی پڑھیں۔ علومِ دینیہ کی تعلیم کے بعد آپ نے علمِ طب حاصل کیا اور طبِ نبوی کے حوالے سے ایک کتاب التریاق (دو جلدیں) تحریر کی۔ ملتان کے حکمران نواب محمد مظفر خان (۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۸ء)، اس کے بیٹے نواب شاہ نور خان (۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۸ء) اور بعد ازاں راجہ رنجیت سنگھ (۱۸۳۹ء) کے نمائندہ دیوان ساون مل (۱۸۴۴ء) نے آپ کو اپنا معالج خاص رکھنا چاہتے تھے لیکن آپ نے پرہاڑ کی دور افتادہ بستی میں رہ کر تصنیف و تالیف کرنے کو ترجیح دی۔[۳۰]

---

[۲۸] احمد پوری، تکملہ سیر الاولیاء، ص، ۱۲۵–۱۲۷، ۱۳۳–۱۳۵

[۲۹] سلیمانی، مناقب المحبوبین، ص، ۲۴۶۔۲۷۵؛ مہاروی، گلشن ابرار، چمن دوئم: حافظ محمد جمال اللہ ملتانیؒ، ص ۲۲۲–۲۶۶۔ نوٹ: مخزن چشت ۲۸ ذوالحجہ ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۱ء میں اور گلشن ابرار ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء میں تالیف کی گئی۔

[۳۰] پرہاڑویؒ، عبد العزیز، زمرد اخضر و یاقوت احمر، (لاہور: مطبع رفاہ عام، ۱۳۴۵ھ۔۱۹۲۶ء)، ص، ۱۳۵؛ محمد برخوردار، مولوی، حاشیہ القسطاس علی النبراس لعبد العزیز الفرہاروی ، (ملتان: مطبع خضر مجتبائی، سن ندارد)، ص، ۲؛ الکھنوی، نزھۃ الخواطر، ص، ۱۰۱۸۔۱۰۱۹؛ محمد اسحق بھٹی، فقہاء پاک و ہند (تیرھویں صدی ہجری)، (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۴ء)، ص،

علامہ پرہاڑویؒ نے متنوع فنون پر متعدد کتب تحریر کیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ عقائد میں اشعری وماتریدی فکر کے حامل تھے۔ وہ فقہ میں امام ابو حنیفہؒ (۱۵۰ھ /۷۶۷ء) کے پیروکار تھے، تاہم وہ تقلید کے سخت ناقد اور اجتہاد کے قائل تھے۔ وہ مشرباًوجودی صوفی تھے اور سلسلہ چشتیہ میں حافظ جمالؒ سے دست بیعت تھے۔[۳۱]

ڈاکٹر محمد شریف سیالویؒ (م ۲جون ۲۰۱۴ء) لکھتے ہیں کہ آپ نے تالیف وتصنیف کا آغاز اپنے شیخ کی وفات کے بعد قریباً ۱۲۲۶ھ /۱۸۱۱ء میں شروع کیا۔ اور ہر فن میں وقیع کتب تحریر کیں۔ وہ خود عربی وفارسی کے شاعر بھی تھے۔ اور اپنی کتب میں عربی اشعار سے استشہاد بھی کرتے تھے۔ آپ نے اہلِ سنت کے عقائد کو ۱۲۰ اشعار میں اپنے رسالہ ایمانِ کامل میں تحریر کیا۔ اس کے علاوہ ان کے اشعار کا ایک بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ مثلاً آپ نے النبراس، الیاقوت، التعلیقات علی تھذیب الکلام للتفتازانی اور نعم الوجیز کے مقدمات میں اپنے اشعار کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ علامہ پرہاڑویؒ کی چھوٹی بڑی تصنیفات و تالیفات کی تعداد ایک سو کے قریب ہے۔ ان میں سے چند ایک مستقل موضوعات پر لکھی گئی ہیں جب کہ بیشتر درسِ نظامی میں پڑھائی جانے والی اہم کتبِ عقائد و فقہ اور فلسفہ کی شروح، تلخیصات و مختصرات ہیں۔[۳۲]

۱۰۰؛ محمد متین کاشمیری، احوال و آثار عبد العزیز پرہاڑوی، (لاہور: مجلس خدام الاسلام) ص ۲۶؛ عمر کمال خان، نواب مظفر خان شہید اور اس کا عہد، (ملتان: فاروقی کتب خانہ، سن ندارد)، ص، ۲۸۵؛ مختار احمد پیرزادہ، سوانح محبوب اللہ حضرت خواجہ خدا بخش، (بہاول پور: اردو اکیڈمی)، ص، ۴۶-۴۸، ۶۹-۶۸۔ نوٹ: خصالِ رضیہ میں بھی آپ نے حافظ جمال سے مختلف امراض کے نسخے نقل کیے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کی اس عہد میں علماء علوم دینیہ کے ساتھ علم طب کی بھی بنیادی تعلیم غیر رسمی طور پر حاصل کرتے تھے۔

[۳۱] وہ تقلید محض کے مخالف تھے۔ اس حوالے سے وہ الیاقوت میں لکھتے ہیں: وبالجملۃ لایرتاب مسلم فی ان اللہ سبحانہ امر باتباع رسولہ، فلا نترک الیقین بالشک، ومن لامنا فلیلم۔ ان کی ایسی تحریروں سے بعض اہلِ علم نے یہ رائے قائم کی کہ وہ فقہ حنفی کے پیرو نہیں بلکہ غیر مقلد ہیں۔ مولانا احسان الحق نے اس مسئلہ کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور علامہ پرہاڑویؒ کی کتب کے متنی مطالعہ اور اہلِ علم کی آراء کی روشنی میں اس موقف کی وضاحت کی ہے کہ وہ فقہ حنفی کے پیروکار تھے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مولانا احسان الحق، مولانا عبد العزیز پرہاڑوی رحمۃ اللہ علیہ: حیات و خدمات، در بینات (کراچی: جامعۃ العلوم الاسلامیۃ، بنوری ٹاون)، پہلی قسط: محرم الحرام، ۱۴۳۸ھ، ص۔ ۵۲-۵۹، تیسری قسط، ربیع الاول، ۱۴۳۸ھ، ص، ۵۰-۵۵۔

[۳۲] ڈاکٹر محمد شریف سیالوی نے ۹ مطبوعہ اور ۱۶ دستیاب مخطوطات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ چالیس دیگر کتب کے نام ذکر کرتے ہیں جن کے حوالے دیگر کتب میں ملتے ہیں لیکن وہ دستیاب نہیں ہیں۔ آپ کی مطبوعہ کتب مندرجہ ذیل ہیں: النبراس شرح شرح العقائد النسفیۃ ۲۔ کوثر النبی مع منظرۃ الجلی فی علوم الجمیع، زمرد اخضر ویاقوت احمر مع رسالۃ عنبر اشہب، الناھیۃ عن طعن معاویۃ، السر المکتوم مما اخفاہ المتقدمین، رسالۃ الخصال الرضیۃ، مرام الکلام فی عقائد الاسلام، نعم الوجیز فی اعجاز القرآن العظیم، الصمصام فی اصول التفسیر۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب مخطوطات کی صورت میں دستیاب ہیں۔: منتھی الکمال، معجون الجواھر، التریاق، حب الاصحاب

ڈاکٹر محمد شریف سیالوی کے نزدیک ان کی کتب کا عمومی منہج ایجاز اور تسہیل ہے۔ وہ کتاب کو آسان پیرائے میں بیان کرتے ہیں اور ان میں بلاضرورت طوالت کے بجائے اختصار کو مد نظر رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ خود لکھتے ہیں:

ولکننی حاولت تسهیل فهمه — علی المبتدی وهو المعین المسهل
وطولت والتطویل لم یکن عادتی — لمانه للمستفیدین اسهل [۳۳]

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر لکھتے ہیں کہ اس قدر عبقری شخصیت اور اس کی تصانیف پردہ اخفاء میں رہنے کی تین وجوہات ہیں: انھوں نے ایک ایسے علاقہ میں زندگی بسر کی جو علمی مراکز سے بہت دور تھا، دوسری بات یہ ہے کہ انھوں نے عمر بہت چھوٹی پائی اور تیسری بات یہ ہے گردوپیش کے لوگوں نے حسد یا اپنی کم علمی کی وجہ سے اس عبقری انسان کی اس کے لائق قدر نہ کی اور نہ ہی اس کے کام کی مناسب پذیرائی کی۔[۳۴] تاہم زمانے کے دست برد سے بچ جانے والے ان کے علمی سرمایہ نے اہل علم کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا ہے۔ اب ان کی متعدد کتابیں تحقیق و تدوین کے ساتھ شائع ہو رہی ہیں اور علمی حلقوں میں ان کی جلالت علمی کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ مولانا محمد برخوردار ملتانیؒ نے ان کی کتاب النبراس کی شرح لکھی اور ان کے علمی مقام کے بارے میں لکھا: کان محدثا، مفسرا، جامعا للمعقول والمنقول۔[۳۵] علامہ عبد الحیی لکھنویؒ (م۱۸۸۶ھ) لکھتے ہیں: الشیخ العالم المحدث عبدالعزیز بن احمد بن الحامد القرشی الفریهاری الملتانی ابو عبد الرحمن من کبار العلماء، له مصنفات کثیرة فی المعقول و المنقول... و کان رحمه الله. زاهدا متقللا یدیم الاشتغال بمطالعة الکتب و کان لا یتردد الی

ورد الروافض، تعلیقات علی تهذیب الکلام للتفتازانی، بیطاسیا، الدر المکنون والجوهر المصنون، رسالة فی السماع، التمیز بین الفلسفة والشریعة، سر السماء، رسالہ فی فن الالواح، اکسیر الاعظم، رسالة فی علم المثال، رسالة فی رفع السبابة عند التشهد، شرح حصن حصین، شرح ایساغوجی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد شریف سیالوی نے الیاقوت اور ڈاکٹر شفقت اللہ نے السلسبیل فی تفسیر التنزیل کی تحقیق و تدوین کی، جس پر انھیں ڈاکٹریٹ ایوارڈ کی گئیں۔

[۳۳] محمد شریف سیالوی، حیاة الشیخ عبد العزیز الفرهارویؒ و آثاره العلمیة، در القلم، (جلد، ۵، شمارہ، ۵، ۱۹۹۹ء) ادارہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ ص۔ ۲۵۵۔ ۲۷۱

[۳۴] الفرهاروی، عبد العزیز، نعم الوجیز فی اعجاز القرآن العظیم، تحقیق: د۔ ظہور احمد اظہر، (لاہور: المجمع العربی الباکستانی، ۱۹۹۳ء)، ص، ۱۷۔

[۳۵] محمد برخوردار، مولوی، حاشیہ القسطاس علی النبراس لعبد العزیز الفرهارویؒ، (ملتان: مطبع خضر مجتبائی، سن ندارد)، ص، ۲

نوٹ: مولوی محمد برخوردار بن مولانا عبد الرحیم ملتانیؒ، انجمن اسلامیہ، ملتان میں، مدرس اول تھے۔ انھوں نے النبراس کی شرح لکھی، خصال رضیہ کا اُردو و فارسی میں ترجمہ کیا اور ان کی تالیفات میں قول الجلی فی نجات عم النبی ابی العلی شامل ہیں جسے تاجران کتب، اندرون بوہڑ دروازہ، ملتان نے مطبع میرٹھ ۱۸۹۵ء میں شائع کروایا۔

الاغنياء ولا يقبل نذورهم و كان شديد الميل الی اتباع السنۃ و رفض التقلید۔[36] **شیخ عبد الفتاح ابو غدۃ (۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۷ء) لکھتے ہیں: العلامہ النابغۃ الشیخ عبد العزیز الفرھاروی الھندی ذو التآلیف المحققۃ۔**[37]

مولانا محمد موسیٰ روحانی بازیؒ (۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء) لکھتے ہیں: **ھو العلامہ الکبیر بل ذو الشان العظیم ، نادرۃ الزمان، سلطان القلم والبیان، کان من آیات اللہ بلا فریۃ و نادرۃ من نوادر الدھر بلا مریۃ... صنف کتبا فی کل فن ما یحیر الالباب۔**[38] مولانا نور احمد فریدیؒ (م ۱۹۹۴ء)، علامہ پرہاڑویؒ کی النبراس کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اسے شہرتِ دوام اور حسنِ قبول کا درجہ حاصل ہے۔ چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ (م ۱۹۵۶ء) اس کتاب کو اپنی دل پسند کتابوں میں شمار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ فلسفہ کے حصہ کو جو نظریات کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اس کتاب نے آسان کر دیا ہے۔[39]

اس عہد کے تذکرہ نگاروں نے یہ رقم کیا ہے کہ علامہ عبد العزیز پرہاڑویؒ کا علم وہبی تھا اور ان کے شیخ حافظ جمالؒ کا فیضِ نظر تھا۔[40] تاہم اگر ظاہری وسائل کو دیکھا جائے تو اہلِ علم کے لیے یہ ایک خوشگوار حیرت کا مقام ہے کہ انیسویں صدی کی ابتدا میں ملتان اور اس کے گرد و نواح میں علم کی روایت اس درجہ مضبوط تھی کہ جس کے زیر اثر علامہ پرہاڑویؒ جیسا عربی و فارسی زبان کا فاضل وادیب، دانشور، محقق و مدقق پروان چڑھا۔ مولانا محمد برخوردار ملتانی ؒ کی تحقیق کے مطابق وفات کے وقت ان کی عمر تیس، بتیس یا تینتیس سال تھی۔ انھوں نے النبراس ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء میں لکھی اور ازاں بعد اسی سال قریبا ۳۲ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔[41]

۲۔ منشی غلام حسن شہیدؒ

انیسویں صدی میں ملتان کے علمی و ادبی شخصیات میں منشی غلام حسن شہیدؒ بہت نمایاں ہیں۔ جنھوں نے شعر و نثر دونوں میں گراں قدر علمی سرمایہ چھوڑا ہے۔ آپ نے فارسی، اردو، عربی اور سرائیکی چاروں زبانوں میں تحریر کیا۔ منشی غلام حسن شہیدؒ

---

[36] الکھنوی، نزھۃ الخواطر، ص، ۱۰۱۸۔۱۰۱۹۔

[37] شیخ عبد الفتاح ابو غدہ، تعلیقات الرفع والتکمیل، (کراچی: قدیمی کتب خانہ، سن ندارد)، ۲۸۹

[38] الروحانی البازی، محمد موسیٰ: حاشیۃ الطریق العادل الی بغیۃ الکامل، (لاہور: ادارۃ التصنیف والادب، ۱۴۲۷ھ / ۲۰۰۶ء)، ص، ۲۲۷

[39] فریدی، مولانا نور احمد، تذکرہ مشائخ چشت، (ملتان: ہمدرد پرنٹنگ پریس، سن ندارد)، ص، ۲۹۵

[40] مہاروی، گلشن ابرار، ص، ۲۳۶۔۲۳۷

[41] محمد برخوردار، حاشیہ القسطاس،، ص، ۲

۱۲۰۲ھ /۱۷۸۸ء میں ملتان میں پیدا ہوئے۔[۴۲] آپ کے آباؤ اجداد راجپوتانہ سے ملتان آئے تھے۔ آپ کے والد منشی جان محمدؒ بھی ادیب اور انشا پرداز تھے۔ مولانا نور احمد فریدیؒ نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ منشی غلام حسنؒ بچپن میں تعلیم کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے۔ آپ کے والد انھیں "زلیخا" پڑھاتے لیکن وہ اس پر توجہ نہ دیتے جس کی وجہ سے انھوں نے آپ کی زجر و توبیخ کی اور حافظ جمالؒ سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا: اس پر سختی نہ کرو۔ اور پھر نونہال غلام حسنؒ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ مجھے اپنا سبق سناؤ۔ جس پر انھوں نے یہ شعر پڑھا:

دراں خلوت کہ ہستی بے نشاں بود
بہ کنج نیستی عالم نہاں بود

یہ شعر سنتے ہی حافظ جمالؒ پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جب افاقہ ہوا تو آپ نے کہا مجھے پانی لا دو۔ غلام حسنؒ بھاگ کر پانی لائے۔ آپ نے اس میں سے کچھ پیا اور باقی غلام حسنؒ کو پینے کے لیے دے دیا۔ جس کے بعد آپ کی کیفیت بدل گئی اور مطالعۂ کتب سے ایسی دلچسپی پیدا ہوئی کہ جس کے نتیجے میں وہ بلند پایہ ادیب بن گئے۔

منشی غلام حسنؒ خوبصورت شکل شباہت کے مالک تھے۔ ایک مرتبہ آپ کے ایک ارادت مند نے آپ سے کہا: لوگ حسن یوسف علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہیں۔ کیا وہ آپ سے بھی خوبصورت تھے۔ آپ نے جواباً فرمایا: اُن کی بات تو وہ جانیں جنھوں نے انھیں دیکھا۔ ہماری آنکھوں نے تو حافظ جمالؒ جیسا کوئی نہ دیکھا۔

چشم خدا بیں باز کشا نقش جمال اللہ ببین
تاچوں حسن در صورتِ انساں ذاتِ مقدس رانگری[۴۳]

آپ نے حافظ جمالؒ کا جو تذکرہ مرتب کیا ہے۔ اس میں کئی ایک واقعات ایسے نقل کیے ہیں جن سے ان کی اپنی زندگی کے مختلف گوشوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کا تذکرہ آئندہ ابواب میں بیان کیا جائے گا۔ خواجہ امام بخش مہارویؒ لکھتے ہیں: " آپ سخن

[۴۲] آپ کی حتمی تاریخ پیدائش کا علم نہیں تاہم آپ کے بارے میں یہ روایت ہے کہ آپ نے تریسٹھ سال عمر پائی۔ آپ کو ۲۹ محرم ۱۲۶۵ بمطابق ۲۳ دسمبر ۱۸۴۴ء میں شہید کیا گیا۔ اس لحاظ سے آپ کی تاریخ پیدائش ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۸ء بنتی ہے۔ ڈاکٹر فرشتہ آہنگری نے دیوان کامل شہید کے مقدمہ کے صفحہ ۱۲ اور مخدوم محمد احسن نے دیوانِ گامن کے مقدمہ کے صفحہ ۷ پر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔[غلام] حسن، خواجہ ملتانیؒ، دیوان کامل شہید، تحقیق: دکتر فرشتہ آہنگری، (اسلام آباد: رایزی فرہنگی جمہوری اسلامی ایران، منزل پریس، ۲۰۱۵ء)؛ غلام حسن، حضرت منشی شہید: دیوان گامن، (ملتان: ناشر، مخدوم محمد احسن، سن ندارد)۔

[۴۳] فریدی، تذکرہ مشائخ چشت، ص، ۳۰۰-۳۰۱۔

ور، نکتہ پرور تھے۔ مضامین لطیفہ کی ایجاد اور تراکیب انیقہ کی تخلیق، آپ کی خصوصیت میں شامل تھی۔ ذہن جید تھا اور فکر رسا انسان تھے۔ کلام کو متانت دینا صرف آپ کا شیوہ تھا۔ عجیب و غریب شاعر تھے۔ تصانیفِ لطیفہ میں شہرتِ تمام رکھتے تھے۔ ظاہری و باطنی کمالات آپ میں موجود پائے گئے تو دور نزدیک کے سننے والے کانوں اور دیکھنے والی آنکھوں کو پنجاب اور سندھ سانگھڑ میں آپ کی مثل و نظیر نہ مل سکی۔"[۴۴]

حافظ جمالؒ کے زیر تربیت آپ نے علوم و فنون حاصل کیے اور اُن سے سلسلہ قادریہ میں دست بیعت ہوئے۔ اپنے شیخ کی رحلت کے بعد خواجہ خدا بخش خیر پوریؒ سے روحانی تربیت حاصل کی اور مستقل ان کی مصاحبت میں رہے۔ یہاں تک کہ آپ نے انھیں خرقۂ خلافت عطا فرمایا۔[۴۵] منشی غلام حسنؒ قادر الکلام شاعر تھے جنھوں نے متعدد زبانوں میں شعر و سخن کیا۔ سرائیکی شاعری میں آپ گامن جب کہ فارسی، اُردو و عربی میں حسن تخلص کرتے تھے۔ آپ کا فارسی کلام "دیوان کامل شہید" اور سرائیکی کلام دیوان گامن کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ دیوانِ گامن کے سرورق پر آپ سرائیکی شعر طبع ہے:

سبھو نور ظہور ڈیندا مینوں شہر بازار محلہ گامن قرب جمال اللہؒ دا، مینوں رمز دئی قندیلؒ[۴۶]

منشی غلام حسنؒ نے شعر و سخن اور علومِ اسلامیہ میں قریباً ۲۴ کتب تحریر کیں۔ جن میں سے ۱۳ کا تذکرہ ڈاکٹر فرشتہ آہنگری نے کیا ہے جو قلمی یا مطبوعہ صورت میں موجود ہیں۔ ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے: ۱۔ انوار جمالیہ (سوانح حیات، شیخ حافظ محمد جمال اللہ ملتانیؒ ۲۔ دیوانِ حسن، ۳۔ دیوان گامن، ۴۔ انشای گلزار معانی (انشاء و نثر نویسی)، ۵۔ کلمات الانصاف (فقہ اسلامی)، ۶۔ مثنوی نور الہدایۃ (شعر)، ۷۔ مثنوی نور الھدیٰ (شعر)، ۸۔ رسالہ وجد (تصوف)، ۹۔ رسالہ رفیق الفقراء (ہدایت نامہ طلاب)، ۱۰۔ رسالہ بحر المواج، ۱۱۔ فضائل حنفیہ (فضائل امام ابو حنیفہ)، ۱۲۔ شمائل حنفیہ (فقہ حنفیہ)، ۱۳۔ خصائص حنفیہ (فقہ حنفی)۔[۴۷]

مولانا نور احمد فریدی لکھتے کہ نواب محمد مظفر خان اور نواب محمد بہاول خان کو آپ سے بہت عقیدت تھی۔ اسی طرح سکھوں کے متعین کردہ حاکم دیوان مول راج نے باقاعدہ آپ کی شاگردی اختیار کی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک درویش معزالدینؒ نے انگریز فوج کو بتایا کہ اس شہر کا باطنی حاکم منشی غلام حسنؒ ہے۔ جب تک وہ زندہ ہے ملتان فتح نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ آپ کو حالتِ نماز میں گولی مار کر شہید کیا گیا۔ آپ کی تاریخ شہادت ۲۹ محرم ۱۲۶۵ھ / ۲۳ دسمبر ۱۸۴۸ء ہے۔ آپ کی ابتدائی تدفین محمد پور گھوٹہ نزد قاسم بیلہ کے

---

[۴۴] مہاروی، گلشن ابرار، ص، ۴۸۹۔

[۴۵] مہاروی، گلشنِ ابرار، ص، ۴۸۹؛ سلیمانی، مناقب المحبوبین، ص، ۲۵۹۔

[۴۶] غلام حسن: دیوان گامن، سرورق

[۴۷] [غلام] حسن، دیوان کامل شہید، در مقدمہ، ص، ۲۰

قبرستان میں کی گئی۔ ایک سال تک آپ کے روضہ کی تعمیر ہوتی رہی جس کے بعد آپ کو موجودہ مقام پر دفن کیا گیا۔ جو خونی برج کے قریب، بیرون دہلی دروازہ محلہ آغا پورہ میں واقع ہے۔[۴۸]

آپ کے روضہ پر نصب کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعمیر ۱۲۶۵ھ میں ہی مکمل ہوئی۔ عبارت حسبِ ذیل ہے:

قطعہ تاریخ تعمیر بنائے روضہ عالیہ از طبع خلیفہ یار محمد عفی عنہ

غلام خاص لیس خواجہ ما	بنائے کرد این روضہ منور
عجب گنبد عجب محراب و مینار	کہ گرد و گرد او این چرخ اخضر
چو فردوسِ برین درگاہِ عالی	کہ شد میمون لقاء و خوب و خوشتر
خوشا بر گفت رضوان با خلیفہ	بگو سالِ بنا روضہ مطہر ۱۲۶۵ھ

۳۔ سید محمد زاہد شاہؒ

سید محمد زاہدؒ کی ابتدائی زندگی کے حوالے سے بہت کم معلومات میسر ہیں۔ زیادہ تر معلومات وہی ہیں جو انھوں نے اپنی کتاب اسرار الکمالیہ میں قلمبند کی ہیں۔ جس کے مطابق وہ سادات خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا گھر موجودہ ضلع مظفر گڑھ کے قصبہ سناواں کی نواحی بستی ٹھٹھی حمزہ میں تھا۔ اپنی عمر کے ابتدائی حصہ میں حافظ جمالؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حافظ جمالؒ آپ کو اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی۔ وہ ان کے ساتھ سفر و حضر میں اکثر شریک ہوتے تھے۔ اسرار الکمالیہ میں انھوں اس حوالے سے متعدد واقعات رقم کیے ہیں، جن سے ان کی اپنے شیخ کے ساتھ تعلقِ خاطر کی وضاحت ہوتی ہے۔ حافظ جمالؒ نے سید محمد زاہدؒ کو اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا اور وہ ان کے گھریلو اور خانگی معاملات میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ ایک مرتبہ جب حافظ جمالؒ کے خادم نے سید محمد زاہدؒ کو کسی کام کے حوالے سے سخت سست کہا تو آپ نے کہا: اے نادان! تمھیں علم نہیں کہ یہ میرا بیٹا ہے (اے ناداں این بندہ از فرزندانِ ماست)۔[۴۹]

حافظ جمالؒ ایک مرتبہ رمضان میں خان گڑھ کی طرف سفر پر تھے۔ عقیدت مندوں نے گزارش کی کہ عید ان کے ہاں کریں تو آپ نے جواب دیا کہ عید ہر کوئی اپنے گھر کرتا ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ تم لوگ کہتے ہو کہ میں عید اپنے گھر نہ کروں۔ چنانچہ آپ نے عید سید زاہدؒ کے گھر کی اور کہا: یہ میرا گھر ہے اور میں یہیں عید کروں گا۔[۵۰] اسی طرح حافظ جمالؒ نے آپ کی شادی نہ صرف طے کرائی بلکہ خود اس میں شمولیت کی اور نکاح کروایا۔ اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ آپ نے علوم و فنون کی تعلیم

---

[۴۸] فریدی، تذکرہ مشائخ چشت، ص، ۲۹۴؛ غلام حسن: دیوان گامن، در مقدمہ، ص۔ ۷

[۴۹] محمد زاہدؒ، سید، اسرار الکمالیہ، (قلمی نسخہ در لائبریری مخدوم محمد سلیم جمالی، ملتان)، ص، ۱۵۔

[۵۰] محمد زاہدؒ، اسرار الکمالیہ، ص، ۱۶۔

حافظ جمالؒ سے حاصل کی اور آپ کی وفات کے بعد خواجہ خدا بخش خیر پوریؒ سے اکتسابِ فیض کیا۔ آپ کی کتاب اسرار الکمالیہ آپ کی علمی جلالت اور ادبی فصاحت و بلاغت پر شاہد عادل ہے۔ خاص کر کتاب کا دوسرا حصہ جو وحدت الوجود کے مباحث پر مبنی ہے، اس میں آپ نے اس مسئلہ کو جس آسانی اور روانی سے پیش کیا ہے اس سے آپ کے تبحرِ علمی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں بیان کی جائے گی۔ حافظ جمالؒ کی وفات کے بعد آپ اُن کی خانقاہ پر ہی مقیم رہے۔ کیوں کہ دم وصال آپ نے اپنی اہلیہ کو کہا تھا۔ اس بات کی فکر نہ کرنا کہ تمھارا کوئی بیٹا نہیں۔ سید محمد زاہدؒ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ تمھارا بیٹا ہے"۔ [51] حافظ جمالؒ کی وفات کے بعد انھیں اپنے حجرے میں سپردِ خاک کیا گیا۔ [52]

خواجہ امام بخش مہارویؒ نے آپ کو حافظ جمالؒ کے خلفاء میں شمار کیا ہے۔ تاہم انھوں نے اپنے شیخ کی وفات کے بعد خواجہ خدا بخش خیر پوریؒ سے تجدیدِ بیعت کی اور ان سے وحدت الوجود کی تعلیم حاصل کی۔ [53] خواجہ امام بخش مہارویؒ آپ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی زندگی کا اکثر حصہ اپنے شیخ کے زیرِ سایہ درس و تدریس میں گزارا۔ اور آپ کی وفات کے بعد حافظ جمالؒ کے خانوادہ اور اہلِ خانہ کی خدمت کرتے تھے۔ اعراس کا بھی وہ انتظام و انصرام کرتے۔ وہ لکھتے ہیں: "اگر آپ کے کمالات اور حالاتِ زندگی کا ذکر بالتفصیل تحریر میں لایا جائے تو ایک اور کتاب تیار ہو جائے"۔ آپ کے چار بیٹے تھے۔ ا۔ سید غلام مصطفیؒ، ۲۔ سید غلام رسولؒ، ۳۔ سید محب جہانیاںؒ، ۴۔ سید غلام نبیؒ۔ [54]

تذکرہ کی کتب کے مطالعہ سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ سید محمد زاہدؒ کب واپس اپنی بستی ٹھٹھی حمزہ لوٹے۔ غالباً وہ حافظ جمالؒ کی اہلیہ کی وفات کے بعد اپنے گاؤں میں مستقل مقیم ہو گئے۔ جہاں انھوں نے اپنی علمی و تبلیغی مساعی جاری رکھیں۔ آپ کی قبر پر لکھے کتبہ کے مطابق آپ کی وفات ۵ ذی قعدہ ۱۲۵۱ھ یا ۱۲۵۲ھ کو ہوئی آپ کی مزار ٹھٹھی حمزہ کے مقامی قبرستان میں ہے۔ آپ کی قبر کے کتبہ پر تحریر ہے۔

فیض خلافت محمد جمالؒ

بود چوں فرزندِ شفقت کمال

---

[51] محمد زاہدؒ، اسرار الکمالیہ، ص، ۴۱

[52] محمد زاہدؒ، اسرار الکمالیہ، ص، ۴۲؛ مہاروی، مخزن چشت، ص، ۳۷۱؛ فریدی، تذکرہ مشائخ چشت، ۲۹۴

[53] محمد زاہدؒ، اسرار الکمالیہ، ص، ۴۶

[54] مہارویؒ، گلشن ابرار، ص، ۲۶۵؛ فریدی، تذکرہ مشائخ چشت، ۲۹۴

شیخ الاسلام والمسلمین، قطب العارف، برہان الواصلین، فخر السادات مزار پر انوار حضرت پیر سید محمد زاہد شاہ بخاری نور اللہ مرقدہ۔

۴۔ تذکار حافظ جمالؒ کا تعارفی و متنی مطالعہ

الف۔ علامہ عبد العزیز پرہاڑویؒ خصال رضیہ کا متنی مطالعہ

علامہ عبد العزیز پرہاڑویؒ نے یہ رسالہ عربی زبان میں تحریر کیا ہے اور یہ قریباً دس صفحات پر مبنی ہے۔ اس رسالہ کے متعدد نام تذکرہ نگاروں نے نقل کیے ہیں۔ علامہ پرہاڑوی کے ہم درس سید محمد زاہد شاہؒ نے اس کا نام "خصال رضیہ" نقل کیا ہے۔ جو غالباً اس رسالہ کے مقدمہ کے مندرجہ ذیل کلمات سے ماخوذ ہے: **فهذه الخصال الرضية و الشمائل السنية لمولانا و مرشدنا و هادينا قدس سره العزيز جمعها الفقير عبدالعزيز۔** بعد کے تذکرہ نگاروں حاجی نجم الدین سلیمانیؒ، علامہ اللہ بخش رضاؒ اور ڈاکٹر روبینہ ترین نے بھی اس کا نام "الخصال الرضیہ" ذکر کیا ہے۔[55] مولانا محمد برخوردار نے اس کا ترجمہ کیا ہے جس کے ابتدائیہ میں اس کا نام رسالہ جمالیہ ذکر کیا ہے تاہم متن میں انوارِ جمالیہ درج ہے۔ اس میں دونوں اُردو اور فارسی تراجم عربی متن کے متوازی دیئے گئے ہیں۔ جب کہ سرورق پر اس کا نام گلزارِ جمالیہ رقم ہے۔[56] اس کا دوسرا مطبوعہ نسخہ انوارِ جمالیہ کے نام سے شائع ہوا جس میں عربی متن کے متوازی اس کا صرف اُردو ترجمہ درج کیا گیا ہے۔[57] اس تفصیل سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اصل میں اس کا نام خصالِ رضیہ ہے جیسا کہ ابتدائی تذکرہ نگاروں سید محمد زاہد شاہؒ اور حاجی نجم الدین سلیمانیؒ نے نقل کیا ہے تاہم غالباً عام قاری کی رعایت کرتے ہوئے مترجم اور ناشرین نے اس کا نام رسالہ جمالیہ، انوارِ جمالیہ یا گلزارِ جمالیہ رکھ دیا ہے۔

اس رسالہ میں بیان کردہ مواد کو کسی حد تک دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک بڑا حصہ میں آپ کے حالاتِ زندگی اور معمولات بیان کیے گئے ہیں جب کہ دوسری طرف ضمنی طور پر آپ کے افکار و نظریات پر بھی بحث کی گئی ہے۔

---

[55] سلیمانی، مناقب المحبوبین، ص، ۲۵۸؛ اللہ بخش رضا: تذکرہ جمال، ص، ۱؛ روبینہ ترین، ڈاکٹر، ملتان کی ادبی و تہذیبی زندگی میں صوفیاء کرام کا حصہ، (ملتان: بیکن بکس، ۱۹۸۹ء)، ص، ۲۸۷

[56] خصال رضیہ کا اردو ترجمہ منشی محمد برخوردار نے کیا ہے۔ جس کا وہ مقدمہ میں ذکر بھی کرتے ہیں۔ تاہم اس کے فارسی ترجمہ کے بارے میں واضح نہیں کہ وہ کس نے کیا ہے۔ علامہ عبد العزیز پرہاڑویؒ، گلزارِ جمالیہ، مترجم اُردو: مولوی محمد برخوردار ملتانیؒ، (جہانیاں ضلع ملتان [موجودہ ضلع خانیوال]: مکتبہ جمال، سن ندارد)، ص، ۲

[57] انوارِ جمالیہ کے عنوان کے ساتھ العزیز اکیڈمی، کوٹ روڈ مظفر گڑھ نے اس کو اُردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا۔ ۱۳۹۱ھ / ۱۹۷۱ء میں شائع کیا۔ جب کہ مکتبہ جمال، خانیوال نے مولوی محمد برخوردار ملتانیؒ کے فارسی و اُردو ترجمہ کے ساتھ گلزارِ جمالیہ کے عنوان سے شائع کیا۔

۱۔ شخصی احوال

علامہ پرہاڑویؒ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے شیخ کامل کا نام حافظ محمد جمال الحق والدینؒ تھا۔ آپ کے والد کا نام محمد یوسفؒ اور دادا کا نام حافظ عبد الرشیدؒ تھا۔ جو قلعہ ملتان کے باہر مشرقی جانب سکونت پذیر تھے۔ ان کا حلیہ بیان کیا جس کے مطابق وہ ایک موزوں قامت کے مالک خوبصورت انسان تھے۔ ان کے چلنے اور بیٹھنے کے آداب بیان کئے کہ وہ تیز چلتے تھے اور اکثر تشہد کی حالت میں بیٹھتے تھے۔ آپ کے معمولات میں تھا کہ باوضو رہتے تھے۔ نماز کی امامت عمومی طور پر اس سے کراتے جو شریعت کا بڑا عالم ہوتا اور پرہیز گار ہوتا اور اگر ایسا امام موجود نہ ہوتا تو خود امامت کراتے۔ فجر کی نماز بطور خاص خود پڑھاتے۔ جمعہ کا خاص اہتمام کرتے اور بہترین پوشاک زیب تن کرتے۔ عمدہ خوشبو لگا کر مسجد آتے۔ علامہ پرہاڑویؒ نے آپ کی نماز کی ادائیگی کو بہت مفصل انداز میں بیان کیا۔ اسی طرح ان کے لباس کے بارے میں لکھا کہ وہ عمدہ پوشاک پہنتے تھے، تہبند کم استعمال کرتے تھے زیادہ تر شلوار پہنتے اور کھلے گلے والی قمیض پہنتے۔ سر پر زیادہ تر ٹوپی پہنتے اور کبھی پگڑی باندھتے، سفید دستار کا استعمال بہت کم کرتے، زیادہ تر منقش دستار پہنتے۔ علامہ پرہاڑویؒ نے آپ کی انگوٹھی کا ذکر کیا جو چاندی کی انگوٹھی تھی اور اس میں ہشت پہلو عقیق تھا اور اس پر "ان اللہ جمیل یحب الجمال" نقش تھا۔[58] وہ یہ انگوٹھی پہنتے نہیں تھے بلکہ بطور مہر استعمال کرتے تھے۔ بعض کم فہم اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ آپ نے محبوبیتِ حق کا دعوی کیا۔ ایسا نہیں تھا بلکہ یہ نیک شگونی، دعا اور تحدیث نعمت کا اظہار تھا۔

علامہ پرہاڑویؒ ان کے کھانے پینے کے آداب کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ وہ کم کھاتے، چھوٹے لقمے بناتے اور زیادہ چبا کر کھاتے، دعوت کو ضرور قبول کرتے تھے۔ ایک دفعہ جب وہ روزہ سے تھے تو ایک آدمی نے کھانے پر بلایا اور ہم بھی آپ کے ہمراہ گئے۔ جب دستر خوان لگا تو وہ روٹی کے لقمے بنا کر سالن میں ڈالتے جاتے اور ہم اس میں سے کھاتے جاتے۔ آپ نے یہ اس طرح سے کیا کہ میزبان کو اندازہ نہ ہوا کہ آپ نے کھانا نہیں کھایا۔ اسی طرح آپ کا یہ معمول تھا کہ پہلے حاضرین کو کھانا کھلاتے اور آخر میں خود کھاتے۔ آپ کبھی بھی کھانے میں عیب نہ نکالتے۔ جب کبھی ایک دن میں کئی دعوتیں ملتی تو کچھ میں وہ اپنے طالب علموں کو بھیج دیتے اور خود اس دعوت میں جاتے جس کا میزبان سب سے زیادہ غریب ہوتا۔ علامہ پرہاڑویؒ لکھتے ہیں کہ وہ اپنے شیخ کے ساتھ ایک غریب کے گھر دعوت پر گئے جس نے گائے کا گوشت بنایا تھا جو کہ صحیح طور پر پکا ہوا نہیں تھا۔ میری ناپسندیدگی میرے چہرے سے عیاں تھی۔ جب شیخ علیہ الرحمہ نے اس کا مشاہدہ کیا تو کھانے کی تعریف کرنا شروع کی اور بہت ذوق سے کھانا شروع کر دیا۔ پس مجبوراً میں نے بھی کھالیا۔ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو ہاتھوں کو دھویا اور رومال سے صاف کیا اور میزبان کے لئے بہت دعائیں کیں۔

شخصی خصوصیات میں انکی جرات و بہادری کا تذکرہ کیا کہ جب ملتان پر سکھوں نے حملہ کیا تو آپ کو مشورہ دیا گیا کہ وہ کسی دوسرے شہر کی طرف چلے جائیں تو آپ نے کہا کہ اب جہاد فرض ہو چکا ہے۔ پس ہم یہاں سے نہیں نکلیں گے۔ ہمارے سامنے دو ہی

---

[58] مسلم بن الحجاج، الصحیح، کِتَابُ الْإِيمَانِ، باب تَحْرِيمِ الْكِبْرِ وَبَيَانِهِ (۳۹)، حدیث رقم: ۲۶۵

بہترین انجام کار ہیں یا ہم غازی بنیں گے یا شہادت حاصل کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے مسلح ہو کر قلعہ کا دفاع کیا۔ آپ بہترین تیر انداز تھے اور تیر اندازی کی مشق کرواتے تھے۔

۲۔ تعلیم و تدریس

علامہ پرہاڑوی ؒ آپ کے درس و تدریس کو خاص طور پر زیر بحث لاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ آپ زمانہ طالب علمی میں بہترین طالب علم تھے جنھوں نے علوم و فنون کے سیکھنے میں بہت محنت سے کام لیا۔ بعد ازاں مجاہدہ و ریاضت میں مگن رہے۔ اور اپنے شیخ خواجہ نور محمد مہارویؒ کی صحبت اختیار کی۔ بعد ازاں آپ نے ملتان میں درس گاہ قائم کی جس میں آپ خود پڑھاتے تھے۔ آپ کا اندازِ تدریس ایسا تھا کہ دقیق مسائل کو آسان فہم اور سادہ انداز میں سمجھاتے۔ آپ بچوں اور طلبا پر بہت شفیق تھے۔ جب بھی کوئی طالب علم ان کے پاس آتا تو آپ اس سے ایسی بات کرتے جو اسے بھلی لگے اور اس کو میٹھی چیز کھلاتے اور جب انھیں کوئی چیز ناگوار ہوتی تو اس کا الفاظ میں اظہار نہ کرتے بلکہ ہم ان کے چہرے کے تاثر سے یہ بھانپ لیتے تھے اور وہ اشارہ کنایہ میں اس کی رہنمائی کر دیتے۔ آپ مختصر بات کرتے اور لوگوں کو ان کے مزاج کے مطابق مخاطب کرتے۔ اگر کوئی عالم ہوتا تو اس سے علمی باتیں کرتے اور اگر کوئی زراعت پیشہ ہوتا تو اس سے اس کی مناسبت سے بات کرتے۔ بسا اوقات ہنسی مزاح کی باتیں بھی کرتے تاکہ حاضرین کی خوش طبعی اور ظرافت باقی رہے۔ علامہ پرہاڑوی ؒ لکھتے ہیں کہ میں اپنے شیخ کے خطوط لکھتا تھا تو آپ نے مجھے کہا کہ خط واضح لکھا کرو، خطِ شکستہ میں نہ لکھا کرو۔ کاتب کے لیے یہ گناہ کم نہیں کہ قاری اس کی تحریر سے اذیت میں مبتلا ہو۔

علامہ پرہاڑویؒ لکھتے ہیں کہ کرامت سے مراد خارق العادت امر کا ظہور ہے۔ یعنی معمول کے بر خلاف کسی امر کا رونما ہونا کرامت کہلاتا ہے۔ لیکن آپ کہتے تھے کہ خارق العادت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی عادت کے بر خلاف کرے یعنی انسان اپنی بری عادات ختم کرے اور اخلاقِ حسنہ سے خود کو مزین کرے اور یہی کرامت ہے۔ نیز خارق عادات سے مراد مافوق الفطرت امور پر قدرت مراد لی جائے تو یہ مدارج بسا اوقات کفار کو بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اس طرح حافظ جمالؒ تعلیم کے ساتھ تربیت بھی کرتے تھے۔

۳۔ آداب و رسومِ طریقت

علامہ پرہاڑویؒ نے لکھا ہے کہ وہ چاروں سلاسل میں بیعت کرتے تھے تاہم سلسلہ چشتیہ میں بیعت کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ جب کوئی بیعت کرنے آتا تو اس کو پہلے وضو کا حکم دیتے اور پھر اس کو ہجوم سے خالی جگہ پر اپنے سامنے بٹھاتے اور اسے استغفار، تسبیح و تہلیل پڑھنے کا حکم دیتے اور پھر قرآنِ مجید کی تمہید اور سورہ نور کی کچھ آیات پڑھاتے۔ اس کے بعد اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے اور کہتے کہ میں نے تجھے فلاں طریقہ میں بیعت کیا اور پھر اسے اوراد و وظائف کا حکم دیتے۔ اسے اچھی طرح وضو، مسواک، کنگھی کرنے، سرمہ لگانے اور گناہوں سے بچنے کی تلقین کرتے۔ مبتدی کو درود شریف، کلمہ طیبہ اور سونے سے پہلے اسم جلال اللہ کا ذکر کرنے کی تلقین کرتے جب کہ منتہی کے لیے کہتے کہ بہترین شغل ندا اور صدا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی امر

ظہور پذیر ہو جس کا فاعل اور محرک وہ خود ہو یا کوئی اور وہ اس کو ایسے سمجھے کہ یہ امر در حقیقت من جانب اللہ ظاہر ہوا ہے اور وہی اس کا فاعلِ حقیقی ہے جب کہ انسان کے کرنے سے جو امر وجود میں آتا ہے وہ امر وہمی ہے۔ اس لیے جو اللہ کا فعل ہے وہ ندا یا آواز کی طرح ہے اور جو انسان کا فعل ہے وہ صدائے بازگشت کی طرح ہے۔

وہ اکثر یہ شعر پڑھتے تھے:

همه عالم صدائے نغمہ اوست
کہ شنید ایں چنیں صدائے دراز

یعنی تمام جہان اس کے نغمہ کی صدا ہے ایسی طویل صدا کس نے سنی ہو گی۔ علامہ پرہاڑویؒ کی تحریر سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ حافظ جمالؒ اپنے گفتگو اور درس و تدریس میں مشائخ چشت کا اکثر حوالہ دیتے تھے۔ خاص کر اپنے شیخ خواجہ نور محمد مہارویؒ اور ان کے شیخ مولانا فخر الدین محمد دہلویؒ کا ذکر کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مولانا فخر الدینؒ حدیث کے بہت بڑے عالم تھے اور وہ حدیث کی تعلیم و تدریس بڑے شوق سے کرتے تھے۔ وہ ظہر سے لے کر عصر تک امام بخاریؒ (۲۵۲ھ / ۸۱۰ء) کی الصحیح پڑھاتے اور جہاں پر درس منعقد ہوتا وہاں پر گلاب و لوبان کی خوشبو کا اہتمام کرتے اور پھر ایک یا دو احادیث پڑھتے، اور ان کے حقائق و معانی بیان کرتے اور ان سے مختلف مذاہب کے استنباطِ طرق کی وضاحت کرتے۔ اسی طرح وہ عصر سے مغرب تک مولانا رومؒ کی مثنوی کا درس دیتے تھے۔

خواجہ فخر الدین دہلویؒ ہر آنے والے شخص کی تعظیم میں کھڑے ہوتے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو آپ نے امام شرف الدین بوصیریؒ (۶۹۵ھ / ۱۲۹۴ء) قصیدہ بردہ کا یہ شعر پڑھا:

والنفس کالطفلِ اِن تہملہ شب علی
حب الرضاعِ واِن تفطمہ ینفطمِ

یعنی نفس کی مثال بچے کی طرح ہے۔ اگر اس کا دودھ نہ چھڑایا جائے تو وہ دودھ پینے کے شوق کے ساتھ جوان ہو جاتا ہے اور اگر اس کو بچپن میں چھڑا دیا جائے تو وہ چھوڑ دیتا ہے۔ میں ہر آدمی کے احترام میں کھڑا ہوتا ہوں تاکہ لوگوں کی عزت کرنا میری عادت بن جائے۔ اور میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں مجھے یہ عادت نہ پڑ جائے کہ میں کسی کی تعظیم نہ کروں۔ علامہ پرہاڑویؒ لکھتے ہیں کہ خواجہ فخر الدینؒ دراصل مظہر میں حقیقت کو دیکھتے تھے۔ اس لیے ہر ایک کا احترام کرتے تھے۔

۴۔ وحدت الوجود

علامہ پرہاڑویؒ لکھتے ہیں کہ آپ کا شمار ان اکابر علماء و محققین میں ہوتا ہے جن کو وحدت الوجود پر دسترس حاصل ہے۔ اس حوالے سے وہ شیخ الاکبر محی الدین ابن العربیؒ (۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء) کی فصوص الحکم، مولانا جلال الدین رومیؒ (۶۷۲ھ / ۱۲۷۳ء) کی مثنوی، مولانا عبد الرحمن جامیؒ (۸۹۸ھ / ۱۴۹۲ء) کی اللوائح اور نفحات الانس، شیخ عبد الحق دہلویؒ (۱۰۵۲ / ۱۶۴۲) کی اشعۃ اللمعات

اور ان کے علاوہ وہ خواجہ عبید اللہ احرارؒ (۸۹۵ھ / ۱۴۹۰ء) کی فقرات [رسالہ والدیہ] کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ خاص کر فصوص الحکم میں سے فص محمدی آپ کو بہت زیادہ پسند تھا۔ وہ جب پڑھاتے تو سر دھنتے اور جب وہ اپنے مریدوں کو اس کا درس دے رہے ہوتے تو ایسا سے بیان کرتے کہ کند ذہن آدمی بھی اسے اچھی طرح سمجھ لیتا۔[59]

علامہ پرہاڑویؒ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اپنے شیخ کے ساتھ کشتی میں سوار ہوا، ملاح نے پانی کی گہرائی جانچنے کے لیے لکڑی کے بانس کو دریا میں ڈالا۔ جب وہ پانی میں ڈوب گیا اور تہ تک نہ پہنچا تو ملاح کے منہ سے بے ساختہ "اللہ" نکلا۔ شیخ نے مجھے اشارہ کرتے ہوئے کہا: عبد العزیز کچھ بات سمجھ میں آئی کہ ملاح نے کیا کہا؟ میں نے جواب دیا: جی ہاں! حق تعالیٰ ایسے گہرے سمندر کی مانند ہے جس کی تہ کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ تو آپ نے فرمایا: بالکل تم نے ٹھیک سمجھا۔

آپ کہا کرتے تھے کہ وجود تمام کا تمام خیر ہے۔ اور بدکاری شر ہے کہ اس سے عصمت زائل ہو جاتی ہے۔ علامہ پرہاڑویؒ کہتے ہیں کہ یہ بہت اہم بات ہے کہ حکمت اشراق کے اہم مقدمات میں سے ہے، جن کے نزدیک "وجود" یا محض خیر ہے یا خیر اس کے شر پر غالب ہے۔ اور جہاں تک محض شر کا تعلق ہے یا غالب شر کا تعلق ہے تو وہ اصلاً نہیں پایا جاتا کیونکہ یہ حکمت کے خلاف ہے۔ لہٰذا غالب خیر، خیر ہے اور اس کا چھوڑنا خیرِ کثیر کو ترک کرنے کے مترادف ہے۔ صوفیہ کے ہاں یہ اہم نکتہ ہے۔ اسی وجہ سے جب بعض مشائخ سے پوچھا گیا کہ ایسا کافر جو مسلمانوں کا قتل کرتا ہے اس میں کیا خیر ہے؟ انھوں نے جواب دیا: اس میں دو ایسی خوبیاں ہیں کہ کسی اور میں نہیں پائی جاتیں۔ اور وہ یہ کہ اس کو قتل کرنے والا غازی ہوتا ہے جب کہ اس کا مقتول شہید ہوتا ہے۔ حافظ جمالؒ کے نزدیک خدا تک پہنچنے کا بہترین طریقہ وہ ہے جو صحیح اسناد کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ تک پہنچتا ہے اور وہ یہ ہے کہ شریعت سے خود کو آراستہ کیا جائے اور اس پر استقامت اختیار کی جائے اور باطن کو رزائل سے پاک کیا جائے۔ وہ حدیث "مومن، مومن کا آئینہ ہے" کی وجودی تعبیر کرتے تھے۔[60] جس کے مطابق اس کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے مومن سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات اور دوسرا بندۂ مومن ہے۔ یا اس کے برعکس اور یہ دونوں صحیح ہیں۔ حافظ جمالؒ نے فتوحاتِ مکیہ کے حوالے سے اس کی یہ تعبیر کی ہے کہ وہ تمہارا آئینہ ہے کہ وہ تمھیں تمہاری ذات دِکھاتا ہے اور تو اس کا آئینہ ہے کہ اس کے اسماء وصفات کا تجھ میں ظہور ہوتا ہے۔

---

[59] ان کتب کی تدریس چشتی روایت میں مربوط انداز میں ملتی ہے۔ حافظ جمالؒ کے شیخ، خواجہ نور محمد مہارویؒ بھی اپنے طلباء کو اہم کتب تصوف کی تعلیم دیتے تھے۔ مولانا محمد گھلویؒ لکھتے ہیں کہ انہیں حافظ جمالؒ نے بتایا کہ وہ خواجہ نور محمد نارووالہؒ، اور قاضی محمد عاقلؒ، خواجہ نور محمد مہارویؒ کے پاس لوائح جامی، سواء السبیل، تسنیم اور دیگر رسائل پڑھتے تھے اور ان اسباق کا اعادہ اور دہرائی خواجہ نور محمد نارووالہؒ کے پاس کرتے تھے۔ گھلویؒ، مولانا محمدؒ بن غلام محمدؒ، خیر الاذکار فی مناقب الابرار، مترجم: غلام جیلانی چاچڑ نقشبندیؒ، (ملتان: الکتاب گرافکس، ۲۰۱۶ء)، ص ۱۴۸

[60] ابو داود، الصحیح، کِتَابُ الْأَدَبِ، باب فِي النَّصِيحَةِ وَالْحِيَاطَةِ، حدیث رقم: ۴۹۱۸

علامہ پرہاڑویؒ لکھتے ہیں کہ میں اپنے شیخ کے ساتھ کشتی میں سفر کر رہا تھا آپ نے کہا: اے عبدالعزیزؒ وجود مطلق کی مظاہر میں ظہور کے حوالے سے موجوں سے بہتر کوئی مثال نہیں اور میں نے اکثر ان کو یہ شعر گنگناتے ہوئے سنا، جس کا مفہوم ہے سمندر زمانہ قدیم سے سمندر رہے جب کہ موجیں اور ندی نالے عارضی ہیں جو ابھرتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں۔

البحر بحر علیٰ ما کان فی القدم

ان الحوادث امواج و انہار

وہ مزید کہتے ہیں کہ اللہ کی "کن" کی معرفت محال ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس قول میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے: وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ ۗ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ۔[61] یعنی اس کا ڈرانا در حقیقت اس کا تم پر مہربانی فرمانا ہے تاکہ تم اس چیز کے حصول میں وقت ضائع نہ کرو جس کو تم حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی طرح وہ لکھتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو کئی ایسے علوم کی تعلیم دی جن کو پوشیدہ رکھنے کے لیے کہا۔ جب آپ معراج سے واپس لوٹے تو ایک دن دیکھا کہ وہ باتیں جن کو پوشیدہ رکھنے کا حکم دیا گیا وہ ایک دیوانہ سرعام لوگوں سے کر رہا تھا۔ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی: پروردگار! جس بات کو مجھے پوشیدہ رکھنے کے لیے کہا گیا ہے، وہ یہ دیوانہ اعلانیہ بیان کر رہا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ وہ میرے اسرار ہیں۔ دیوانے کی باتوں پر لوگ اعتماد نہیں کرتے لیکن اگر یہی باتیں آپ کریں گے تو فتنہ پھیلنے کا اندیشہ ہے۔

ب۔ منشی غلام حسن شہیدؒ کی انوارِ جمالیہ کا متنی مطالعہ

انوارِ جمالیہ کا ایک ہی قلمی نسخہ دستیاب ہے جو مخدوم محمد سلیم جمالیؒ نے اللہ بخش رضا کو ترجمہ کے لیے فراہم کیا تھا۔ اسی کی کاپی راقم الحروف کے پاس ہے۔ یہ نسخہ مکمل ہے۔ اس کے ۷۶ اوراق یا ۱۵۱ صفحات ہیں۔ نسخہ کے آخر میں کاتب کا نام "اللہ بخش" درج ہے۔ چشتی تذکروں میں اس کے متعدد حوالے ملتے ہیں۔[62] مخدوم زادہ محمد سلیم جمالی نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔[63]

انوارِ جمالیہ کا قریباً نصف حصہ حافظ جمالؒ کے احوال و کرامات پر مبنی ہے۔ جب کہ بقیہ نصف ان کے مشائخ سلسلہ اور خلفاءِ کرام کے احوال و اقوال پر مبنی ہے اور خلفاء میں سے بھی زیادہ تر خواجہ خدا بخش خیرپوریؒ (۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء) کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر انوارِ جمالیہ ایک مقدمہ، دو ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ، نعتِ نبوی ﷺ، تذکرہ

---

[61] آل عمران ۳، ۳۰۔

[62] سلیمانی، مناقب المحبوبین، ص، ۲۵۸؛ مہارویؒ، گلشن ابرار، ص، ۲۳۴، ۲۵۱، ۲۴۸، ۲۵۰؛ اللہ بخش رضا، تذکرہ جمال، ص۔ ۱۲

[63] جمالی، مخدوم زادہ محمد سلیم، لمعات جمالیہ اُردو ترجمہ انوارِ جمالیہ (فارسی) از منشی غلام حسن، (ملتان: جمال کیڈمی، الخطاط پرنٹنگ پریس، ۱۹۸۴ء)

خواجگانِ چشت اور ان کے مخصوص القاب کی وضاحت پر مبنی ہے۔ باب اول میں حافظ جمالؒ، جب کہ باب دوم میں ان کے خلیفہ خواجہ خدابخش خیرپوریؒ کے مناقب بیان کیے گئے ہیں اور خاتمہ میں خواجہ نور محمد مہارویؒ کی اولاد اور خلفاء، حافظ جمالؒ اور ان کے خلفاء اور صوفیائے چشت کے اقوال کو جمع کیا گیا ہے۔ تاہم کتاب کی ابتداء میں ہی مولف نے یہ واضح انداز میں بیان کیا ہے کہ یہ کتاب بنیادی طور پر حافظ جمالؒ کی کرامات اور ان کے روحانی مقامات کی شرح پر مبنی ہے۔

ا۔ نعتیہ کلام:

منشی غلام حسن شہیدؒ قادر الکلام شاعر اور نثر نگار تھے۔ ان کے فارسی اور سرائیکی دیوان طبع ہو چکے ہیں۔ ان کی فارسی نعتیں اور غزلیات چشتی حلقوں میں خاص کر مقبول ہیں اور اعراس کی محافل میں ان کو باقاعدہ پڑھا جاتا ہے۔ ان کی پر سوز نعتیہ شاعری کی بنیاد پر ان کو جامیِ ملتان کا لقب بھی دیا جاتا ہے۔ انوارِ جمالیہ کے مقدمہ میں سترہ منتخب نعتیں درج کی گئی ہیں۔ یہ تمام نعتیں دیوانِ فارسی میں معمولی ترامیم کے ساتھ شامل ہیں۔ یہ منتخب نعتیہ کلام اپنے اندر معانی و بیان کے عمدہ محاسن لیے ہوئے ہے جس میں محبتِ رسول ﷺ کو متنوع پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کے کلام میں وجودی عنصر غالب نظر آتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

تا جلوہ کرد حسن کمالِ محمدی — پر نور شد جہاں زِ جمالِ محمدی
آں ذاتِ بے مثال کی پنہاں پردہ بود — بے پردہ شد عیاں بہ مثال محمدی

اسی طرح یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

کجائی یارسول اللہ کجائی — کہ جانم برلب آمد از جدائی
ظہورت ہر دو عالم گرفتہ است — ولی در حیرتم پنہاں چرائی

اور

قسم بہ قبلۂ روئے تو یارسول اللہ — رواست سجدہ بہ سوئے تو یارسول اللہ
زبان ست تازہ بہ ذکرِ تو اے حبیبِ ازل — دل است زندہ زبوئے تو یارسول اللہ

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت کے اظہار کے لیے سادہ تراکیب میں عمومی مضامین ایسی نفاست کے ساتھ تحریر کیے ہیں کہ قاری کے دِل میں اتر جاتے ہیں۔

من عاشق جمال لقائی محمدم — پروانہ فروغ ضیائی محمدم
لطفِ محمدی زِ کجاترک من کند — چون ترک کرد خویش برائے محمدم

اور نعتیہ اسلوب اور خیال دونوں پر مولانا جامی کے واضح اثرات ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

ہر لحظہ آرزو زِ جنابِ رسالتم — دل می کشد بہ سوئے جنابِ رسالتم

درود و سلام کو مختلف انداز سے شعری صورت میں بیان کرنا نعتیہ اسلوب میں بہت متداول ہے لیکن نعت میں دعائیہ اسلوب کو جس طرح منشی غلام حسن نے اختیار وہ ایک امتیازی روش ہے۔

اے مخزنِ اسرارِ کرم یرحمک اللہ — وی مطلعِ انوارِ قدم یرحمک اللہ

اے گوہرِ جاں، مخزنِ حق، معدنِ احسان — اے بحرِ عطاء ابرِ کرم، یرحمک اللہ

اپنی کم مائیگی اور ممدوح کی عظمت، اپنی بے تابی اور ممدوح کی دوری کو متنوع اسالیب میں بیان کیا ہے۔

منم خاکِ سر کوئے محمد — اسیر حلقۂ موئے محمد

سجودِ عشق بازان است ہر دَم — بہ محراب دو اَبروئے محمد

نمازِ عشق ہر دَم می گذارم — بہ پیش قبلۂ روئے محمد

مقدمہ میں سترہ نعتیں ذکر کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد لکھتے ہیں کہ جن کی وجہ سے کفر و جہالت کی تاریکی اور شرک و گمراہی کے اندھیروں سے نجات ملی اور خلفائے راشدین نے احکامِ شریعت کا اجرا کیا اور امورِ ملت کی بجا آوری کی۔

۲۔ تذکرہ مشائخ چشت:

نعتیہ اشعار کے بعد وہ مشائخ چشت کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس کی ابتدا وہ حضرت علیؓ ابن ابی طالب (۴۰ھ / ۶۶۱ء) سے کرتے ہیں۔ وہ ان کے اسمِ گرامی کے بعد "رضی اللہ عنہما" لکھتے ہیں جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ حضرت ابو طالب کے ایمان کے قائل تھے۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے القابات سند الموحدین، امام المشارق و المغارب، مظہر العجائب و الغرائب اور اسد اللہ الغالب ذکر کرتے ہیں۔ اور یہ بتاتے ہیں کہ وہ چار سال تک خلیفہ رہے۔ انھیں رسول اللہ ﷺ نے بلاواسطہ معرفت اور سر مکنون عطا فرمایا۔ اس کے بعد وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حافظ جمالؒ کے خلیفہ خواجہ خدا بخش ملتانیؒ خیر پوری تک سلسلہ چشتیہ کے مشائخ کی سند کا ذکر کرتے ہیں۔ جن کے توسط سے مؤلف خود فیض یاب ہوئے۔

مقدمہ کے تیسرے حصہ میں وہ صوفیہ چشت کے معروف القابات کا ذکر کرتے ہیں۔ جس کے مطابق خواجہ عثمان ہارونیؒ (۶۰۳ھ / ۱۲۰۷ء) کے لیے مقتداء اہلِ عرفان، خواجہ معین الدین اجمیریؒ (۶۳۲ھ / ۱۲۳۵ء) کے لیے خواجہ بزرگ اور خواجہ غریب نوازؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (۶۳۳ھ / ۱۲۳۵ء) کے لیے شہیدِ محبت، بابا فرید الدینؒ (۶۶۴ھ / ۱۲۶۵ء) کے لیے غریقِ محبت اور گنج شکر، سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین دہلویؒ (۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء) کے لیے محبوبِ الٰہی، خواجہ نصیر الدینؒ (۷۵۷ھ / ۱۳۳۷ء) کے لیے چراغ دہلی، حضرت یحییٰ مدنیؒ (۱۱۴۱ھ / ۱۷۲۸ء) کے لیے قطب مدینہ[۶۴]، شاہ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ (۱۱۴۲ھ / ۱۷۲۹ء) کے لیے فانی فی اللہ، خواجہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ (۱۱۴۲ھ / ۱۷۳۰ء) کے لیے فخر العاشقین، خواجہ فخر

---

[۶۴] تکملہ سیر الاولیا کی روایت کے مطابق آپ کی وفات ۲۷ صفر ۱۱۴۱ھ میں ہوئی۔

الدین دہلویؒ (۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۴ء) کے لیے محب النبی، خواجہ نور محمد مہارویؒ (۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰ء) کے لیے قبلہ عالم، حافظ جمال اللہ ملتانیؒ کے لیے مخدومی اور خواجہ خدا بخش خیر پوریؒ کے لیے محبوب اللہ کے القابات مشہور ہیں۔ اسی طرح بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے بعد سلسلہ چشتیہ کی دو شاخیں بنیں ۔ خواجہ نظام الدین دہلویؒ سے منسلک سلسلہ نظامیہ جب کہ حضرت علاء الدین علی احمد صابرؒ (۶۹۰ھ / ۱۲۹۱ء) سے وابستہ سلسلہ صابریہ کے نام سے مشہور ہوا۔

منشی غلام حسنؒ لکھتے ہیں کہ حافظ جمال ہر سلسلہ میں بیعت فرماتے تھے اور مجھے میری خواہش پر آپ نے سلسلہ قادریہ میں بیعت کیا۔ مقدمہ کے آخر میں وہ خواجہ نور محمد مہارویؒ کے معروف خلفاء کا ذکر کرتے ہیں جن میں شیخ نور محمد نارووالہؒ (۱۲۰۴ھ / ۱۸۲۴ء)، حافظ جمال اللہ ملتانیؒ، قاضی محمد عاقلؒ، حافظ غلام حسن بھٹیؒ (۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۵ء)، خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسویؒ (۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۰ء) اور قاری عزیز اللہؒ (۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۴ء) شامل ہیں۔

۳۔ حافظ جمالؒ کے احوال:

باب اول میں منشی غلام حسنؒ، حافظ جمالؒ کے حالاتِ زندگی و کرامات کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ ان کے حالاتِ زندگی پر بہت اختصار کے ساتھ معلومات فراہم کرتے ہیں۔ وہ ضمنی طور پر اپنے ذاتی میلانِ طبع اور اپنے شیخ کے ساتھ تعلق کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ تاہم یہ باب زیادہ تر حافظ جمالؒ کی کرامات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ کرامات منشی غلام حسنؒ نے آپ کی وفات کے بعد آپ کے متوسلین سے سنی۔ ہر کرامت کے ذکر کے لیے "نقل است" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اصل راوی کا نام محذوف کر دیا ہے۔ یہ طریقہ کار صوفی تذکار میں متداول ہے۔ ذیل میں ان کرامات کی نوعیت کے بارے میں تحریر کیا جائے گا۔

انوارِ جمالیہ کے مطالعہ سے حافظ جمال کے مختصر حالات زندگی سے آگاہی ہوتی ہے ۔ جس کے مطابق وہ ملتان میں پیدا ہوئے اور ان کے والدِ گرامی نے بچپن میں قرآنِ مجید حفظ کروایا۔ جس کے بعد انھوں نے علومِ نقلیہ اور عقلیہ کی تعلیم حاصل کی۔ آپ نے تجارت کو اپنا کاروبار بنایا۔ منشی صاحب لکھتے ہیں کہ آپ کا ذریعہ معاش، تجارت تھا۔ روحانی علوم اور معرفت کے لیے انھوں نے خواجہ نور محمد مہارویؒ سے بیعت کی۔ اور ایک مدت تک ان کے زیرِ تربیت رہے۔ انوارِ جمالیہ کے مطالعہ سے یہ واضح نہیں ہوتا ہے کہ وہ کتنے عرصہ تک اپنے شیخ کے پاس رہے تاہم یہ بات واضح ہے کہ وہ کئی سال تک ان کے پاس رہے۔ یہاں تک کہ ان کے شیخ نے انھیں خرقۂ خلافت عطا کیا۔ اس کے بعد وہ ملتان واپس آئے جہاں اس عہد کے علماء و رؤسا آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے۔ آپ کے درس میں علوم دینیہ کی تدریس کے لیے دور دراز سے طلبہ آتے۔ منشی غلام حسنؒ لکھتے ہیں کہ آپ کی شخصیت کا اثر پورے ماحول پر تھا۔ علماو فضلا اور صلحا علم و فضل میں جب کہ اربابِ اختیار امورِ سلطنت میں آپ سے مشاورت کرتے تھے۔ وہ آپ کو امیر خسروؒ (۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء) کی اس رباعی کا مصداق سمجھتے ہیں :

اے چہرۂ زیبائے تو رشکِ بتانِ آزری   ہر چند وصفت می کنم در حسن از آں زیباتری

آفاق ہا گردیدہ ام، مہرِ بتان ورزیدہ ام　　　　بسیار خوباں دیدہ ام ، اما تو چیزی دیگری

منشی غلام حسنؒ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں کہ حافظ جمالؒ کی شخصیت سے وہ کس طرح مستفیذ ہوئے۔ اس تناظر میں وہ ان کی شخصیت اور طریقۂ تدریس اور اہلِ علم و فضل کے ساتھ تعلقات کو بھی اجمالی انداز میں ضمناً بیان کر دیتے ہیں۔ وہ خود اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ جوانی میں آوارہ لوگوں کی صحبت میں رہتے تھے جس کی وجہ سے ان کے افکار و خیالات بھی درست نہیں تھے۔ کبھی کبھار حافظ جمالؒ سے سر راہ مڈ بھیڑ ہوتی تو ان کی پُر جلال شخصیت سے بہت متاثر ہوتے لیکن کبھی گفتگو کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے لیکن تابِ سخن پھر بھی نہ ہوئی۔ تاہم حافظ جمالؒ بہت مشفق اور حقیقت بین تھے۔ وہ چہرہ دیکھ کر دِل کی کیفیت سمجھ جاتے تھے۔ میرے والد بھی ان کے ارادت مند تھے۔ ایک دن میرے والد نے ان سے میرے کند ذہن ہونے کا تذکرہ کیا۔ آپ نے یہ بات سن لی اور ایک دن جب وہ بوستانِ سعدی پڑھا رہے تھے تو میرے حال پر خاص توجہ فرمائی جس سے میری طبیعت کھل گئی اور علم و حکمت سے مجھے محبت ہو گئی۔ اور نظم و نثر میں مجھے ایسی مہارت حاصل ہوئی کہ خطۂ پنجاب میں میرے کمالات کا چرچا ہو گیا۔

منشی غلام حسنؒ لکھتے ہیں کہ ایک دن وہ حافظ جمالؒ کے حلقۂ درس میں [خواجہ عبید اللہ احرارؒ کی] فقرات پڑھ رہے تھے لیکن ذہن کچھ اور باتوں میں الجھا ہوا تھا۔ حافظ جمالؒ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور درس کی ایسی تعبیرات کیں جو ان کے مناسب حال تھیں۔ جس کی وجہ سے وہ بہت شرمندہ ہوئے اور انھوں نے اپنی اصلاح کر لی۔ منشی غلام حسنؒ کئی مقامات پر اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ حافظ جمالؒ کو ایسی بصیرت عطا تھی کہ وہ غیب اور دِل کی باتوں سے آشنا ہو جاتے تھے۔ لیکن وہ اس پر براہِ راست گفتگو کرنے کے بجائے اشارہ و کنایہ میں اس کی وضاحت کرتے تھے۔ اس حوالے سے منشی غلام حسنؒ ملتان پر سکھوں کے حملوں کا تذکرہ کرتے ہیں کہ خطۂ خراسان میں شاہ زمان درانی (۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء) کی حکومت (۱۷۹۳ھ / ۱۸۰۱ء) کمزور ہوئی تو اس کے اثرات پورے خطے پر مرتب ہوئے۔ سکھوں کی تحریک مضبوط ہوئی اور انھوں نے لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد ملتان پر حملہ کیا۔ اس وقت نواب محمد مظفر خان سدوزئی (۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۸ء)، ملتان میں شاہ زمان کے گورنر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ وہ حافظ جمال سے خاص ارادت رکھتا تھا۔ ملتان پر جب سکھوں نے پہلی بار حملہ کیا تو حافظ جمالؒ اپنے شیخ خواجہ نور محمد مہارویؒ کے پاس ان کی درگاہ پر تھے۔ سکھوں کا حملہ ناکام رہا۔ چند سال بعد دوبارہ سکھوں نے ملتان پر حملہ کیا اس وقت حافظ جمال ملتان میں تھے۔ وہ قلعہ میں محصور ہو گئے۔ نواب محمد مظفر خان آپ کے پاس آیا اور دعا کی درخواست کی اور حملہ کے انجام کی پیش گوئی کرنے کو کہا۔ آپ نے کہا: ان شاء اللہ انجامِ کار بہتر ہے۔ منشی غلام حسنؒ کہتے ہیں کہ آپ عموماً ایسے جملے زبان پر لاتے تھے جو ذو معنی ہوتے۔ آپ کے مذکورہ بالا جملہ سے بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ محاصرہ ختم ہو جائے گا اور بعض نے اس کی یہ تعبیر کی کہ ملتان پر سکھ قابض ہو جائیں گے اور مسلمانوں کو شہادت نصیب ہو گی۔ بہر حال اس حملہ میں سکھ ناکام ہوئے اور قلعہ فتح نہ ہو سکا۔

منشی غلام حسنؒ، حافظ جمالؒ کی شخصی زندگی کے بارے میں یہ چند معلومات فراہم کرنے کے بعد ان کی وفات کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ انھیں شدید بخار ہو گیا جس کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہو گئے۔ اس حالت میں انھوں نے اپنے شیخ خواجہ نور محمد مہارویؒ کے بیٹے کو خط لکھا کہ وہ تشریف لائیں۔ کاتب نے امیر خسروؒ کے مندرجہ ذیل شعر خط میں لکھے جس پر حافظ جمالؒ بہت خوش ہوئے:

به لبم رسیده جانم تو بیا که زنده مانم　　پس ازاں که من نمانم به چه کار خواہی آمد

کشش که عشق دارد نه گزاردت بدینساں　　به جنازه گر نیائی به مزار خواہی آمد

حافظ جمالؒ اس تکلیف سے جاں بر نہ ہو سکے۔ وہ مرض الموت میں بار بار نماز ادا کرتے تھے۔ وہ پانچ جمادی الاولیٰ ۱۲۲۶ ہجری [۱۸۱۱ء] کو واصل بحق ہوئے۔ خواجہ خدا بخش خیر پوریؒ نے ان کا نمازِ جنازہ پڑھایا۔ نواب محمد مظفر خان، دیگر اعیان ریاست علما و فضلا اور عوام کے جم غفیر نے شرکت کی۔

۴۔ مناقبِ حافظ جمالؒ:

منشی غلام حسنؒ نے اس باب کے بقیہ حصہ میں حافظ جمالؒ کی اڑتالیس (۴۸) کرامات اور خارقِ عادت امور کو نقل کیا ہے۔ وہ ان کے راویوں کا نام نہیں بیان کرتے اور نہ ہی ان مخصوص افراد کے نام ذکر کرتے ہیں جن کا کرامت میں ذکر ہوتا ہے۔ ان کرامات میں سے زیادہ تر ایسی ہیں جن میں آپ کی بصیرت اور معاملہ فہمی بیان کی گئی ہے۔ یعنی آپ نے وہ خیال جو کسی کے دِل میں تھا اس کو بھانپ لیا اور اس حوالے سے بات کی یعنی ملاحظہ خاطر کیا۔ کچھ کا تعلق مافوق الفطرت امور سے ہے جن کا صدور آپ سے ہوا جیسے ہوا میں معلق ہونا، بند دروازوں کا کھل جانا، آپ کی دُعا کی برکت سے بارش کا ہونا، لوگوں کے رزق اور مال میں برکت ہونا، مریدین و متوسلین کی امداد کو پہنچنا، مستقبل کی پیشین گوئی کرنا جیسا کہ نواب محمد مظفر خان کو بتایا کہ سکھ اس بار ملتان فتح یاب نہیں ہوں گے، خواب میں آکر اصلاحِ احوال اور نصیحت کرنا، آپ کی دعا کی برکت سے تھوڑا کھانا زیادہ افراد کے لیے کافی ہو جانا۔ غرض یہ کہ یہ کرامات ایسے موضوعات کے حوالے سے مرتب کی گئی ہیں جن کا اثر عوام الناس پر خاص طور پر ہوتا ہے۔ یہ روش اس عہد کے دیگر صوفی تذکروں میں بھی ملتی ہے جہاں مسلمانوں کے سیاسی زوال سے پیدا ہونے والے خلا کو کرامات اور فخر و مباحات سے پُر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بہر حال ان کرامات کے بیان کی وہ علمی حیثیت نہیں جو کہ حافظ جمال کی شخصیت کا بنیادی خاصہ ہے تاہم ان کے بیان کے دوران منشی غلام حسنؒ ضمنی طور پر کئی ایک اہم معلومات فراہم کرتے ہیں جن کی وجہ سے حافظ جمالؒ کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ حافظ جمالؒ کے حلقۂ درس میں اس موضوع پر بحث ہوئی کہ ولی اللہ کی کیا پہچان ہے؟ ہر ایک نے اپنی

علمی بساط کے مطابق علامت بیان کی۔ پھر حافظ جمالؒ نے فرمایا کہ ہر وہ شخص جو رسالت مآب ﷺ کی مکمل اطاعت کرتا ہے وہ بلاشبہ ولی کامل ہے۔

اسی طرح کرامات بیان کرتے ہوئے منشی غلام حسنؒ نے یہ بتایا کہ آپ کو اپنے شیخ خواجہ نور محمد مہارویؒ کے بیٹے خواجہ نور احمد مہارویؒ سے بہت محبت تھی اور ان میں باہم مشتاقانہ مراسم تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ خواجہ نور احمدؒ (۱۲۵۴ھ /۱۸۳۸ء) شکل و صورت میں اپنے والد سے مشابہت رکھتے تھے۔ آپ ان کا اکثر تذکرہ کرتے تھے، اور جب کبھی وہ ملتان تشریف لاتے تو آپ ان کی خدمت میں یہاں کے تحائف پیش کرتے تاکہ وہ اپنی محبت اور تعلق کا اظہار کر سکیں۔ خواجہ نور محمد مہارویؒ کی وفات کے بعد آپ بہت پریشان رہتے تھے۔ کچھ سالوں بعد جب ان کے جانشین آپ کے پاس آئے تو وہ ان کی آمد پر بہت خوش ہوئے۔ ان کا بھرپور استقبال کیا۔ اور علما و اعیان کی مجلس منعقد کی جس میں واشگاف انداز میں کہا کہ صاحبزادہ صاحب تربیت کے مدارج طے کر چکے ہیں۔ اور ان کو اس حوالے سے مشائخ سے مزید تربیت کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایک دفعہ صاحبزادہ صاحب نے آپ سے بال اور داڑھی کے خضاب کرنے کی اجازت چاہی تو آپ نے کہا ایسا ہر گز درست نہیں۔ ہم اپنے قبلہ عالم کے جمال کا مشاہدہ آپ کی صورت میں کرتے ہیں۔ ان بالوں کی نورانیت کو خضاب لگا کر تبدیل نہیں کرنا چاہئے۔ یہ گفتگو اس تعلقِ خاطر کو ظاہر کرتی ہے جو حافظ جمال کو اپنے شیخ اور ان کی اولاد سے تھا۔

اس باب کے آخر میں منشی غلام حسنؒ یہ لکھتے ہیں کہ ایک دن میرے والد نے حافظ جمالؒ سے میرے حوالے سے بات کی اور کہا اس کے امور میں آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ تو آپ نے فرمایا کہ وہ ہم میں سے ہے اور جو ہم میں سے ہے وہ ہماری جان ہے اور جو ہماری جان ہے، اس کا راحت و غم، تم سے زیادہ ہمیں ہے۔ یہ الفاظ اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ آپ کو اپنے شاگردوں سے بہت سے زیادہ تعلقِ خاطر ہوتا تھا۔

۵۔ خواجہ خدا بخش خیر پوریؒ کا تذکرہ

انوارِ جمالیہ کا دوسرا حصہ خواجہ خدا بخشؒ کے احوال و آثار کے حوالے سے ہے۔ ان کا لقب محبوب اللہ تھا۔ منشی غلام حسنؒ کے مطابق وہ حافظ جمالؒ کے خلیفۂ اعظم تھے۔ اور ان کے والدِ گرامی بھی بہت بڑے عالم تھے۔ علومِ منقولہ و معقولہ میں مہارتِ تامہ کے باوصف دور دراز تک علمی حلقوں میں معروف تھے۔ آپ کے مدرسہ میں جن لوگوں نے مرتبۂ فضیلت تک علم حاصل کیا ان کی تعداد ایک سو کے قریب تھی۔ جب کہ عمومی متوسلین تو ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ حافظ جمالؒ ان کو اپنے شیخ خواجہ نور محمد مہارویؒ سے ملاقات کے لیے اپنے ہمراہ لے گئے۔ اس موقعہ پر خواجہ نور محمد مہارویؒ نے حافظ جمالؒ سے کہا کہ تمہاری کچھار سے بہت بڑا شیر بر آمد ہوا ہے۔

جن دنوں سکھوں نے قلعہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا، کفار کے ستارہ شناسوں نے یہ بات مشہور کر دی کہ ملتان میں ایک قطب رہتا ہے جب تک وہ زندہ ہے اس کو فتح نہیں کیا جا سکتا۔ یقیناً یہ اشارہ حافظ جمالؒ کی طرف تھا۔ لیکن جب آپ نے یہ سنا تو فرمایا کہ مولوی صاحب قطبِ زمانہ ہیں۔ یہ در حقیقت ان کی بہت بڑی فضیلت ہے کہ ان کے شیخ نے ان کی ستائش ان الفاظ سے کی ہے۔ ایک مرتبہ ایک عظیم المرتبت شیخِ کامل نے حافظ جمالؒ سے کہا کہ خواجہ خدا بخش میں جو خوبیاں اور اوصاف ہیں اس بنیاد پر وہ ایک نیک بخت شخصیت کے حامل ہیں۔ یہ سن کر آپ نے کہا لفظ "نیک بخت" ان کے لیے بہت کم ہے وہ "محبوب اللہ" ہیں۔

منشی غلام حسنؒ نے خواجہ خدا بخش کے ذوقِ سماع کے حوالہ سے بھی روایات نقل کی ہیں کہ سماع کے دوران ان پر خاص ذوق طاری ہو جاتا تھا۔ آپ کو سماع کا بہت شوق تھا۔ لیکن اس کے باوجود کبھی سماع سننے کے لیے کسی کو زحمت نہ دی۔ حافظ جمالؒ نے ان کو خلافت عطا کی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اپنا حلقۂ ارادت قائم کریں۔ لیکن انھوں نے اپنے شیخ کی زندگی میں کسی کو دست بیعت نہ کیا۔ تاہم ان کی وفات کے بعد گروہ در گروہ لوگ آپ کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہوئے۔ سکھوں کے قبضہ کے بعد آپ نے ملتان کو چھوڑ دیا اور خیر پور میں اقامت گزیں ہو گئے۔ جہاں آپ نے مسجد، کنواں اور مہمان خانہ تعمیر کرایا۔ منشی غلام حسنؒ لکھتے ہیں کہ خواجہ خدا بخش خیر پوریؒ نے اپنے مال سے حافظ جمالؒ کی خانقاہ تعمیر کی۔ جہاں اعراس کا انعقاد ہوتا ہے اور لوگوں کی کثیر تعداد اس میں شرکت کرتی ہے۔ حافظ جمالؒ کی وفات کو بیس برس گزر چکے ہیں لیکن ابھی تک ان کا فیض ان کے خلیفہ اعظم خواجہ خدا بخش خیر پوریؒ کی ذات سے جاری ہے۔ ان کی خانقاہ میں آدابِ شریعت اور آدابِ طریقت دونوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ آپ نے "توفیقیہ" کے نام سے ایک رسالہ تحریر کیا ہے جس میں وحدت الوجود کے حوالے سے متنوع تعبیرات کو جمع کر کے ان میں مطابقت قائم کی گئی ہے۔[۶۵]

۶۔ خواجہ نور محمد مہاروی کی اولاد اور ان کے خلفاء کا تذکرہ:

انوارِ جمالیہ کے خاتمہ کو منشی غلام حسنؒ نے چھ فصول میں تقسیم کیا ہے۔ فصل اول میں قبلہ عالم خواجہ نور محمد مہارویؒ کی اولاد کی تفصیل بیان کی ہے۔ جس کے مطابق ان کے تین بیٹے تھے۔ ۱۔ حافظ نور الصمدؒ، جو اپنے والد کی وفات کے چند دن بعد شہید کر دیئے گئے۔ ۲۔ خواجہ حافظ نور احمدؒ، جو اس وقت سجادہ نشین ہیں۔ ۳۔ خواجہ حافظ نور حسنؒ۔ پھر ان میں سے ہر ایک اولاد کی تفصیل بیان کی ہے۔ خواجہ نور محمد مہارویؒ کے خاندان کی تاریخ کے حوالے سے یہ اہم دستاویز ہے۔ فصل دوم میں قبلہ عالم کے معروف خلفاء کا

---

[۶۵] توفیقیہ کا قلمی نسخہ علامہ اللہ بخش رضا مرحوم کے ذاتی کتب خانہ میں تھا جس کا عکسی نسخہ راقم الحروف کے پاس بھی موجود ہے۔ علامہ اللہ بخش رضا نے اس کا اُردو ترجمہ بھی کیا تھا جو تا حال طبع نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹر شبیر احمد جامی نے اس غیر مطبوعہ نامکمل ترجمہ سے استفادہ کیا ہے اور اس کی ایک عکسی کاپی بھی راقم کو عنایت کی ہے۔ ملاحظہ ہو: وحدت الوجود اور مشائخ چشت، (لاہور: کتاب محل، ۲۰۱۸ء)، ص، ۳۷۶۔۳۷۹

تذکرہ کیا گیا ہے۔ ۱۔ خواجہ نور محمدؒ نارووال۔ ۲۔ خواجہ حافظ جمال اللہؒ۔ ۳۔ قاضی محمد عاقلؒ۔ ۴۔ خواجہ میاں سلیمان خانؒ۔ ۵۔ قاری عزیز اللہؒ۔ ۶۔ میاں غلام احمدؒ۔ ۷۔ حافظ غلام حسنؒ۔ ۸۔ مولوی محمد اکرمؒ راجن پوری۔ ۹۔ میاں محمدؒ ماہ ہندوستانی۔ ۱۰۔ حافظ غلام رسولؒ۔ ۱۱۔ شاہ عبدالعزیزؒ۔ ۱۲۔ حافظ غلام رسولؒ۔ ۱۳۔ میاں محمد فاضلؒ۔ ۱۴۔ شیخ محمد بخش چشتیؒ ۔ ۱۵۔ شیخ تاج الدین چشتیؒ ۔ ۱۶۔ حضرت جمال محمد چشتیؒ۔ ۱۷۔ سید دین محمد شاہؒ۔ ۱۸۔ سید صالح محمد شاہؒ۔ ۱۹۔ میاں اکبر علیؒ۔ ۲۰۔ حضرت محمد شاہ بیگؒ۔ ۲۱۔ حافظ محمد عیسیٰؒ۔ ۲۲۔ حافظ غلام فریدؒ۔ ۲۳۔ حافظ عظمت اللہؒ۔ ۲۴۔ شیخ مسعودؒ (جانگی۔ بہاولپور)۔ ۲۵۔ مولوی نور اللہؒ (بھندی۔ خیر پور)۔

فصل سوم میں خواجہ نور محمد مہارویؒ کے ان خلفاء کا ذکر کیا ہے جنھوں نے بیعت کی تھی لیکن ان کو خرقۂ خلافت حافظ جمالؒ نے عطا کیا۔ ان میں حافظ غلام حسنؒ قابل ذکر ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ ان کو خلافت بھی قبلہ عالم نے دی تھی تاہم انھوں نے حافظ جمالؒ سے استفادہ کیا۔ انھوں نے ساری زندگی مہار شریف اپنے شیخ کی درسگاہ پر گزار دی اور وہیں ان کا مزار ہے۔ دوسرے خلیفہ مولوی محمد حسنؒ ہیں جو خواجہ نور محمدؒ نارووال سے دست بیعت تھے۔ بچپن میں خواجہ نور محمد مہارویؒ سے رتبہ قبولیت پایا اور حافظ جمالؒ نے ان کی تربیت پائی۔ آپ کا مزار راجن پور میں ہے۔ تیسرے خلیفہ مولوی محمد حبیب الدینؒ جو قبلہ عالم سے بیعت تھے اور اجازت و خلافت حافظ جمال سے حاصل کی۔

۷۔ حافظ جمالؒ کے خلفاء اور متقدمین صوفیہ کا تذکرہ:

فصل چہارم میں حافظ جمالؒ کے خلفاء کا تذکرہ ہے۔ جن میں سر فہرست خواجہ خدابخش خیر پوریؒ ہیں جن کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے اس کے علاوہ مندرجہ ذیل خاص طور پر معروف ہیں۔

۱۔ حضرت مولوی عبدالرزاقؒ (میلسی)۔ ۲۔ سید بلند شاہؒ۔ ۳۔ حضرت مولوی حامدؒ۔ ۴۔ سید زاہد شاہؒ۔ فصل پنجم مخطوطہ میں حذف ہے اور فصل ششم میں منشی غلام حسنؒ نے متقدمین صوفیہ کے مواعظ و نصائح اور علمی نکات بیان کیے ہیں۔ اس فصل کی ابتدا میں وہ اپنی سلسلہ قادریہ کے ساتھ نسبت کو بھی بیان کرتے ہیں اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ملفوظات نقل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ دلیل العارفین سے خواجہ معین الدین چشتیؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ جس میں چار صفات ہوں اللہ تعالیٰ اس کو اپنا دوست بناتا ہے جس میں سخاوت ہو دریا جیسی، شفقت ہو سورج جیسی، تواضع ہو زمین جیسی اور جسے صحبتِ صالحہ میسر ہو کیوں کہ نیک لوگوں کی صحبت، کارِ نیک سے بہتر ہے اور بدلوگوں کی صحبت، کارِ بد سے بُری ہے۔ اسی طرح وہ حضرت بہاء الدین زکریاؒ (۶۶۱ھ/۱۲۶۲ء)، حضرت حمید الدین ناگوریؒ (۶۷۳ھ/۱۲۷۴ء)، حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ، خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ (۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء)، شیخ بایزید بسطامیؒ (۲۶۱ھ/۸۷۴ء)، شیخ فضیل بن عیاضؒ (۱۸۷ھ/۸۰۳ء)، شیخ معروف کرخیؒ (۲۰۰ھ/۸۱۵ء)، شیخ ابراہیم بن ادھمؒ (۱۶۵ھ/۷۸۲ء)، شیخ ابوبکر شبلیؒ (۳۳۴ھ/۹۴۶ء)، شیخ ابوالحسن خرقانیؒ (۴۲۵ھ/۱۰۳۳ء) کے اقوال ذکر کرتے ہیں۔

ج۔ سید محمد زاہدؒ کی اسرار الکمالیہ کا متنی مطالعہ:

اسرار الکمالیہ کے حوالے دیگر چشتی تذکروں میں بکثرت ملتے ہیں۔[٦٦] اس کا فارسی متن تاحال زیورِ طباعت سے آراستہ نہیں ہوا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا محمد رمضان معینی، تونسہ شریف نے راقم کو فراہم کیا۔ اس کے صفحات کی تعداد ۴٦ ہے۔ یہی نسخہ اس سے قبل انھوں نے علامہ اللہ بخش رضا کو بھی دیا تھا۔ جس کے باب اول کا منتخب ترجمہ انھوں نے تذکرہ جمال میں شامل کیا۔[٦٧] اس کا ایک دوسرا نسخہ صاحبزادہ میاں محمد شعیب مہاروی، مہار شریف نے راقم الحروف کو دیا، جو ان کی آبائی کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس نسخہ کے آخری دو صفحات حذف ہیں۔

سید محمد زاہدؒ نے اسرار الکمالیہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصہ اول میں انھوں نے حافظ جمالؒ کے حالاتِ زندگی اور احوال بیان کیے ہیں لیکن اس کا اسلوب تذکرہ کے بجائے مجالس وملفوظات کا ہے۔ اس لحاظ سے اسرار الکمالیہ پہلے دونوں تذکروں کی نسبت مختلف ہے کیوں کہ خصالِ رضیہ میں براہِ راست حافظ جمالؒ کی شخصیت اور فکر کو بیان کیا گیا ہے جب کہ منشی غلام حسنؒ کی انوارِ جمالیہ میں بنیادی طور پر آپ کے کشف وکرامات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ دونوں تذکرے سید محمد زاہدؒ کی نظر میں تھے، جن کا ذکر انھوں نے اس تالیف کے مقدمے میں کیا ہے۔ انھوں نے حافظ جمال کے اقوال واحوال بیان کرنے کے حوالے سے کسی خاص ترتیب کا خیال نہیں رکھا۔ بلکہ یاداشتوں کو اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ اس کے مجموعی مطالعہ کے بعد قاری کے ذہن میں ان کی شخصیت کا تاثر اُجاگر کیا جائے۔ مختلف مجالس میں آپ نے اپنے علمی وروحانی اسفار کا تذکرہ کیا جن سے ضمنی طور پر آپ کے حالاتِ زندگی اور اندازِ تربیت کی وضاحت ہوتی ہے۔ اسی طرح آپ نے واقعات کے ضمن میں قرآن وسنت اور چشتی مشائخ کے اقوال سے استفادہ کیا ہے، جس سے آپ کے فکری رُجحان اور علمی ثقاہت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اسرار الکمالیہ کے دوسرے باب میں مسئلہ وحدت الوجود کی توضیح وتشریح کی ہے۔

ا۔ طہارت وصفائی کی اہمیت:

سید محمد زاہدؒ باب اول سے پہلے تمہیدی طور پر تذکرہ کی ابتدا نماز اور وضو کے مسائل سے کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ حافظ جمالؒ باوضو رہتے تھے اور کہتے تھے کہ طالب کو ہر وقت باوضو رہنا چاہیے۔ وضو کرتے ہوئے ماثور دعائیں پڑھتے تھے۔ وہ وضو کے دوران بالکل ترکِ تکلم نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح وہ وضو کے دوران مسواک کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ وضو جوانوں کی طرح کرنا چاہیے۔ جب کہ نماز بوڑھوں کی طرح آرام آرام سے ادا کرنی چاہیے۔ ایک دن انھوں نے پوچھا اس مصرعے کا کیا معنی ہے:

---

[٦٦] مہارویؒ، گلشن ابرار، ص، ٢٦٣، سلیمانی، مناقب المحبوبین، ص، ٢۴٦۔ ٢٧۵، ٢۵٨۔

[٦٧] اللہ بخش رضا، تذکرہ جمال، ص، ١۴

"وَضو را در وِضو کردہ وُضو کن"

ہمارے استفسار پر انھوں نے کہا کہ واؤ پر زبر پڑھیں تو اس سے مراد "پانی" اور زیر پڑھیں تو مراد "کوزہ" جب کہ پیش پڑھیں تو اس مراد اعضاء کو دھونا ہے۔

ایک دن انھوں نے سید امیر شہید کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا جو بہت جلد نماز ادا کر رہا تھا تو آپ نے کہا: "عزیزم! ہمیں تو سو سال ہو گئے نماز پڑھتے ہوئے اس قدر اژبر نہیں ہوئی کہ اتنی جلدی ادا کر سکیں۔ آپ خود نماز کی ادائیگی سنت طریقہ سے باجماعت ادا کرتے تھے۔ قیام کے وقت جائے سجود پر نظر ہوتی۔ قومہ اور جلسہ کی ادائیگی میں بہت وقفہ دیتے۔ سجدہ میں ناک اور پیشانی پر برابر زور دیتے جس کی وجہ سے ان کی ناک اور پیشانی پر سجدہ کے نشان بن گئے تھے۔

بابا فریدؒ سے یہ روایت فوائد الفواد میں مروی ہے کہ وہ ایسے شخص کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے جو سر کے بال نہ منڈواتا ہو۔[۶۸] حافظ جمالؒ بھی اپنے مریدوں کو سر منڈوانے کا حکم دیتے تھے۔ اور جو سر نہ منڈواتے تھے ان کے اس عمل کو ناپسند کرتے۔ تاہم سید محمد زاہدؒ کو انھوں نے بال رکھنے کی اجازت دی کیوں کہ انھیں نزلہ وزکام رہتا تھا لیکن جب انھیں آرام آگیا تو پھر انھوں نے بھی سر کے بال منڈوا دیئے۔ چشتی صوفیہ کے ہاں سر منڈوانے کی روایت بہت مضبوط ہے۔ اس کی بنیادی وجہ زیادہ صاف رہنا اور تکبر ختم کرنا ہے۔

۲۔ تفسیر صوفی

حافظ جمالؒ کہتے ہیں قرآن مجید کی آیت "وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا" ۚ[۶۹] (برائی کا بدلہ اس کی مثل برائی ہے) کی دو تعبیرات ہیں۔ علمائے ظاہر کے ہاں گناہ کا بدلہ اس کے برابر گناہ ہے۔ یعنی ہر وہ شخص جو برائی کرے اس کا بدلہ اس کے مثل برائی ہے۔ جب کہ عارفوں کے ہاں اس کا معنی یہ ہے کہ برائی کا بدلہ لینا اسی کی مثل برا ہے۔ پس جو معاف کر دیتا ہے اور صلح اختیار کرتا ہے اس کا اجر اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں گے۔ فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ[۷۰]۔ اس کے بعد سید محمد زاہدؒ اس کی تفسیر وجودی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں اور وہ یہ کہ صوفیہ کے ہاں تمام امور کا ظہور اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے پس ان

---

[۶۸] فوائد الفواد میں کئی ایک روایات ملتی ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ صوفیہ چشت جب کسی کو بیعت کرتے یا خلافت دیتے تو اس وقت اسے حلق کروانے کا حکم دیتے۔ اس کے علاوہ عمومی طور پر بھی سر منڈوانے کو اچھا سمجھتے کیوں کہ اس میں نظافت زیادہ ہوتی ہے۔ دوسری وجہ جو روایت ہے وہ یہ کہ اس سے تکبر و رعونت ختم ہوتی ہے۔ تاہم اس میں ایسی کوئی روایت نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو کہ سر منڈوانا امام کے لیے لازمی ہے۔ در حقیقت یہ ان کے ہاں ایک گونہ استحبابی امر ہے۔ ملاحظہ ہو: امیر حسن علا سجزیؒ، فوائد الفواد، مترجم: خواجہ حسن نظامیؒ، (لاہور: زاویہ، اشاعت سوم، ۲۰۱۳ء)، ص، ۱۷۴، ۱۷۵، ۲۰۴، ۴۷۸، ۵۰۸، ۵۲۸، ۵۵۴۔

[۶۹] الشوریٰ، ۴۲: ۴۰

[۷۰] الشوریٰ ۴۲: ۴۰

کے ہاں دوئی کا وجود نہیں ہے۔ چنانچہ خدا کی طرف سے توجہ ہٹانا در حقیقت دین میں کمی کی وجہ سے ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ عاشق اپنے معشوق مجازی سے ہمیشہ راضی ہوتا ہے، خواہ وہ التفات کرے یا اس سے بے رُخی برتے۔ وہ ہر حال میں اس سے خوش رہتا ہے۔ یہ کسی تعجب کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ جو معشوقِ حقیقی ہے، ہم اس کی بعض آیات پر ایمان لاتے ہیں اور بعض سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ وہ مولانا رومیؒ کی مثنوی سے بطورِ دلیل چند اشعار بھی پیش کرتے ہیں:

مالک الملک اوست ملک اُو را دہید
ما و من جملہ بہ پیش او نہید
اوست بر ہر بادشاہی بادشاہ
حکم اُو را یفعل اللہ مایشاء
یفعل اللہ ما یشاء چوں خواندہ
پس چرا در وسوسہ در ماندہ

اسی مفہوم کی آیت قرآنی ہے کہ جو کچھ بھی تجھے خیر ملے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور جو تجھے شر ملے وہ تیری ذات کی وجہ سے ہے۔[۱۷] خیر سے مراد قربِ الٰہی ہے اور شر سے مراد بُعد اور محرومی ہے۔ جو انسانی نفس کی وجہ سے ہے۔ یعنی تعین وہمی کی وجہ سے ہے جس کا در حقیقت کوئی وجود نہیں۔ پس وہ جس کا وجود حقیقی نہیں اس کا وجود اور عدم دونوں برابر ہیں۔ چنانچہ تعینِ وہمی کو مدِ نظر رکھنا در حقیقت شر ہے۔ جس کے سبب دُوری اور محرومی پیدا ہوتی ہے جب کہ ذاتِ حقیقی پر توجہ مرکوز کرنا خیر ہے جو کہ قرب اور فناءِ ذات کا موجب بنتی ہے۔

۳۔ حافظ جمالؒ کی مجالس میں تذکارِ صوفیہ چشت:

سید محمد زاہدؒ، حافظ جمالؒ کی مجالس کا ذکر کرتے ہیں جن میں وہ اپنے حلقۂ احباب اور درس و تدریس میں مشائخ چشت کے اقوال بیان کرتے تھے۔ مثلاً انھوں نے بتایا کہ خواجہ فخر الدین دہلویؒ کا بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ جب بھی کوئی مسئلہ اُن سے پوچھا جاتا تو وہ اپنے کتب خانے سے استفادہ کرتے۔ ایک روز ایک آدمی نے سوال کیا کہ گوشت کو کھانے کا سنت طریقہ کیا ہے، آیا کہ ہاتھ سے توڑ کر کھایا جائے یا دانتوں سے توڑ کر؟ آپ نے کتاب سے دیکھ کر جواب دیا کہ آپ ﷺ نے دونوں طریقوں سے گوشت کھایا ہے۔ اسی طرح ایک دن خواجہ فخر الدین دہلویؒ رمضان میں بازار سے گزر رہے تھے اور کسی آدمی نے شربت پیش کیا تو آپ نے وہ پی لیا۔ جب اُن سے یہ پوچھا گیا کہ آپ تو روزے سے تھے، آپ نے روزہ کیوں افطار کر دیا؟ تو آپ نے کہا کہ اس میں دو فائدے ہیں۔ ایک تو میں نے مسکین آدمی کی دلجوئی کی اور دوسرا سرکش نفس کو سزا دی اور وہ ایسے کہ اب اسے ایک کے بجائے ساٹھ روزے رکھنے پڑیں گے۔

---

[۱۷] ما اَصابک من حسنۃ فمن اللہ وما اَصابک من سیئۃ فمن نفسک، النساء ۴: ۷۹

اسی طرح حافظ جمال نے بتایا کہ خواجہ فخر الدین دہلویؒ کے ہاں جو بھی مریدین اور طلباء رہتے تھے ان کو ایک مقررہ مقدار میں غذا دی جاتی تھی تاہم جب خواجہ نور محمد مہارویؒ اپنے متعلقین کے ساتھ ان کے پاس جاتے تو وہ باورچی کو کہتے ان کو مقررہ مقدار سے زیادہ خوراک دیں کیوں کہ یہ لوگ زیادہ کھاتے ہیں اور سیر نہیں ہوتے۔ ایک سید زادہ، جو مجذوب تھا اور بہت مفلس تھا، نے ایک مرتبہ خواجہ فخر الدینؒ سے کہا: میں خواجہ نور محمد مہارویؒ کی ضیافت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ سن کر مسکرا دیئے اور پوچھا: اسبابِ ضیافت کہاں سے لاؤ گے ؟ اس نے جواب دیا: آپ سے لوں گا۔ چنانچہ آپ نے باورچی سے کہا کہ آج سید مجذوبؒ کی طرف سے دعوت کا اہتمام کیا جائے۔

حافظ جمالؒ بیان کرتے ہیں کہ دہلی میں میاں شمس الدین، خواجہ فخر الدینؒ کے مرید تھے۔ وہ اکثر خواجہ نور محمد مہارویؒ کو اپنے ہاں کھانے پر بلاتے تھے۔ ایک دفعہ حافظ جمالؒ نے خواجہ نور محمد مہارویؒ کے ہمراہ اجمیر کا سفر کیا۔ حافظ جمالؒ کہتے ہیں کہ ان دنوں میرے جوتے بہت پرانے ہو گئے تھے۔ ایک آدمی نے خواجہ نور محمد مہارویؒ کو نئے جوتے تحفہ دیئے اور میرے دِل میں خیال آیا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ شیخ اپنے پرانے جوتے مجھے دے دیں۔ اسی اثناء میں آپ نے وہ جوتے ایک اور خدمت گار کو دے دیئے۔ جب سفر سے واپس اپنے گھر پہنچے تو آپ نے مجھے کئی ایک نئے کپڑے اور ایک گھوڑی دی۔ تب میں نے سفر کی مشکل برداشت کرنے کی حکمت کو جانا اور اس کے بعد میں واپس ملتان آ گیا۔

حافظ جمالؒ، خواجہ محمد جمال الدین ہانسویؒ (۶۵۹ھ / ۱۲۶۰ء) کا ذکر کرتے تھے کہ قحط کے دنوں میں وہ سب سے کم کھانا کھاتے تھے۔ اور زیادہ تر فقرا میں تقسیم کر دیتے تھے۔ اسی طرح وہ بابا فرید کے اقوال بھی ذکر کرتے ہیں۔ ایک دن انھیں خبر ملی کہ ان کا ایک مرید فوت ہو گیا ہے تو آپ نے پوچھا کہ کیسی حالت میں فوت ہوا؟ انھیں بتایا گیا کہ وفات تک اس نے تمام نمازیں ادا کیں، سوائے آخری نماز کے جس میں وہ فوت ہوا۔ تو بابا صاحب خاموش ہو گئے لیکن ان کے داماد سید بدر دیوان [سید بدر الدین اسحٰقؒ] (۷ جمادی الثانی ۶۶۹ھ / ۱۲۶۹ء) نے کہا کہ اس کو اچھی موت نصیب نہیں ہوئی۔ جب سید بدر دیوان کی موت کا وقت آیا تو آپ پر غشی طاری ہوئی جیسے افاقہ ہوتا تو پوچھتے: کیا نماز کا وقت ہے ؟ تو لوگ اثبات میں جواب دیتے۔ چنانچہ آپ نماز کی ادائیگی میں مصروف ہو جاتے۔ ادائیگی کے بعد پھر پوچھتے: کیا یہ نماز کا وقت ہے ؟ لوگ انھیں کہتے: آپ نماز ادا کر چکے ہیں لیکن آپ پھر نماز ادا کرنا شروع کر دیتے، یہاں تک کہ ہر نماز کو کئی مرتبہ ادا کرتے۔ دمِ وصال آپ نے پوچھا: اب کس نماز کا وقت ہے ؟ انھیں بتایا گیا کہ اب کسی نماز کا وقت نہیں ہے۔ اس وقت ان کی وفات ہوئی۔ جب بابا فریدؒ کو ان کی اس کیفیت کے بارے میں بتایا گیا تو انھوں نے کہا: بدر دیوان نے اس روز جو بات کی تھی وہ اپنی استعداد کو مد نظر رکھتے ہوئے کی تھی۔ [۴۷]

---

[۴۷] [سید بدر الدین اسحٰقؒ کی وفات ۷ جمادی الثانی ۶۶۷ھ کو ہوئی جبکہ معروف روایت کے مطابق بابا فریدؒ ۵ محرم ۶۶۴ھ کو فوت ہوئے۔ اور سیر العارفین کی روایت کے مطابق اس وقت سید بدر اسحٰقؒ اس وقت آپ کے پاس موجود تھے۔ بابا فریدؒ پر جب نزع کا عالم تھا تو آپ

حافظ جمالؒ، بابا فریدؒ کے حوالے سے بیان کرتے تھے کہ وہ رمضان میں بیس رکعت تراویح ادا کرتے اور ہر رکعت میں تین دفعہ سورۃ اخلاص کی تلاوت کرتے۔ وہ ہر چار رکعت کے بعد ترویحہ کرتے جن میں تسبیح وصلوٰۃ پڑھتے۔ اور تیئیسویں رمضان کو تراویح کے بعد اور وِتر سے پہلے بعد سورہ الروم اور سورۃ العنکبوت کی تلاوت کرتے۔ حافظ جمالؒ کی مجالس میں خواجہ نظام الدین دہلویؒ کا اکثر تذکرہ ہوتا تھا۔ جب خواجہ نظام الدین دہلویؒ پاکپتن سے دہلی روانہ ہوئے تو بابا فریدؒ نے انھیں کہا: گرہِ ازار بند محکم خواھند داشت۔ اپنے ازار بند کی گانٹھ کو مضبوطی سے باندھے رکھنا یعنی اپنی عزت وناموس کی حفاظت کرنا۔ جس کا انھوں نے آخر دم تک خیال رکھا۔ خواجہ نظام الدین دہلویؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ وہ بابا فریدؒ کے نمازِ جنازہ میں شامل ہوئے اور انھیں اس مقام پر رسول اللہ ﷺ کی زیارت ہوئی جہاں بعد میں بہشتی دروازہ بنایا گیا۔ آپ نے اُسی مقام پر یہ فرمایا کہ ہر وہ شخص جس کا قدم نبی ﷺ کے قدم پر رہا یعنی جس نے آپ کی پیروی کی، وہ بہشتی ہو گیا۔ حافظ جمالؒ یہ کہتے تھے کہ بابا فریدؒ کا روضہ زیادہ بلند نہیں ہے کیوں کہ یہ خواجہ نظام الدین دہلویؒ نے اس طرح تعمیر کرایا کہ ہر اینٹ کو دھویا اور اس پر تین بار سورۃ اخلاص پڑھی۔ وہ بابا فریدؒ کی کچھ کرامات کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ اس طرح وہ سید جلال الدین مخدوم جہانیاںؒ (۷۸۵ھ / ۱۳۸۴ء) کی ادائیگی حج اور اس دوران ان سے ظہور ہونے والی کرامات کا ذکر کرتے ہیں۔

حافظ جمالؒ، چشتی مشائخ کے ذوقِ سماع کا بھی تذکرہ کرتے تھے۔ خاص طور پر خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے حوالے سے بیان کیا کہ ان کی وفات حالتِ سماع میں ہوئی۔ جب یہ شعر پڑھا جا رہا تھا۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

جب قوال پہلا مصرعہ پڑھتے تو آپ کی روح جسم سے نکل جاتی اور جب دوسرا مصرع پڑھتے تو واپس آجاتی۔ یہاں تک کہ آپ کی روح قفسِ عُنصری سے پرواز کر گئی۔ خواجہ نظام الدینؒ بھی سماع سے بہت محبت کرتے تھے اور اس کے آداب کا خاص خیال رکھتے تھے۔ وہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں انھیں چراغ کا لقب ان کے شیخ نے دیا اور وہ بھی سماع سے خاص محبت رکھتے تھے۔

حافظ جمالؒ نے شاہ رکن الدین عالمؒ (۷۳۵ھ / ۱۳۳۵ء) کے حوالے سے اس بات کا بھی دعوی کیا ہے کہ وہ سلسلہ چشتیہ میں حضرت نظام الدین دہلویؒ سے مجاز تھے۔ حافظ جمالؒ اس بات کا بھی تذکرہ کرتے ہیں کہ بادشاہ کے کہنے پر شاہ رکن الدینؒ، خواجہ نظام الدینؒ سے ملے تا کہ وہ اُن سے سماع کے موضوع پر بات کر سکیں۔ لیکن جب آپ ان کے پاس گئے تو مجلسِ سماع گرم تھی اور آپ کچھ کہے بغیر واپس آگئے۔ وہ بادشاہ اور خواجہ نظام الدینؒ کے مابین ہونے والی سرد جنگ کا بھی ذکر کرتے ہیں جس میں بادشاہ نے یہ تقاضا

بار بار نماز ادا کرتے اور سید بدر الدین اسحٰقؒ سے اس کے بارے میں بار بار نماز کے اوقات کا استفسار کرتے۔ یہاں تک کہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مہاروی، مخزنِ چشت، ص، ۱۹۵

کیا کہ وہ اُن کے حضور پیش ہوں ورنہ وہ ان کو زبردستی بُلا کر قتل کر دے گا۔ جس پر خواجہ نظام الدینؒ نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ جس کی وجہ سے دہلی میں ایک سنسنی اور خوف کا ماحول تھا کہ کہیں کوئی بھیانک واقعہ نہ رونما ہو جائے۔ امیر خسروؒ بھی اسی پریشانی میں آپ کے پاس آئے تو آپ نے انھیں تسلی دی اور کہا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ چنانچہ مقررہ وقت سے پہلے بادشاہ کے مقربین میں سے ایک نے اُسے قتل کر دیا۔

سید محمد زاہدؒ، حافظ جمالؒ کے مشائخ خواجہ نور محمد مہارویؒ، خواجہ فخر الدین دہلویؒ، شاہ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ اور ان کے ہم درس خواجہ نور محمدؒ نارووالہ کا تذکرہ کرتے ہیں۔ خواجہ نور محمدؒ نارووالہ اپنے شیخ سے بہت محبت کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ اپنے شیخ سے ملنے گئے تو کسی نے پوچھا: آپ پیدل آئے ہیں یا سواری پر؟ انھوں نے جواب دیا: پیدل۔ اس نے آپ سے پوچھا: آپ نے سواری کا اہتمام کیوں نہ کیا؟ آپ نے جواب میں یہ شعر پڑھا:

شوقِ طوافِ کعبہ اگر دامنت گرفت   اسبابِ زاد و راحلہ شد شد نشد نشد

ایک دفعہ خواجہ نور محمدؒ نارووالہ نے اپنے شیخ کو خط لکھا کہ میرے پاس کافی اسباب و سرمایہ جمع ہو گیا جس کی وجہ سے حج فرض ہو گیا ہے۔ اگر اجازت ہو تو حج ادا کر آؤں۔ آپ نے جواب میں لکھا کہ جو مال و اسباب تمھاری ضرورت سے زیادہ ہے اس کو خرچ کر دو تاکہ تم پر حج فرض نہ رہے۔

۴۔ شخصی احوال:

سید محمد زاہدؒ نے حافظ جمالؒ کے ساتھ اپنے تعلق کو بھی ضمنی طور پر ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حافظ جمالؒ ان سے خاص شفقت کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ رمضان میں سفر کر رہے تھے اور ماہِ شوال میں دو دن باقی رہ گئے۔ خان گڑھ کے لوگوں نے آپ سے کہا: اس دفعہ عید یہاں گزاریں۔ آپ نے کہا: عجیب بات ہے لوگ عید اپنے گھر کرتے ہیں اور آپ کہتے ہو کہ میں عید آپ کے پاس کروں۔ آپ اس وقت میرے گھر میں قیام فرما تھے۔ چنانچہ انھوں نے چھ دن ہمارے پاس قیام کیا اور عید میرے گھر میں کی۔ بعد ازاں وہ خان گڑھ روانہ ہوئے۔

ایک دن آپ نے مجھ سے میری شادی کے بارے میں پوچھا تو میں نے بتایا کہ ایک رشتہ پسند ہے لیکن اس میں دو مشکلات ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ سید نہیں جب کہ میرے رشتہ داروں کی یہ رائے ہے کہ سادات کو نکاح سادات سے کرنا چاہئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کی برادری کے بڑے لوگ بھی مخالف ہیں۔ آپ نے کہا: یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ سادات کا غیر سادات سے نکاح جائز ہے۔ اور جہلا کی باتوں کو اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ پھر آپ ڈیرہ غازی خان میں ایک فاتحہ خوانی کے لیے گئے اور چند دن وہاں قیام کرنے کے بعد میرے گھر تشریف لائے اور میرا نکاح پڑھایا۔

اسی سفر میں آپ نے (۱۲ ربیع الاول ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء) کی شب سناواں گذاری جہاں انھیں اطلاع ملی کہ ملتان پر سکھوں نے حملہ کر دیا ہے۔ آپ صبح سویرے نمازِ تہجد کے بعد ملتان روانہ ہوئے۔ کشتی والے آپ کو جانتے تھے انھوں نے آپ کو دریا عبور

کروایا۔ آپ نے کچھ وقت باغ سعد اللہ خان (۱۰۶۶ھ /۱۶۵۶ء) میں گزارا۔ اسی روز ان کو شدید بخار ہوا۔ آپ نے تھوڑی دیر وہاں قیام کیا اور پھر ظہر کے وقت اپنے گھر پہنچ گئے۔ آپ آٹھ روز شدید علیل رہے۔ اس عرصہ میں آپ نے مجھے نماز کی امامت کی ذمہ داری سونپی۔ حکیم منشی جان محمدؒ نے آپ کا علاج کیا۔ یہاں تک کہ آپ کو قدرے افاقہ ہوا اور وہ مسجد میں آئے لیکن ان کی طبیعت بحال نہ ہوئی۔ آپ کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ جس کی وجہ سے آپ کی بیگم صاحبہ پریشان تھیں۔ آپ نے انھیں میرے بارے میں کہا: یہ تمہارا فرزند ہے۔ مرض بڑھتا گیا یہاں تک کہ پانچ جمادی الاول کو آپ نے فجر کی نماز اشارہ کے ساتھ ادا کی اور پھر جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔

آپ کے خلیفہ اعظم مولانا خواجہ خدا بخش خیر پوریؒ نے تجہیز و تکفین کی ذمہ داری میرے سپرد کی۔ نواب محمد مظفر خان شہید اپنے تمام بچوں سمیت نمازِ جنازہ میں شریک ہوئے اور مولانا خدا بخش خیر پوریؒ نے آپ کا نمازِ جنازہ پڑھایا۔ وفات کے تیسرے روز صاحبزارہ نور احمد مہارویؒ اور نواب محمد مظفر خان نے خواجہ خدا بخش خیر پوریؒ کی دستار بندی کروائی۔ سید محمد زاہدؒ لکھتے ہیں کہ حافظ جمال اللہ ملتانیؒ کی وفات کے بعد انھوں نے مولانا خدا بخش خیر پوریؒ سے تجدیدِ بیعت کی تاکہ وہ وظائف اور وحدت الوجود کے معارف ان سے سمجھ سکیں۔

دوسرا باب: وحدت الوجود کا اختصاصی مطالعہ

ا۔ وحدت الوجود کے بنیادی مباحث

سید محمد زاہدؒ نے اسرار الکمالیہ کے دوسرے باب میں وحدت الوجود کے نظریہ کا اختصاصی مطالعہ کیا۔ اس بحث میں انھوں نے وحدت الوجود کے اثبات کے لیے متنوع دلائل پیش کیے ہیں جن کا تعلق، زبان و لغت، علم الکلام، علم التفسیر اور شعر و ادب سے ہے۔ تمہید میں مختصر خطبہ لکھتے ہیں اور پھر اس کی وجودی فکر کے تحت وضاحت کرتے ہیں۔ "الحمدللہ" کی وضاحت بیان کرتے ہیں کہ حمد مصدر ہے اور مصدر کا وجود، فاعل اور مفعول کے وجود سے ہے۔ چنانچہ حامد اور محمود لازم و ملزوم ہیں۔ کیوں کہ حمد اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے۔ اس لیے فی الحقیقت حامد و محمود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ "والعاقبۃ للمتقین" یعنی عاقبت صاحبانِ تقویٰ کے لیے ہے اور بہترین عاقبت یہ ہے کہ متقین کو جنت میں دیدارِ الٰہی نصیب ہو گا اور وہ ماسوا اللہ سے انقطاع کی لذت سے سرشار ہوں گے۔ درود و سلام اللہ کے پیغمبر محمد ﷺ پر ہوں جو سراپا رحمت ہیں جن کے سبب ذاتِ حقیقی سے ملاپ و وصال ہوا اور فرقت و جدائی کا غم دور ہوا۔ اور ان کے صحابہ پر جنھوں نے ان کی اتباع کی اس امر پر کہ وہ جہاد بالنفس کریں گے تاکہ فنافی الذات کا رُتبہ حاصل کر سکیں۔

کلمہ طیبہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی وضاحت بیان کرتے ہیں کہ وجودِ حقیقی سوائے ذاتِ مطلق کے کسی کا نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اس معنی پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ جلیل اور ہے اور حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ گرامی اور ہے۔ سید محمد زاہدؒ اس کا جواب ذکر کرتے ہیں کہ رسول بمعنی وکیل کے ہیں اور وکیل، موکل اور موکل الیہ کے درمیان واسطہ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے رسول اللہ ﷺ حق اور خلق کے درمیان بطورِ واسطہ و برزخ ہیں اور یہی ظاہری تعبیر ہے۔ تاہم صوفیہ کے نزدیک احدیت

اور واحدیت تفصیلیہ کے درمیان وحدت برزخ وواسطہ ہے۔ کیوں کہ ذات بہ اعتبارِ اطلاق اَحدیت ہے جب کہ بہ اعتبارِ صفاتِ تفصیلیہ واحدیت ہے اور بہ اعتبار صفاتِ مجملہ وحدت ہے۔ اور یہی حقیقتِ محمدیہ ہے جو اَحدیت اور واحدیت کے درمیان واسطہ و برزخ ہے۔ اس لیے یہ بات واضح ہونا چاہئے کہ ذاتِ واحد ہے جب کہ تکثیر اعتبارات میں ہے۔ چنانچہ معنی یہ ہوا کہ سوائے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی کے کوئی وجود حقیقی نہیں اور یہ مرتبہ احدیت ہے۔ اور حقیقتِ محمدیہ ﷺ، مرتبہ وحدت پر ہے۔ چنانچہ ان کے مابین دوئی و مغایرت نہیں ہے۔ دوئی اعتبارات میں ہے اور اعتبار تو ایک خیالی امر ہے۔ اور خیال کا وجود اور عدم برابر ہے۔ اور یہی معنی ایمان مجمل "اٰمنت باللہ وملئکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الاخر والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ والبعث بعد الموت" میں بیان کیا گیا ہے۔

اس امر پر ایمان لانا ضروری ہے کہ "اللہ" اپنے مرتبہ اطلاق میں اپنے تمام اسماء وصفات سے منزہ ہے جب کہ مرتبہ تعین میں اس سے اسماء وصفات کا ظہور ہوتا ہے۔ فرشتے اس عالم میں زندہ ہیں اور اللہ کی کتابیں اس کا کلام ہیں۔ انسان اس کے وجود کا مظہر ہے جب کہ پیغمبرانِ گرامی اس کا بہترین مظہر ہیں۔ کیوں کہ وہ انسانوں میں سے انسانِ کامل ہیں۔ اور قیامت کو اللہ تعالیٰ کا ظہور ان تعیناتِ کثیفہ کے بجائے تعیناتِ لطیفہ میں ہوگا۔ اس لحاظ سے ذاتِ مقدس کا ظہور ابتدائی طور پر تعینات میں ہوا ہے جس کی وجہ سے سالک وہم کے پھندے میں گرفتار ہوگیا۔ یقین ہونا چاہئے کہ حق تعالیٰ کا ظہور خیر وشر کی تمام صفات میں ہے لیکن اس کی طرف شر کی نسبت اعتباری ہے۔ درحقیقت اس کا وجود تمام تر خیر ہی خیر ہے۔ مثلاً بظاہر کفر شر ہے لیکن اس میں بھی خیر کا پہلو پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ کفار سے قتال کر کے زندہ بچ جانے والا غازی کہلاتا ہے اور جو مر جاتا ہے وہ شہید ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اس امر کا یقین رکھنا چاہئے کہ تعینات کے فنا کے بعد صرف ذاتِ مطلق باقی رہ جاتی ہے جس کا ظہور تعینات سے ماوراء روزِ حشر کو ہوگا۔ اس لیے ایک مرد صوفی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ذاتِ مطلق پر ایمان لائے اور اس کے ساتھ اس کی متعینہ صفات پر بھی ایمان رکھے تاکہ وہ مومن بن سکے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ پورا ایمان لائے تاکہ مومن کامل بن سکے۔ اللہ تعالیٰ کے تمام اوامر ونواہی اور اقوال وافعال پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ بعض پر ایمان لائے اور بعض کو ترک کر دے۔

درحقیقت شریعت وطریقت دونوں قرآن مجید سے ثابت ہیں۔ شریعت ظاہری کے دلائل جیسے نماز ادا کرنا، وضو کرنا، قصاص اور صلح وجنگ کے احکام سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عابد اور معبود کے درمیان فرق ہے۔ عابد اور ہے اور معبود اور۔ قاتل اور ہے اور مقتول اور۔ ان احکام سے دوئی کا مفہوم واضح ہوتا ہے۔ جب کہ دوسری طرف طریقتِ باطنی کے دلائل ہیں جو وحدت کا شعور پیدا کرتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ[۴۷]۔ جو بھی اس کائنات میں موجود ہے وہ ان چار سے باہر نہیں ہے۔ اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کچھ بھی موجود نہیں ہے۔

---

[۴۷] الحدید ۵۷: ۳

اسی طرح مندرجہ ذیل آیات وحدت الوجود کا شعور دلاتی ہیں: كُلُّ شَىْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۔[74] (ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اُس کی ذات کے)، اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۔[75] (تم میت ہو اور وہ میت ہیں)، وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۔[76] (اور نہیں تم نے پھینکیں جب تم نے پھینکیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکیں)۔

ان آیات سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ وجودِ حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ اس لیے یہ معاملہ حل طلب ہے کیوں کہ بعض آیات دوئی کا شعور جب کہ دیگر وحدت کا شعور دیتی ہیں۔ جس کی وجہ سے اہلِ شریعت و طریقت میں باہم اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ ان آراء میں تطبیق دینے کے لیے مولانا خدا بخش خیر پوریؒ نے ایک رسالہ "توفیقیہ" تحریر کیا ہے اور ان میں مطابقت پیدا کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ذاتِ واحد موجود ہے وہ مرتبۂ اطلاق میں معبود و مسجود ہے اور مرتبۂ تفصیلیہ میں وہ اعتبارِ وہمی سے عبارت ہے۔ جو عابد و ساجد کی صورت میں نظر آتا ہے۔ یعنی حقیقی طور پر وجودِ حقیقی خارجی صرف ذاتِ مقدس ہے اور جو وجود صور و اشکال میں نظر آتا ہے وہ صرف وہمی ہیں جیسے سراب کو پانی سمجھا جائے یا بھنور میں نقطۂ جوالہ کے وجود کو مانا جائے۔ اس لحاظ سے احمد جامؒ (۵۳۶ھ / ۱۱۴۱ء) کا شعر بہت خوب ہے جو یہ مفہوم رکھتا ہے کہ چاند سے لے کر مچھلی تک ساری مخلوق جلوۂ الٰہی کے ظہور کی دلیل ہے۔

تماشائی کہ از مہ تا بہ ماہی است
دلیل از نمو داری الٰہی است

اشیا بھی اپنے مرتبۂ اطلاق میں ایک خاص نام اور حکم رکھتی ہیں جب کہ مرتبۂ تعین میں ان کا نام اور حکم بدل جاتا ہے۔ جیسے سونا، چاندی، مٹی، درخت، روئی، ہوا، پانی، آگ اور دیگر موجودات۔ سونے سے بننے والے زیورات سونے کے ہوتے ہیں لیکن ان کو سونا نہیں کہا جاتا بلکہ انھیں گلوبند، پازیب، بالیاں وغیرہ کہا جاتا ہے باوجود اس کے کہ وہ سونا ہیں۔ اس طرح مٹی سے بننے والے برتنوں کو مٹی نہیں کہا جاتا اگرچہ وہ مٹی ہی ہیں لیکن اگر انھیں تعنیات کی بجائے مرتبۂ اطلاق میں دیکھیں تو وہ سونا اور مٹی ہیں اور صور و اشکال کے تنوع کے باوجود ان کے وجود میں وحدت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اگر ہر چیز میں ذاتِ حقیقی کو مدِ نظر رکھا جائے تو وہ صرف وجودِ حقیقی خارجی ہے اور اگر تعینات کو مد نظر رکھا جائے تو وہ صرف وجود وہمی ہے جس کا اعتبار نہیں ہے جیسا کہ سایہ کا کوئی وجود نہیں۔ اس لیے بندۂ مومن کو مومن کامل ہونا چاہئے اور وہ تمام صفاتِ شریعت و طریقت پر کاربند ہو۔ ایسا نہیں کہ وہ بعض آیات کو مانے اور بعض کا انکار کر دے۔ در حقیقت ذات صرف ایک ہے اور احکام آثار کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے سالک کو اس پر اعتقاد رکھنا چاہئے کہ ذاتِ مقدس کے علاوہ کوئی چیز موجود نہیں اور وجودِ حقیقی خارجی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ لیکن وہ اپنے کمالِ ظہور کی

[74] القصص ۲۸: ۸۸

[75] الزمر ۳۹: ۳۰

[76] الانفال ۸: ۱۷

وجہ سے انسانی آنکھ سے پوشیدہ ہے۔ جیسے انسان دوپہر کے وقت سورج کی طرف نہیں دیکھ سکتا اور اگر دیکھے تو بینائی سے محروم ہو جائے گا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سورج کا وجود ہے لیکن ضعفِ بصر کی وجہ سے اس کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں کہا جاتا ہے وہ اپنے کمالِ ظہور کی وجہ سے نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے (اے تو مخفی از ظہورِ خویشتن) اس لیے اگر ذاتِ الٰہی کا مشاہدہ کرنا ہے تو دِل کی آنکھ کھولیں اور اپنی ذات میں خدا کے جلووں کو دیکھیں۔ نہ کہ یہ اعتقاد رکھیں کہ ذاتِ مقدس کا جسم ہے جس کو دیکھا یا محسوس کیا جا سکتا ہے۔ تاہم ذاتِ مقدس کے حسبِ تجلّی علیحدہ علیحدہ احکام ہیں۔ وہ مرتبۂ اطلاق میں "اللہ" جب کہ وہ مرتبۂ تقید میں "بندہ" ہے اسی وجہ سے حفظِ مراتب کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ انسان زندیقیت کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

ہر مرتبہ از وجودِ حکمی دارد
گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی

اس لیے اس بات کو مدِّ نظر رکھنا چاہیے کہ مرتبۂ اطلاقِ ذات میں تمام تعینات اور اسماء و صفات کی قیود اُٹھ جاتی ہیں اور سالک کو اس مرتبہ میں معرفت، طریقت اور حقیقت حاصل ہوتی ہے۔ جب کہ مرتبۂ تقید میں اسماء و صفات اور اوامر و نواہی کی قیود ہوتی ہیں اس لیے اس مرتبہ میں ذاتِ مقدس کا حصول شریعت سے ہوتا ہے۔ تاہم یہ بات تحقیق شدہ ہے کہ تعینات سے ماوراا گر دیکھا جائے تو ذاتِ واحد ہے جو اول و آخر اور ظاہر و باطن ہے۔ جس کے علاوہ سب فنا ہونے والا ہے۔ اور ہما شما سب میت ہیں۔ جب کہ اگر تعینات کو دیکھا جائے تو وہاں اوامر و نواہی ہیں، جس میں ذاتِ واحد ہے اور احکام مختلف ہیں۔ اور یہ امر قرآنِ مجید سے ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے یہ بات جاننا چاہیے کہ ولایت میں کمال، شریعت و طریقت سے متصف ہوئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ قرآن پر ایمان نہ لایا جائے۔ ان آیات پر بھی جو دوئی کا شعور دیتی ہیں اور ان آیات پر بھی جو وحدت کا بیان اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہیں۔

سید محمد زاہدؒ مختلف اشعار کی صوفی تعبیر سے وجودی فلسفہ کو آسان پیرایہ میں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

صبح دم چون رُخ نمودی شد نمازِ من قضا
آفتاب چوں بر آید سجدہ ہاگے باشد روا

وہ لکھتے ہیں کہ اس شعر کی دو تعبیرات ہیں، ایک یہ کہ جب سورج طلوع ہو جاتا ہے تو فجر کی نماز قضا ہو جاتی ہے اور طلوعِ شمس کے وقت نماز ادا کرنا درست نہیں۔ اور دوسری تعبیر یہ ہے کہ قضا کا معنی "ادا کرنا" کیا جائے۔ تو اس وقت اس سے مراد یہ ہو گی کہ جب آفتابِ حقیقت روشن ہو جائے تو اس وقت میری نماز ادا ہو جائے گی کیوں کہ سوائے ذاتِ حق کے کسی کو سجدہ کرنا جائز نہیں اس لیے دوسری تعبیر کے مطابق "گے" کا معنی کجا ہے۔ جب کہ پہلی تعبیر کے مطابق اس کا معنی کدام ہے۔ اسی وجہ سے عرفا لکھتے ہیں کہ اگر کسی نے بیت اللہ کو اس نیت سے سجدہ کیا کہ وہ مظہرِ ذاتِ حق ہے کہ تو اس کی نماز جائز ہے۔ گویا سجدہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو کیا ہے

نہ کہ تعین کو۔ تاہم اگر بیت اللہ کو سجدہ کرنے کی نیت کی تو اس صورت میں اس کی نماز درست نہیں کیوں کہ اس صورت میں ذاتِ الٰہی کے بجائے تعین کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ اس نکتہ کو کیا خوب بیان کیا گیا ہے:

میلِ ابروئے تو دارم قبلہ من روئے تو
کافرم من کہ بہ محرابِ دگر مائل شوم

مجھے تو آپ کے خمِ آبرو کی چاہت ہے۔ کیوں کہ آپ کا چہرہ میرا قبلہ ہے۔ اگر کسی اور محراب کی طرف مائل ہو جاؤں تو میں خود کو کافر جانوں۔

تاہم بیت اللہ کا تعین کرنا نماز کے لیے ضروری ہے اور بیت اللہ کی سمت کو مدِ نظر رکھنا شریعت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ لیکن عرفا کے ہاں ذاتِ مقدس کے علاوہ کسی اور کو ملاحظہ کرنا درست نہیں بلکہ کفر ہے۔

۲۔ حضرت علیؓ کی باطنی افضلیت:

سید محمد زاہدؒ اہلِ سنت وجماعت کا نقطۂ نظر لکھتے ہیں کہ ہمارے پیغمبر علیہ السلام کے بعد حضرت ابو بکرؓ (۱۳ھ / ۶۳۴ء)، حضرت عمرؓ (۲۳ھ / ۶۴۴ء)، حضرت عثمانؓ (۳۵ھ / ۶۵۶ء) اور حضرت علیؓ (۴۰ھ / ۶۶۱ء) بالترتیب افضل ترین انسان ہیں۔ وہ شیخ فرید الدین عطارؒ (۶۱۸ھ / ۱۲۲۱ء) کے اشعار بھی نقل کرتے ہیں جن میں اصحابِ اربعہ کے اوصاف و مناقب بیان ہیں:

آں یکے را اُو رفیقِ غار بود — واٰں دِگر سر لشکرِ ابرار بود
واٰں دِگر سر لشکر ابرار بود — واٰں دِگر بابِ مدینہ علم بود

اس لیے ان اصحابِ اربعہ کی فضیلت مسلّم ہے اور جو مندرجہ بالا ترتیب شریعتِ مطہرہ کی رُو سے ہے، جس میں ظاہری احکام کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ اور اسی ترتیب سے زمانی طور پر ان اصحاب کی خلافت بھی قائم ہوتی۔ سورۃ الفتح کی آیت نمبر ۲۹ میں بھی اسی ترتیب کی طرف اشارہ موجود ہے۔ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا ۔

" وَالَّذِينَ مَعَهُ " میں معہ سے مراد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں، کیوں کہ ان کو غار میں آپ ﷺ سے رفاقت رہی۔ " أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ " سے مراد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں اور " رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ " سے مراد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں جن کے صبر او حلم کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ جب کہ " تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا " سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علم اور مجاہدہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو کہ درجہ کمال کا اہم ترین ذریعہ ہے۔

اگر غور کیا جائے تو پہلے تینوں خلفاء شریعت ظاہرہ کی صفات سے متصف نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے دوئی کا شعور ہوتا ہے۔ رفاقت، شدت اور رحم دوئی کا مفہوم اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہیں یعنی ایک دوسرے کا رفیق ہے۔ ایک دوسرے پر شدید ہے اور ایک دوسرے پر مہربان ہے۔ جب کہ علم اور مجاہدہ میں دوئی کا شعور نہیں پیدا ہوتا۔ بلکہ علم اور مجاہدہ دوئی کو ختم کرتا ہے۔ اسی وجہ

سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں علم کا شہر ہوں اور علی رضی اللہ عنہ اس کا دروازہ ہے۔ دروازہ شہر کا اہم ترین حصہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محاصرہ کے دوران اگر شہر کا دروازہ قبضہ میں آجائے تو شہر فتح ہو جاتا ہے۔ آں حضرت ﷺ علم کا شہر ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کا دروازہ ہیں۔ اس سے ان دونوں میں کمالِ اتحاد کا مفہوم واضح ہوتا ہے۔ کیوں کہ دروازہ شہر کا حصہ ہے اس سے باہر ہر گز نہیں اور یہ وہ امر ہے جو حضرت علیؓ کو ممتاز حیثیت پر فائز کرتا ہے۔

سید محمد زاہدؒ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روحانی افضلیت اس سے بھی ثابت کرتے ہیں کہ تمام صوفی سلاسل چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ آپ سے جاری ہوئے۔ نقشبندیہ اگرچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے جاری ہوا لیکن وہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے ہے۔ اس لحاظ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ میں علم باطنی یعنی توحید کمال درجہ پائی جاتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے اہلِ سنت وجماعت کے گروہ کو بدظن نہیں ہونا چاہئے۔ ایک شخص جس کے چار بیٹے ہوں۔ لیکن اگر اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کو کچھ اہم راز دیئے ہوں تو اس سے بڑے بیٹوں سے تعلق کی ہرگز نفی نہیں ہوتی، البتہ چھوٹے بیٹے کے بلند مرتبہ ہونے کی ضرور غمازی ہوتی ہے۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ (۵۶۱ھ / ۱۱۶۶ء) بھی اگرچہ کئی ایک صوفیہ کے بعد آئے لیکن اپنے روحانی مرتبہ میں بہت بلند تھے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ اگرچہ تمام انبیاء کے آخر میں آئے ہیں لیکن ذاتِ مقدس میں استغراق اور کمالِ محویت کے وجہ سے تمام انبیاء کرام سے ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام بھی صحابہ کرام میں اسی نوعیت کا ہے۔ سید محمد زاہدؒ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ اہلِ سنت وجماعت کا نقطۂ نظر کہ انبیاء کرام کے بعد حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کو بالترتیب افضلیت ہے۔ تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام منفرد ہے، اس لیے کہ وہ تمام سلاسلِ صوفیہ کے روحانی مرشد ہیں۔ اور اپنے مرشد کو تمام دیگر پیشواؤں سے بلند سمجھنا ضروری ہے۔ حضرت علیؓ علمِ ظاہری و باطنی دونوں میں کامل ترین شخصیت کے حامل تھے۔ اس بحث کے آخر میں وہ یہ امر واضح کرتے ہیں کہ میرا تعلق اہلِ سنت وجماعت سے ہے اور میرا وہی نقطۂ نظر ہے جو اہلِ سنت وجماعت کا ہے۔ [من بندہ بہ فضل خدا از زمرہ اہلِ سنت جماعت ام وغلام کہنہ صوفیانم۔ الفاظ کہ نوشتہ ام اَزْ راہِ انصاف وعدالت اَند، عین مذہب سنت وجماعت ہستند، پس دراین باب عمق نظر وانصاف باید۔]

۳۔ توکل اور اس کی اقسام

سید محمد زاہدؒ توکل کی دو اقسام بیان کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک توکل خاص ہے جب کہ دوسرا توکل عام ہے۔ توکل خاص تو یہ ہے کہ متوکل رزق کے حصول کے لیے تگ و دو نہیں کرتا بلکہ رزاقِ حقیقی کے لیے سعی کرتا ہے جب کہ دوسری قسم توکل عام ہے جس میں انسان اللہ تعالیٰ کو رزّاقِ حقیقی جانتے ہوئے رزق کے حصول کے لیے تگ و دو کرتا ہے۔ اس حوالے سے وہ شیخ سعدیؒ (۶۹۰ھ / ۱۲۹۱ء) کا قول نقل کرتے ہیں۔

رزق ہر چند بے گمان برسد [لیک] شرط عقل است جستن از درہا

تاہم اگر کوئی شخص رزق کے حصول کے لیے تگ و دو کرے لیکن مسببِ حقیقی کو فراموش کر دے تو یہ توکل کے بجائے حرص اور نفس کی پیروی کے دائرے میں آجاتا ہے۔ توکل کا اعلیٰ ترین درجہ یقیناً توکلِ خاص ہے جس کے حوالے سے مولانا رومؒ نے فرمایا:

رزقِ تو بر تو زِ تو عاشق تراست   [ہین]توکل کن، مالرزاں پا و دَست

اور مولانا جامیؒ نے لکھا ہے۔

ضامنِ رزق تو شدہ کِردگار   کارِ خدا را بہ خدارا سپار

اس حوالے سے قرآنِ مجید میں بھی واضح انداز میں ذکر موجود ہے وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ۔[77] یعنی جس نے اللہ پر توکل کیا وہ تو اسے کافی ہے۔ در حقیقت توکل کا مطلب یہ ہے اپنے کام کو دوسرے کے سپرد کر دینا۔ اس حوالے سے وہ احادیثِ نبویہ نقل کرتے ہیں، جن میں قناعت اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور لالچ سے منع کیا گیا ہے۔ "وہ جس نے قناعت کی بزرگ ہوا، اور جس نے لالچ کیا وہ ذلیل ہوا۔" یعنی ہر وہ شخص جس نے خدا تعالیٰ کی رضا چاہی وہ اللہ کا محبوب بنا اور بزرگی حاصل کی۔ کیوں کہ اس نے ارادۂ خداوندی میں مقدر رزق کو چاہا۔ اس سے زیادہ کا حصول نہیں کیا۔ جب کہ وہ آدمی جس نے مقدر رزق سے زیادہ چاہا اور اس کے لیے ہوائے نفس کے تحت تگ ودَو کی، تو وہ برباد ہوا۔ اور یہ امر عقلی لحاظ سے بھی درست نہیں۔ کیوں کہ عقل کا بھی یہی تقاضا ہے کہ خدا تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہا جائے۔

۴۔ اتباعِ شیخ:

سید محمد زاہدؒ وحدت الوجود کے ضمن میں اتباعِ شیخ کے تصور کی وضاحت کرتے ہیں۔ وہ اس حوالے سے مولانا رومؒ اور مولانا جامیؒ کے اشعار سے استدلال کرتے ہیں۔ وہ مولانا جامیؒ (۸۹۸ھ / ۱۴۹۲ء) کا شعر نقل کرتے ہیں:

رستن ازیں پردہ کہ بر جانِ تُست   بے مدد پیر ناممکن تُست

یعنی دوئی کے حجاب سے چھٹکارا شیخ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ حجاب یہ ہے کہ خَلق جس کا وجود حقیقی وجود نہیں ہے وہ نظر آتی ہے۔ اور ذاتِ مقدس جس کا وجود حقیقی ہے وہ نظروں سے اوجھل ہے۔ یعنی جو معدوم ہے وہ تمہیں نظر آرہا ہے اور جو موجود ہے وہ دکھائی نہیں دیتا۔ تاہم اگر پیرِ کامل کی معیت میسر ہو تو اس کی باطنی توجہ اور مجاہدہ سے امیدِ واثق ہے کہ مطلوب تک رسائی ہو جائے۔ در حقیقت پیر کی تین اقسام ہیں۔

پیرِ ارشاد   پیرِ بیعت   پیرِ صحبت

اگر کوئی مردِ خدا کسی کی رہنمائی پیرِ کامل کی طرف کرے تو وہ شخص پیرِ ارشاد کہلاتا ہے۔ اور وہ شخص جس کی بیعت کی جائے وہ پیرِ بیعت کہلاتا ہے اور اگر پیرِ بیعت کے کہنے پر کسی مردِ خدا کی صحبت اختیار کی جائے تو اسے پیرِ صحبت کہتے ہیں۔ تاہم اصل شیخ

---

[77] الطلاق، ۶۵: ۳

پیرِ بیعت ہے اور پیرِ ارشاد اور پیرِ صحبت سے جو فائدہ ملتا ہے وہ بھی پیرِ بیعت کے توسط سے حاصل ہوتا ہے۔ مولانا جامیؒ نے اس نکتہ کی وضاحت کی ہے:

پیر کہ باشد شہ کون و مکاں   خواجہ داد و سرّ کُن فکاں

یعنی پیر در حقیقت دو جہاں کا بادشاہ ہوتا ہے اور سر کن فکان سے آشنا ہوتا ہے۔ یعنی ولی اللہ در حقیقت مقامِ محویت میں ہوتا ہے جہاں اس میں صفاتِ الٰہیہ کا ظہور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ جس اَمر کا ارادہ کرتا ہے وہ پورا ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ مظہر ذاتِ الٰہیہ بن چکا ہوتا ہے۔ اور مرید کو یہ بات سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ مظہر کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس حجاب کو اتارنے کے لیے مردِ توانا کی ضرورت ہے اور وہ شخص جو کمزور ہے یا کنویں میں گرا ہوا ہے، وہ دوسرے کو اِس سے کیسے نکال سکتا ہے۔ پیر کا مقصد مرید کو ظاہری و باطنی گمراہی سے باہر نکالنا ہے، نہ کہ خود ان کے ساتھ مل کر گمراہی کے کنویں میں جاگرے۔

سید محمد زاہدؒ کم علم پیروں پر نقد بھی کرتے ہیں کہ بسا اوقات ایسے پیروں سے واسطہ پڑتا ہے جن کے نہ اخلاق درست ہیں اور نہ ہی سلسلۂ بیعت۔ لیکن کئی ایک صاحبِ مروّت اور اہلِ مرتبہ ان کے مرید ہیں۔ میں اس بات پر حیران ہوں۔ سید محمد زاہدؒ لکھتے ہیں کہ میرے ایک عزیز نے مجھے بتایا کہ اگر پیر میں لیاقت نہ بھی ہو تو اہلِ سلسلہ اس کی روحانی امداد کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ پیر کی صورت میں پیدا کرتا ہے جو اس کے مریدوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس طرح کے امور بہت نادر ہیں جن کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان امور سے پروردگار محفوظ فرمائے۔

۵۔ وسیلہ کی صوفیانہ تعبیر

سید محمد زاہدؒ، شیخ سعدیؒ کے اشعار کی صوفی تناظر میں تعبیرات کرتے ہیں۔ شیخ سعدیؒ کی رُباعی ہے:

در میر و وزیر و سلطان را
بے وسیلت مگرد پیرامن
سگ و دربان چو یافتند غریب
این گریبانش گیرد، آن دامن

یعنی امیر و وزیر اور سلطان کے دربار میں بغیر وسیلہ کے جانے سے امکان یہی ہے کہ کتا اور دربان رُکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔ دربان گریباں جب کہ کتا دامن پکڑ لیتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ کسی وسیلہ کے ساتھ ان صاحبانِ مرتبہ تک پہنچا جائے۔ سید محمد زاہدؒ اس کی شعر کی رُوحانی تعبیر کرتے ہیں کہ سلطان سے مراد ذاتِ مقدس، وزیر سے مراد رسولِ اکرم ﷺ اور میر سے مراد حضرت علیؓ ہیں، کیوں کہ وہ تمام سلاسلِ صوفیہ کے روحانی مرشد ہیں۔ جب کہ سگ اور دربان سے مراد شیطان اور نفس ہو سکتا ہے۔ درگاہِ الٰہی تک انسان اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ مخالفتِ نفس و شیطان نہ کرے۔ اور یہ عمل وسیلہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی لیے

قرآنِ مجید میں بھی ہے کہ اے ایمان والو! اس تک رسائی کا وسیلہ تلاش کرو۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو ظاہری ایمان لایا، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ شریعتِ مصطفیٰ ﷺ پر عمل پیرا ہو، تاکہ اس کا باطن بھی ایمان سے منور ہو جائے۔ اس کے لیے وہ حضرت علیؓ کی طریقت اختیار کرے تو یہ وسیلہ اس کو بارگاہِ الٰہی تک پہنچا سکتا ہے۔ وسیلہ سے مراد وہ طاقت و توفیق ہے جس کے ذریعے انسان ذاتِ اقدس تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ کوئی خدا شناس نہ ملے۔ اور وہ ایسا پیرِ کامل ہوتا ہے کہ جس نے اپنی ذات کو پہچانا اور معرفتِ الٰہی میں خود کو محو کر دیا۔ اور جو اس مقام پر نہیں وہ بھلا دوسرے کی کیا راہنمائی کر سکتا ہے۔

اس لیے سالک کو یہ بات ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ حکم در حقیقت ایک ہے جب کہ اس کے اعتبارات مختلف ہیں۔ اس نکتہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ حقیقت کا ظہور جس مرتبہ میں ہے اس کا اعتبار کرنا چاہیے اور اسی کے مطابق حکم عائد کیا جائے گا۔ کیوں کہ حفظِ مراتب ایک اَمر ضروری ہے ورنہ شریعت کا ترک لازم آتا ہے اور سالک زندیقیت میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

ہر مرتبہ اَز وجودِ حکمِ دارد　　　گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی

اس لیے اگر ذاتِ مطلق کو دیکھا جائے تو ایک امیر کو بادشاہ کہنا درست ہے لیکن اگر اعتبارات اور درجات کا خیال رکھا جائے تو امیر کو بادشاہ کہنا درست نہیں۔ چنانچہ اگر ذاتِ مقدس کو اس انداز سے دیکھا جائے کہ اس کا وجودِ حقیقی خارجی ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے تو اس صورت میں انسان کو حق کہنا درست ہے۔ لیکن اگر تعینات کا اعتبار کیا جائے جن کا وجود وہمی ہے تو انسان کو حق کہنا کفر ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ بادشاہ، وزیر اور امیر در حقیقت ایک ہیں، تاہم اعتبارات کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ نفس اور شیطان بھی تعیناتِ وہمیہ میں سے ہیں۔ اس لیے جب تعینات کا اعتبار نہ کیا جائے تو طالب و مطلوب اور وسیلہ و مانع کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اس وقت صرف ذاتِ حقیقی باقی رہتی ہے جس کا وجودِ حقیقی خارجی ہے۔

اس تناظر میں مذکورہ بالا آیات کا مفہوم غالباً یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو ظاہری و باطنی ایمان کے حصول کا ارادہ رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ ظاہری و باطنی وسیلہ تلاش کرے۔ ایمانِ ظاہری سے مراد انسان کا اچھے اخلاق سے آراستہ ہونا اور امورِ شرعیہ کی بجا آوری ہے۔ اس امر کے لیے معلّم کی ضرورت ہے جس سے کتبِ تفسیر و احادیث اور فقہ کا علم سیکھا جائے۔ اور ایمانِ باطنی سے مراد یہ ہے کہ اپنے باطن کو دوئی کے وہم سے آزاد کیا جائے اور ذاتِ مقدس میں فنا کو طلب کیا جائے اور یہ شیخ کامل کی بیعت کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جس کا کوئی شیخ نہیں، شیطان اس کا شیخ ہے۔ اس لیے جس شخص نے شیخ کی بیعت نہ کی وہ کیسے حقیقت کو پا سکتا ہے

کیوں کہ اس کا رہبر شیطان بن جائے گا جو کہ تعین وہمی ہے۔ گویا کہ اس نے ایک اور وجودِ حقیقی کا اعتراف کر لیا جو کہ شرک کا موجب ہے۔[۷۸]

سید محمد زاہدؒ بیعت کے حوالے سے حافظ جمالؒ کا نقطۂ نظر بیان کرتے ہیں کہ بیعت صرف اس شیخ کی ہو گی جو زندہ ہے۔ اہلِ قبور سے بیعت نہیں کی جائے گی۔ اگر ایسا ہوتا تو سب قبر نبی ﷺ کی بیعت کرتے۔ اور خلافت و نیابت جو رسول اللہ ﷺ سے صحابہ کرام اور ان سے اولیائے کرام تک پہنچی وہ جاری نہ ہوتی۔ وہ ایک اور مسئلہ کی نشاندہی بھی کرتے ہیں کہ اگر کسی نے نااہل شیخ کی بیعت کی تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ دوبارہ شیخ کامل کی بیعت کرے۔ اس لیے کہ اس کی پہلی بیعت درست نہیں۔ سید محمد زاہدؒ کے ہاں وسیلہ سے مراد بیعت کرنا ہے اور اس حوالے سے وہ قرآنِ مجید کی آیات: اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ ۔[۷۹] سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے رسول اکرم ﷺ کو وسیلہ بنایا اور ان سے بیعت کی۔ اگر بیعت کرنا ضروری نہ ہوتا تو وہ بیعت کیوں کرتے۔

پیرِ کامل اپنے مرید کو حقیقت آشنا کرتا ہے۔ اس لیے اس کا مرتبہ اپنے مرید سے بلند ہوتا ہے۔ خواہ پیر سے غلطی بھی کیوں نہ سرزد ہو جائے جیسا کہ شیخ صنعانؒ اور ان کے مرید شیخ فرید الدین عطارؒ کا معاملہ ہے۔ یہ مشہور ہے کہ شیخ صنعانؒ ایک دفعہ پانچ سو مریدوں کے ساتھ حج کے ارادہ سے روانہ ہوئے اور دِل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ کس قدر وسیع حلقۂ ارادت رکھتے ہیں کہ پانچ سو مریدین حج کے لیے ان کے ساتھ چل رہے ہیں۔ ان کا یہ خیال اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آیا۔ ایک ماہ سفر میں رہے۔ یہاں تک کہ وہ ترکستان کے علاقہ سے گزر رہے تھے کہ ان کے نگاہ ایک خوبصورت پارسی نوجوان پر پڑی اور وہ اس پر دِل و جاں سے فدا ہو گئے۔ حج کا ارادہ ترک کر دیا اور اسی کا مذہب اختیار کر لیا۔ مریدوں نے شیخ کی یہ حالت دیکھی تو بعض واپس لوٹ گئے اور بعض حج کے لیے روانہ ہو گئے۔
شیخ فرید الدین عطارؒ (قریباً: ۶۱۸ھ/ ۱۲۲۱ء) کو جب آپ کے معاملہ کے خبر ہوئی تو اس وقت آپ مکہ مکرمہ میں تھے۔ آپ نے حج کا ارادہ ترک کر دیا اور فوراً اپنے شیخ کے پاس پہنچ گئے۔ اور اپنے شیخ کا مذہب اختیار کر لیا۔ اس صورتِ حال میں شیخ صنعانؒ نے ان سے کہا: میں تو عشق کی بلائے ناگہانی میں گرفتار ہوا، تم نے کیوں اسلام کو فراموش کر دیا؟ شیخ فرید الدین عطارؒ نے کہا: میں نے بھی در حقیقت اپنے معشوق کا مذہب اختیار کیا ہے۔ میرا معاملہ کفر و اسلام اور جنت دوزخ سے نہیں بلکہ اپنے شیخ کی ذات سے

---

[۷۸] جس کا کوئی استاد یا شیخ نہیں، شیطان اس کا امام یا شیخ ہے۔ یہ جملہ کئی ایک کتب صوفیہ میں منقول ہے: ملاحظہ ہو: امام ابو القاسم القشیریؒ: الرسالۃ القشیریہ، (قاہرہ: دار المعارف، س ن)، ۲/ ۵۷۴؛ امام محمد الغزالیؒ: احیاء علوم الدین، (بیروت: دار المعرفۃ، س ن)، ۳/ ۷۵۔

[۷۹] الفتح، ۴۸: ۱۰

ہے۔ جب شیخ نے یہ بات سنی تو سوچ میں پڑ گئے۔ اس وقت عالم غیب سے ان کے دل میں یہ القاء ہوا کہ تمہارا یہ خیال کہ تمہارے پانچ سو مرید ہیں، درست نہیں۔ تمہارا صرف ایک ہی مرید ہے۔ اس طرح وہ اس ابتلاء سے باہر آئے۔[80]

٦۔ اقوالِ صوفیہ کی وضاحت:

الف۔ طالب المولیٰ مذکر و طالب العقبیٰ مؤنث و طالب الدنیا مخنث۔

صوفیہ کے ہاں یہ قول بہت مشہور ہے۔ سید محمد زاہدؒ اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ ذاتِ حق کا طالب در حقیقت مرد ہے کیوں کہ وہ دوئی کے حجاب کو ختم کر دیتا ہے۔ اس لیے جس سالک نے خدا کو پالیا تو گویا اس نے سب کچھ حاصل کر لیا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جس کا وہ مولیٰ ہے، اس کا سب کچھ ہے۔ اسی وجہ سے شیخ سعدیؒ نے فرمایا:

تو ہم گردن اَز حکم داور مپیچ   کہ گردن نہ پیچد زِ حکم تو ہیچ

یعنی تو حکمِ الٰہی کے سامنے سر تسلیم خَم کر دے اور اگر تو نے اس سے رُو گردانی کی تو پھر تیری کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اور یہ کہ آخرت کا طالب مؤنث ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے اصل ایمان اللہ تعالیٰ کی ذات کو تسلیم کرنا ہے اور جو اس کے علاوہ ہے اس کا وجود نہیں۔ اس لیے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کو چھوڑ کر آخرت کو طلب کرنا کمزوری کی نشانی ہے۔ جب کہ اس دنیا کے طلب گار مخنث ہیں کیوں کہ دُنیا جس کی کوئی حقیقت نہیں اس کا طلب کرنا در حقیقت خدا تعالیٰ سے غافل ہونے کے مترادف ہے جیسا کہ شیخ عطارؒ نے فرمایا:

چیست دُنیا اَزْ خدا غافل بُدن   نَے قماش و نقرہ و فرزند و زَن

دُنیا سونا، چاندی، عورت اور بچوں کی محبت نہیں بلکہ خدا سے غافل ہونے کو کہتے ہیں۔ پس ہر وہ شے جو اللہ کے وصال سے مانع ہے، اسے دنیا کہتے ہیں۔ پس ایسا عالم جو بے عمل ہے اور صفاتِ جمیلہ سے عاری ہے تو وہ در حقیقت دُنیا دار ہے۔ جب کہ وہ شخص جس کے پاس تمام دنیاوی اسباب اور جاہ و مرتبہ ہو لیکن اس کا دِل حق تعالیٰ سے وابستہ ہے تو وہ اہل اللہ میں سے ہے اور وہ دین دار ہے۔ اس حوالے سے انبیا عظام اور صحابہ کرام کی بہت حکایات ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ ان کے پاس

---

[80] شیخ فرید الدین عطارؒ کی منطق الطیر میں سب سے لمبی کہانی شیخ صنعان کے فرضی کردار کی ہے۔ جس میں شیخ صنعانؒ خانہ کعبہ میں پچاس سال تک اپنے مریدوں کے ساتھ رہتے ہیں اور پھر وہ ان کے ساتھ مل کر روم کا سفر کرتے ہیں جہاں وہ ایک خوبصورت مسیحی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اپنا مذہب چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے مرید بھی ان کو چھوڑ دیتے ہیں۔ سوائے ایک مرید کے جو بالآخر ان کو راہ راست پر لانے کا موجب بنتا ہے۔ فرید الدین عطارؒ، کتاب منطق الطیر، شارح: آغا محمد اشرف دہلوی، تحقیق و تہذیب: سعدیہ غفور، (لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۱۸ء) ص، ۸۱۔۹۶

بھیڑوں کا ایک ہزار غلہ تھا اور ہر ایک غلہ میں ہزار بھیڑیں تھیں۔ ایک مرتبہ حضرت جبرائیلؑ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ پیغمبر کو اس قدر مال عطا کرنے کی کیا حکمت ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ تمام مال میرا ہے اور اس کا ذرہ برابر بھی اس سے تعلق نہیں۔ تم دو فرشتے سائل کی صورت میں اس کے پاس بھیجو۔ چنانچہ دو فرشتے ان کے پاس گئے اور ہر ایک نے اللہ کے نام پر ان سے آدھا آدھا مال متاع مانگا۔ آپ نے دونوں کو تمام ملکیت آدھی آدھی تقسیم کر کے دے دی اور کہا: میں تو اس کا مالک نہیں، میں تو صرف اس کو استعمال کرنے والا ہوں۔ تب فرشتوں نے انھیں بتایا کہ وہ تو صرف آزمائش کے لیے آئے ہیں۔

ب۔ اقرار باللسان و تصدیق بالقلب کی صوفی تعبیر

سید محمد زاہدؒ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی واحدنیت کا اقرار زبان سے کیا جائے اور دِل سے اس کی تصدیق کی جائے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی واحدانیت کے اقرار کی تصدیق ایسے ہونی چاہیے جیسے صدیقین کرتے ہیں۔ وہ دوئی کے حجاب کو ختم کر کے مشاہدۂ حق کرتے ہیں۔ اس لیے اگر ان دو اَرکان پر ایمان نہیں تو پھر کوئی شخص مومن کہلانے کا مستحق نہیں۔ جیسا کہ مرزا محمد علی صائب تبریزی (۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء) نے کہا:

رجا و خوف را در ہیچ حال از کف مدہ صائبؔ   کہ چون یک بال گرد و مرغ از پرواز می ماند

حدیثِ نبوی ﷺ ہے کہ ایمان، خوف اور اُمید کے درمیان ہے۔ صائب نے اسی مفہوم کو اس شعر میں بیان کیا ہے کہ انسان کو کسی حال میں بھی اُمید اور خوف کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ کیوں کہ یہ پرندے کے دو پروں کی مانند ہیں۔ جس طرح پرندہ ایک پَر سے نہیں اڑ سکتا۔ انسان بھی خوف اور امید دونوں میں سے کسی ایک کیفیت میں رہ کر ایمان کی تکمیل نہیں کر سکتا۔ سید محمد زاہدؒ کہتے ہیں کہ ایمان کے دو رُکن ہیں: خوف اور امید۔ خوف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ سب سے پرہیز کی جائے اور امید یہ ہے کہ اس میں مستغرق ہو جائے، جس پر ایمان ہے اور مقام احسان کو حاصل کر لے۔ (مقام احسان سے مراد وہ مقام ہے جس کا حدیث میں ذکر کیا گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی ایسے عبادت کرو جیسے کہ تم اُسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔)[81]

ج۔ اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ کی تفسیر۔

سید محمد زاہدؒ اس آیت کی تفسیر وجودی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کمال موحد تھے۔[82] جس کی غمازی قرآنِ مجید کی مندرجہ بالا آیت سے ہوتی ہے جس میں آپ اعلان کرتے ہیں کہ میں متوجہ ہوا یعنی مجھے اس کی واحدنیت پر یقین ہو گیا کہ

---

[81] البخاری، محمد بن اِسماعیلؒ، الجامع، کتاب الایمان، باب سوال جبرائیل النبی ﷺ عن الایمان، حدیث رقم: ۵۰؛ مسلم بن الحجاجؒ، الصحیح، کتاب الایمان، باب الایمان و الاسلام والاحسان، حدیث رقم: ۹۳

[82] الانعام ۶: ۷۹

اس کے علاوہ کوئی اور وجود حقیقی نہیں اور اس کے علاوہ جو بھی وجود ہے وہ وہمی، امکانی اور حادث ہے۔ اور یہ جو ظہور ہے یہ اس کائنات میں آسمانوں اور زمین کی صورت میں ہے، ان تمام سے میں کنارہ کش (حنیف) ہو گیا۔ اور مکمل توجہ ذاتِ حقیقی کی طرف کرلی اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں کہ ذاتِ حق کے علاوہ کسی کا وجودِ حقیقی تسلیم کروں اور اللہ تعالیٰ کے وجود میں شریک ٹھہراؤں، کیوں کہ یہی کفر ہے۔ کفار جو بتوں، سورج، چاند، ستاروں اور آگ کو اپنا معبود قرار دیتے ہیں وہ اس معنوں میں ہے کہ وہ اُن کا وجودِ حقیقی اور خارجی مقرر کرتے ہیں۔ گویا وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے علاوہ مظاہر کے وجود کا بھی اقرار کرتے ہیں جو کہ شرک کا باعث ہے جس کی وجہ سے انھیں مشرک قرار دیا گیا۔ لیکن اگر وہ ان کو حق کے مظاہر تسلیم کریں اور اللہ تعالیٰ کی پرستش کریں تو وہ کافر نہیں کہلاتے۔ مثنوی میں مولانا رومؒ نے اِس کی مناسبت سے کیا خوب بات کی کہ اگر کعبہ میں دِل غیر کی طرف ہو تو طاعت، فسق اور کعبہ، بُت خانہ ہے اور اگر دِل حق کے ساتھ وابستہ ہے تو مے کدہ کے مکین کو خوش ہونا چاہیے کہ اس کا انجام بخیر ہو گا:

در کعبہ اگر دِل بہ سوئے غیر است تُرا　　　طاعت ہم فِسق ، کعبہ دیر است تُرا
ور دِل بحق است و ساکنِ میکدہ　　　خوش باش کہ عاقبت بخیر است تُرا

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے متعدد اسماء وصفات ہیں جن کا مظاہر میں ظہور ہوتا ہے۔ ایک میں ایک صفت جلوہ گر ہوتی ہے جب کہ دوسرے میں دوسری، اس لحاظ سے اس کی ایک صفت کا ظہور اس کو عاشق جب کہ دوسری صفت کے ظہور سے وہ معشوق بن جاتا ہے۔ اس لیے اگر عاشق اپنے معشوق کو حق کہے تو جائز ہے۔ کیوں کہ غیر حق کا وجود نہیں ہے۔ بلکہ موجود ذاتِ مقدس ہے کہ جس کے اسم اور صفت کا ظہور مرتبہ تفصیل میں اعیانِ ثابتہ میں ہوتا ہے لیکن تعینات میں حق کو ملاحظہ کرنا، دیکھنے والے کی استعداد پر ہے کہ وہ حق کو دیکھے اور تعین کو وجودِ وہمی سمجھے۔ اس مقام پر تعینات کا وجود اور عدم برابر ہوتا ہے۔ اس مقام پر اگر کوئی سالک اپنے شیخ کو حق کہے تو یہ جائز ہے کہ یہ عاشق ہے اور اس کا شیخ معشوق ہے۔ یعنی ایک مظہر میں عاشق اور دوسرے مظہر میں معشوق ہے۔ اور عاشق کا استغراق اور مشاہدہ بہت باریک ہوتا ہے۔ سید محمد زاہدؒ، شیخ عطارؒ کے اشعار سے اس مفہوم کو واضح کرتے ہیں کہ جب مجنوں نے اپنی ہستی کو برباد کر دیا تو اس کا دِل غموں کی قید سے آزاد ہو گیا۔

چوں مجنوں نقدِ ہستی داد برباد　　　دِلش از قیدِ غم ہا گشتہ آزاد

اس لیے یہ بات طے شدہ ہے کہ ذات کا مشاہدہ مظہر کے بغیر محال ہے۔ ذاتِ مقدس مظہر میں اپنے عاشق کو دیدار کراتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ مظہر اس کا معشوق بن جاتا ہے۔ اس طرح عاشق اور معشوق کے درمیان بظاہر رابطہ پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقتاً اگرچہ ذات واحد ہے تاہم اس کے اسماء وصفات کا ظہور کثرت میں ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے بارے میں یہ سوال کیا جاتا ہے کہ جب ان کو آگ میں ڈالا گیا تو آگ سرد کیسے ہو گئی؟ سید زاہد کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام عاشقِ موحد تھے اور یہ کہا جاتا ہے کہ عشق ایسی آگ ہے جو محبوب کے علاوہ سب کو جلا

دیتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام عشقِ حقیقی سے متصف تھے۔ جب کہ آگ مظہر مجازی تھی۔ اس لیے جب آپ کو آگ میں ڈالا گیا تو مظہر مجازی جل کر راکھ ہو گیا یعنی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔

۷۔ صوفیانہ افکار کی وجودی تعبیر

الف۔ اتباعِ شیخ

سید زاہدؒ تصوف کے متنوع مضامین اتباعِ شیخ، شریعت و طریقت، حقیقت و مجاز پر بحث کرتے ہیں لیکن ان تمام کی تعبیر نظریہ وحدت الوجود کے زیر اثر کرتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ حافظؒ، سعدیؒ، عطارؒ، جامیؒ، مولانا رومؒ اور دیگر فارسی شعرا کے کلام سے استشہاد کرتے ہیں۔ مثلاً وہ حافظؒ کا مندرجہ ذیل شعر ذکر کرتے ہیں:

بہ می سجادہ رنگین کُن گرت پیرِ مغان گوید کہ سالک بے خبر نبود زِ راہ و رسمِ منزل ہا

اس سے مراد یہ ہے کہ شیخ کے کہنے پر شرابِ عشق سے شریعت کو رنگین کرو۔ شریعت کا علم مطالعۂ کتب اور ان پر عمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے جب کہ طریقت کی معرفت کسی رہبر و مرشد کے بغیر ممکن نہیں۔ شریعت میں سالک خود کو مخصوص شرعی اُمور سے آراستہ کرتا ہے۔ حقیقت و طریقت اور معرفت کا تعلق تصفیۂ باطن سے ہے جس میں علائقِ دنیہ سے قطع تعلق کیا جاتا ہے اور حق کے ساتھ خود کو وابستہ کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ شعور بیدار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وجود صرف حق کا ہے اور حق کے علاوہ جو ہے وہ معدوم ہے۔ اور یہ مرحلہ شیخِ کامل کی پیروی کے بغیر مشکل ہی نہیں بلکہ محال نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ حق بحرِ عمیق ہے اور بغیر رہبر و آشنا کے منزل تک پہنچنا آسان نہیں۔

سید محمد زاہدؒ، حافظ کا شعر بیان کرتے ہیں:

دوش از مسجد سوئے ے خانہ آمد پیر ما چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما

مراد یہ ہے کہ شریعت جو دوئی کا شعور دیتی ہے۔ اس دوئی سے نکل کر شیخ ے خانۂ توحید میں آگیا۔ یعنی شریعت پر مسلسل عمل پیرا ہونے اور مجاہدات کے باعث شیخ اس قابل ہو گیا کہ تعین وہمی سے باہر آگیا، جو دوئی کا شعور دلاتا ہے۔ چنانچہ وہ حقیقت آشنا ہوا اور اپنی ذات کو فنا کر سکا جس کے باعث اسے بقا حاصل ہوئی۔ النظر والفنا ھو رفع التعین الوھمی فاذا رفع حصل البقاء۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ یقین رکھنا کہ وہ اپنے وجودِ حقیقی خارجی کے ساتھ موجود ہے۔ اس

کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ ایک شے کا وجود تھا اور بعد ازاں وہ فنا ہو گیا جس کی وجہ سے وجودِ حقیقی باقی رہ گیا۔ اس حوالے سے حضرت جامیؒ کا کیا خوب مصرعہ ہے:

به خدا غیر خدا در دو جہاں چیزے نیست

قسم بہ خدا کہ خدا کے علاوہ دونوں جہانوں میں کوئی چیز اپنا وجود نہیں رکھتی۔ شیخ زاہدؒ لکھتے ہیں کہ اس مقام پر "أنا الحق" کہنا جائز ہے۔ اس لیے اس مقام پر تعین وہمی کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ جس کی وجہ ایسے کلمات پر کفر اور گمراہی کا حکم لگایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے عطار نے شیخ حسین بن منصورؒ (۳۰۹ھ / ۹۲۲ء) کی زبان سے کہا کہ میں منصور نہیں ہوں اور تو مجھے منصور کے طور پر نہ دیکھ۔ ایسا مت جانو کہ میں راہِ توحید سے دور ہو گیا ہوں۔

من نہ منصورم ، تو منصورم مابیں   از رہِ توحید تو دورم مابیں

یعنی میں نے تو خود کو توحید پر قائم کیا ہے اور منصور ہونے کے تعین وہمی سے باہر آ گیا ہوں۔ سید محمد زاہدؒ اس کی وضاحت ایک اور شعر سے کرتے ہیں:

من خدایم من خدایم من خدا   فارغ ام از کبر و کینہ ازہوا

یعنی تعین وہمی سے باہر آ گیا ہوں اور میرے اندر کوئی تکبر، بغض وعداوت اور ہوس باقی نہیں۔ میں اپنے وجود سے بیزار ہو کر خدائے واحد کا اثبات کر رہا ہوں۔ سید محمد زاہدؒ مشہور صوفی شاعر احمد جامؒ کے متنازع شعر نقل کر کے اس کی وضاحت کرتے ہیں۔

پیرِ ما در کوچۂ دلدار شد   از خدا و مصطفیٰ بے زار شد

لفظی معنی تو اس کا یہ ہے کہ ہمارا پیر اپنے محبوب کے کوچہ میں پہنچ گیا اور وہ خدا اور پیغمبر خدا سے بیزار ہو گیا۔ اس شعر سے جو لفظی معانی سمجھ آ رہے ہیں، وہ درست نہیں۔ در حقیقت اس سے مراد یہ ہے کہ جب پیر نے تعین سے چھٹکارا پا لیا اور دوئی کے پھندے سے خود کو آزاد کر لیا۔ تو اس وقت یہ دوئی کے تصورات کہ یہ خدا ہے اور یہ رسول ہے، درمیان سے نکل گئے۔ بس حق باقی رہ گیا۔ جیسا کہ قرآنِ مجید میں ہے کہ اگر زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور الٰہ ہوتا تو یہ تباہ وبرباد ہو جاتے: لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔[۸۳] اس لیے وجودِ حقیقی صرف اور صرف خدائے واحد کی ذات ہے جب کہ کثراتِ کُلیہ جو زمین و آسمان میں ہیں ان کا وجود وہمی ہے۔ لہٰذا اس تناظر میں مذکورہ بالا شعر کی تفہیم کرنے کی ضرورت ہے۔

ب۔ عشقِ مجازی حقیقت تک رسائی کے لیے کارساز ہے

سید محمد زاہدؒ حضرت جامیؒ کے مندرجہ ذیل شعر سے استدلال کرتے ہیں کہ مجاز حقیقت تک پہنچنے کا زینہ ہو سکتا ہے:

---

[۸۳]۔ الانبیاء ۲۱: ۲۲

متاب از عشق رو گرچہ مجازیست　　　　که آں بہرِ حقیقت کارسازیست

عشق کا حقیقی معنی تو یہی ہے کہ ذاتِ حق سے محبت کی جائے جب کہ مال و دولت اور اولاد و زَن سے محبت عشقِ مجازی ہے۔ کیوں کہ ان کا وجود حقیقی نہیں بلکہ وہمی ہے۔ اس لیے عاشقِ ذات ہونا چاہیے۔ تاہم مجاز، حقیقت تک رسائی کے لیے کارساز ہوتا ہے۔ یعنی حقیقت تو ذاتِ مقدس ہے جو لباسِ مجاز میں ظہور پذیر ہوتی ہے جب کہ مجاز کا وجود حقیقت کا محتاج ہے۔ اس لحاظ سے مجاز، حقیقت کے ظہور کے لیے کارساز ہے۔ اسی طرح حضرت جامی کا دوسرا شعر ہے۔

کَسے کو عاشقِ خوبان دِل جواست　　　　اگر داند وگرنہ عاشقِ اوست

یعنی اگر کوئی اپنی دانست میں یہ جانے کہ وہ کسی نازنین کا عاشق ہے تو یہ عشقِ مجازی ہے۔ اور اگر وہ یہ جانے کہ وہ ذاتِ مقدس کا عاشق ہے تو وہ عاشقِ حقیقی ہے۔ پس یہ حقیقت و مجاز عاشق کے علم کے اعتبار سے ہے ورنہ حقیقت، حقیقت ہے جب کہ مجاز وہم ہے۔ اور وہم کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس کا وجود اور عدم برابر ہیں۔ اسی وجہ سے مولانا روم نے کہا کہ ہر وہ شخص جو رنگ کا عاشق ہے۔ یہ عشق نہیں بلکہ عاقبت کی خرابی ہے۔

ہر کَسے کو عاشقِ رَنگے بود　　　　عشق نہ بُود عاقبت ننگے بود

مراد یہ کہ جو عاشقِ مجاز ہے۔ وہ تعین وہمی میں پڑا ہوا ہے۔ اس کا عشق نہیں بلکہ ننگ و عار ہے۔ لیکن اگر اس کا مجاز اس کو حقیقت تک لے جاتا ہے تو وہ حقیقت آشنا ہو جائے گا۔ خود کو فنا کرنے سے فیوضاتِ ربانی حاصل ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے سید محمد زاہدؒ، شیخ سعدیؒ کا شعر نقل کرتے ہیں کہ دریا میں بے شمار منافع ہیں لیکن اگر کوئی اپنی سلامتی چاہتا ہے تو کنارے پر رہے۔

بہ دریا در منافع بے شمار است　　　　اگر خواہی سلامت بَر کنار است

یعنی بحرِ وحدت میں بے شمار فیوضات و تجلیات ہیں لیکن ان تک رسائی اپنی ذات کو فنا کیے بغیر ممکن نہیں۔ اور وہ جو اپنی ذات کو مٹا دیتا ہے وہ ان فیوضات سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر اپنی ذات کو فنا نہ کیا جائے تو پھر بحرِ حقیقت کے کنارے پر ہی کھڑا رہنا پڑے گا جس کی وجہ سے معارف کا حصول نہیں ہو پائے گا۔ "اشھدان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ" کا مطلب یہ کہ میں مشاہدہ کرتا ہوں کہ ذاتِ مقدس کے علاوہ کوئی موجود نہیں۔ ذاتِ حق صرف موجود ہے اور کوئی بھی وجود میں اس کا شریک نہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ذاتِ مقدس کے علاوہ کوئی وجودِ حقیقی خارجی نہیں ہے۔ اور اگر ذاتِ مقدس کے علاوہ کسی کا وجود مقرر کیا جائے تاکہ مذہب "ہمہ از اوست" کی تائید ہو سکے۔ تو در حقیقت یہ عین کفر ہے، جب کہ وحدت الوجود کے قائلین کی

طرف کفر منسوب کرنا درست نہیں کیوں کہ بینا اور نابینا کو ایک جیسا نظر نہیں آتا۔ دونوں کے احول مختلف ہوتے ہیں۔ اور ہر مرتبہ پر اس کے مطابق حکم عائد کیا جاتا ہے۔ اور جو حفظِ مراتب کا خیال نہیں کرتا وہ زندیق کرتا ہے:

ہر مرتبہ از وجودِ حکمے دارد گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی

اس کا مطلب یہ ہے کہ ذاتِ مقدس کے بارے میں علیحدہ حکم ہے۔ حافظ شیرازیؒ نے کیا خوب کہا ہے:

اندیشہ خود رائی در عالم رندی نیست کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رای

یعنی مرتبہ اطلاق میں صرف اللہ ہے اور اس کے علاوہ وجود کا تصور نہیں۔ جب کہ مرتبہ تقید میں وہ تعین وہمی میں قید ہے۔ پس وہ "عبد" ہے اور یہ بات اس کے "علم" میں ہے کہ وہ تعین وہمی میں قید ہے۔ اگر حق تعالیٰ محض اپنے فضل سے اس کے ذہن سے یہ "علم" اُٹھالے تو اسے ذاتِ مُطلق کے علاہ کچھ نظر نہ آئے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ صوفی کا کوئی مذہب نہیں [**الصوفی لامذھب لہ**]۔ کیوں کہ اس کی نظر حقیقت محض پر ہوتی ہے جب کہ مذہب کا تعلق ظاہر سے ہے جو کہ حقیقتِ متعینہ ہے۔ اسی ضمن میں مندرجہ بالا شعر ہے کہ عالمِ رِندی میں خود بینی جائز نہیں بلکہ کفر ہے۔

کیوں کہ عالمِ رندی عالمِ اطلاق ہے جس میں مذہب کو ملاحظہ نہیں کیا جاتا۔ جب کہ مرتبہ تعینِ وہمی میں دین اور مذہب کا خیال رکھا جاتا ہے۔ کیوں کہ مذہب اور دین کا تعلق تعینِ وہمی سے ہے۔ اس لحاظ سے کہ مرتبۂ اطلاق میں تمام ملاحظات اُٹھ جاتے ہیں۔ اس لیے اس مقام پر شیخ منصور حلاج کو قتل کرنا جائز نہیں کیوں کہ وہ مرتبۂ اطلاق کو پہنچ گیا تھا۔ تاہم اہل اللہ کے ہاں خود بینوں کے لیے انھیں قتل کرنا جائز تھا کیوں کہ وہ شخص جو مرتبہ تقلیدِ وہمی کے اندر ہے۔ اس کے لیے "اَنا الحق" کہنا جائز نہیں۔ اس لیے کہ "اَنا الحق" اللہ تعالیٰ کہہ سکتا ہے جب کہ یہ بندہ ہے۔ اس لیے جب کوئی بندہ اپنے آقا/بادشاہ کے مقام کو اپنے ہاتھ میں لے تو یہ کفر ہے اور اس کا مرتکب قتل کا مستحق ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص تعیناتِ وہمی سے چھٹکارا حاصل کر لے اور بندگی کے مقام سے بادشاہی کے مقام پر فائز ہو جائے تو اس وقت اس کو بادشاہ کہنا درست ہے۔ "منطق الطیر" میں سیمرغ کا قصہ اس حوالے سے بہت مناسب ہے۔ جس کے مطابق تمام پرندے ہُدہُد کے گرد جمع ہوئے اور اس سے سیمرغ (حقِ مُطلق) کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ جب انھیں بتایا گیا کہ وہ کوہ قاف (لامکان) میں رہتا ہے تو وہ اس کے دیدار کے لیے بے تاب ہو گئے۔ انھوں نے ہُدہُد سے کہا: تم ہمارے راہنما ہو، ہمیں وہاں لے چلو۔ ہُدہُد نے کہا: رستہ پُر خطر ہے اور مصائب گوناگوں۔ یہ بات سن کر بہت سارے پرندوں نے ارادہ ترک کر دیا لیکن کچھ پھر بھی پُرعزم رہے۔ اور سفر کے منازل طے کرتے رہے یہاں تک کہ ان میں سے تیس منزل آشنا ہوئے۔ جہاں اُنھوں نے خود کے علاوہ کسی کو نہ پایا اور یہ جانا کہ وہی سی مرغ (۳۰) ہیں۔

ج۔ کیا مرشد کے ساتھ عشق حقیقی ہے یا مجازی؟

سید محمد زاہدؒ اس سوال کا جواب بھی وجودی نقطۂ نظر سے تحریر کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مرشد کی حیثیت برزخ کی ہے جس کے دو رُخ ہیں۔ ایک رُخ ذاتِ مقدس کی طرف ہے جب کہ دوسرا سالک کی طرف ہے۔ اس لیے اگر کوئی اپنے مُرشد کی ہدایت میں شریعت کے اوامر و نواہی پر عمل پیرا ہوا، تا کہ اُسے جنت مل جائے تو اُس کا یہ عشق مجازی ہے۔ کیوں کہ اس نے تعینات (جنت) کے حصول کے لیے ایک تعین (شیخ) سے عشق کیا۔ لیکن اگر اُس نے مرشد کے راہنمائی حاصل کی تا کہ وہ اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے ذاتِ مقدس تک پہنچ سکے تو یہ عشق حقیقی ہے کیوں کہ اس نے تعینات کے وہم سے خود کو رہائی دلائی۔ اس نے شیخ کی ذات کو فانی جانا اور ذاتِ الٰہی کا طالب بنا۔ اس لیے اس کا عشق حقیقی ہے۔ سید محمد زاہدؒ، شیخ محمود شبستریؒ (۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء) کی گلشنِ راز سے ایک شعر نقل کرتے ہیں:

فقد سئلوا و قالو اما النهاية
فقيل هو الرجوع الى البدايته

یعنی انھوں نے سوال کیا کہ انتہا کیا ہے؟۔ تو انھیں جواب دیا گیا کہ ابتدا کی طرف لوٹنا۔ در حقیقت کمال اور انتہا یہ ہے کہ بنیاد کو درست کیا جائے۔ سید محمد زاہدؒ اس شعر کی وضاحت کرتے ہیں اور ذاتِ مطلق کی تفہیم کے لیے ایک دائرہ بناتے ہیں جس کی ایک قوس نزولی ہے جب کہ دوسری عروجی و صعودی۔ قوس نزولی میں ذاتِ مقدس تنزل کرتی ہے اور انسان کا مظہر، ظہور پذیر ہوتا ہے۔ جب کہ قوسِ عروجی میں انسان یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ شیخ کامل کی مدد سے شریعت پر پابندی کرتے ہوئے تعیناتِ وہمی سے چھٹکارا حاصل کرے تا کہ وہ قوسِ عروجی میں سفر کر سکے اور ذاتِ مطلق میں فنا ہو جائے۔ اور یہی انتہا ہے یعنی جس اطلاق سے آغاز ہوا، اسی پر انتہا ہوئی۔

اس شعر کی ایک دوسری تعبیر بھی ہے۔ وہ یہ کہ جب سالک اپنے شیخ کے حکم سے شریعت کے اوامر و نواہی پر عمل کرتا ہے۔ اور اورادو وظائف کی ادائیگی سے اپنی ذات کو روشن کرتا ہے جس کے باعث وہ مقام فنا پر پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ وہ حالتِ سکر اور تحیر (حیرت) میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے امورِ شرعیہ بجالانے سے قاصر ہو جاتا۔ اور یہ بہت بڑا نقصان ہے۔ کیوں کہ کمال یہ ہے کہ شریعت پر استقامت کے ساتھ طریقت اختیار کی جائے۔ لیکن جب وہ شریعت پر عمل نہ کرے تو یہ نقصان کا باعث ہے تاہم اگر مقامِ فنا اس کو مقامِ بقا کی طرف لے جائے تو اُسے فنا کے بعد بقا نصیب ہو گی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مقام فنا پر اس کا تعینِ کثیف ختم ہو جائے گا اور حق کی طرف سے اس کو تعینِ لطیف عطا ہو گا، جس کی وجہ سے اس کو فنا کے بعد بقا نصیب ہو گی اور یہ شریعت پر عمل کرنے سے مرتبۂ کمال حاصل ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس مقام پر سالک شریعت و طریقت دونوں پر کاربند ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شریعت، طریقت کے بغیر نقصان دہ ہے اور یہی حال اس کے برعکس کا ہے۔ پس ان دونوں کے اجتماع سے کمال حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ صرف سالک یا صرف مجذوب منزل آشنا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ سالک مجذوب یا مجذوب سالک منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لحاظ سے طالبانِ حق کی چار اقسام ہیں۔ فقط سالک، فقط مجذوب، مجذوب سالک اور سالک مجذوب۔ سالک وہ

ہے جو صرف شریعتِ ظاہرہ پر عمل پیرا ہو جب کہ مجذوب وہ ہے جو حالتِ سکر میں ہو جہاں وہ امورِ شریعت بجا نہیں لاتا۔ یہ دونوں مقامات کمی و نقصان کے موجب ہیں۔ مجذوب سالک وہ ہے جس کو اپنے شیخ کی وجہ سے جذب نصیب ہو بعد ازاں وہ شریعت پر استقامت کے ساتھ کاربند رہے۔ یہ بلند مقام ہے۔ اور سب سے بلند مقام سالک مجذوب کا ہے کہ جس کو شریعت پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے جذب حاصل ہوا اور وہ ہمیشہ شریعت پر کاربند رہا ہو، کیوں کہ وہ چیز جو بغیر محنت کے مفت حاصل ہو اس کی قدر نہیں ہوتی جب کہ وہ چیز جس کو محنت کے ساتھ حاصل کیا جائے وہ بہت عزیز ہوتی ہے اور وہ اس کو دائمی طور پر اپنے پاس رکھتا ہے۔ سید محمد زاہدؒ اس مرتبہ کامل کے حصول کی دُعا کے ساتھ کتاب کا خاتمہ کرتے ہیں۔

"اسرار الکمالیہ" پہلے دونوں تذکروں کی نسبت مختلف ہے۔ "خصالِ رضیہ" میں زیادہ تر حالاتِ زندگی اور "انوارِ جمالیہ" میں کرامات ہیں جب کہ، سید محمد زاہدؒ نے "اسرار الکمالیہ" میں زیادہ تر حافظ جمالؒ کے افکار کو واضح کیا گیا ہے اور اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ما قبل تذکروں میں پائی جاتی تھی۔

سلسلہ عالیہ چشتیہ کی خدمتِ حدیث

منیب مسعود چشتی☆

علمِ حدیث اور صوفیا

الحمد لله رب العالمين ؐ الرحمن الرحيم ؐ
اللهم صل على سيدنا و مولانا محمد و على آل سيدنا و مولانا محمد صلاة دائمة مقبولة تودى بها عنا حقه العظيم. اما بعد

دینِ متین کی خدمات میں صوفیا کا کردار ہر دور میں اہم رہا ہے مگر ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو "**فقد آذنته بالحرب**" کے مصداق، کم علمی اور تعصب کی بنا پر اسلافِ اُمت کو تنقید کا نشانہ بناتا رہا۔ اسی کش مکش میں عوام الناس شکوک و شبہات کا شکار ہوتی آئی ہے۔

بحکم تاجدارِ انبیاء، سلسلہ عالیہ چشتیہ کو خطۂ ہند پر اشاعتِ دین کا شرف حاصل ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ طباعت کی زوال پذیری کسی حد تک علمی زوال پذیری کا سبب بنتی آئی ہے۔ جس کی وجہ سے سلسلہ ہٰذا کی اکثر تحریری کاوشیں پس پردہ رہیں۔ صوفیائے چشت جہاں ایک طرف اسرارِ باطنیہ کے عَلَم بردار ہیں وہاں دوسری طرف علمی شعبہ کو بھی تنہا نہیں چھوڑا۔ یہ مختصر تحریر سلسلۂ چشت کی خدمتِ حدیث کے حوالے سے ہونے والے کام کو اہلِ علم تک پہنچانے کی ایک سعی ہے۔ ان خدمات کے ذکر سے پہلے قارئین کو یہ علم ہونا چاہئے کہ شریعتِ مطاہرہ کا ماخذ ثانی یعنی علمِ حدیث و سُنّہ صرف اور صرف صوفیا کی مرہونِ منت پروان چڑھا ہے۔ چند ایک امثال درجہ ذیل ہیں۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانی شارح بخاری کا مرتبہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں آپ نے اپنی اسانید کو جمع فرمایا جس کو "**المعجم المفهرس أو تجريد أسانيد الكتب المشهورة والأجزاء المنثورة**" کا نام دیا۔ اس کتاب میں آپ کو جن شخصیات سے شرفِ تلمذ حاصل رہا اور جو کتب متصل سَند و اِجازت کے ساتھ سبقًا پڑھیں ان کا تفصیلی ذکر فرمایا ہے، انھیں اسانید میں صوفیا کی جو صحبت میسر آئی اس کا ذکر بھی فرمایا جیسا کہ امام سُلَمی کی "الطبقات" اور "اربعین"، ابو نُعیم کی "حُلیَۃ"، امام قُشیری کا "اَلرّسالہ"، امام احمد کی کتاب "الزّھد" کے علاوہ "احیاء العلوم"، "قُوتُ القُلوب"، "عَوارف المعارف" اور شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے پوتے نصر بن عبد الرزاق کی کتاب "الاربعین" کے دروس حاصل کیے۔ امام الذھبی بھی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ کی کتاب "**سیَر أعلام النبلاء**" متاخرین کا سرمایہ ہے، اسی کتاب میں لکھتے ہیں۔

☆ ایم فل علومِ اسلامیہ، ناڑہ شریف، جنڈ (اٹک)

” ألبسني خرق التصوفِ شيخنا المحدث الزاهد ضياء الدين عيسٰى بن يحيىٰ الأنصاري بالقاهرة، وقال: ألبسنيها الشيخ شهاب الدين السهروردي بمكة عن عمه أبي النجيب ۔“

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محدثین میں ایک معتبر نام، جن کو صوفیا کا ناقد گردانہ جاتا ہے خود اقرار کر رہے ہیں کہ انھوں نے بانی سلسلہ سہروردیہ شیخ شہاب الدین عمر کے خلیفہ عیسٰی بن یحییٰ سے قاہرہ میں خرقہ [1] مبارک پہنا۔

اس کے علاوہ ابنِ مُلقن، ابنِ قُدامہ، امام بُغوی، بانی علمِ اصولِ حدیث امام ابنِ صلاح، امام الصابونی، المقدسی، امام طبرانی و کثیر آئمہ حدیث نے صوفیا سے بیعت و خلافت کا شرف حاصل کر رکھا تھا جن کی مزید تفصیل جاننے کے لیے اِن کتب کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ امام ذہبی کی "سیّرِ اِعلام"، حافظ ابنِ حجر کی "المعجم المفہرس" اور "طبقات الاَولیاء"، ساتھ ہی ان کتب سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ نہ صرف محدثین علمِ تصوف سے منسلک رہے بلکہ سُفیان ثوری و امام عبد الکریم قُشیری سے لے کر شاہِ قادریہ شیخ عبد القادر و شیخ عمر سہروردی تک صوفیا علمِ حدیث میں ثقہ راوی کی حیثیت رکھتے ہیں اور بطورِ محدث ان کی روایات سند مانی جاتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کسی صوفی پر حال کا غلبہ رہا تو اس کا علمِ ظاہری پردے میں رہا اور کسی پر قال کا غلبہ رہا تو اس کا علمِ باطن پردے میں رہا۔

باقی رہی بات چند ایسی شخصیات کی کہ جو اُمّی ولی ہوئے تو یہ نقطہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اگر کوئی ولایت کے مرتبہ پر بھی فائز ہو اور مدرسہ کا نام تک نہ سُنا ہو تو اس کی پہچان یہی ہے کہ اس کا ایک قول یا فعل بھی شریعتِ مطاہرہ سے متصادم نہیں ہو گا بلکہ وہ نبی مکرم ﷺ کی سنتوں کی سب سے زیادہ حفاظت کرنے والا ہو گا۔ اگر عاقل و بالغ اُسوۂ رسول ﷺ کے خلاف عمل پیرا ہو تو اس کو کبھی ولایت کا مقام نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال اُمّی ولی اللہ شیخ عبد العزیز الدباغ کا ثابت شدہ کلام ہے جو کہ "الابریز" میں تحریر کیا گیا ہے اور علمِ لدنی کے اسرار سے بھرپور ہے کہ حدیث شریف کے طلبا و محققین بھی کسی نقطہ کو سمجھنے کی خاطر ان سے رجوع کیا کرتے۔

ان اہم گزارشات کے بعد ہم خواجگانِ چشت کا ذکرِ خیر کرتے ہیں۔ پاک و ہند میں علمِ حدیث سے شغف رکھنے والی جن دو ہستیوں کا انتخاب یہاں کیا گیا ہے اُن میں پہلے خواجہ نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہی ہیں اور دوسرے خواجہ حسن الزمان حیدرآبادی ہیں جو ہند میں حضرت خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسویؒ کے خلیفہ حضرت خواجہ محمد علی خیر آبادیؒ کے دامن گرفتہ تھے۔ خواجہ نظام الدین کے نامِ گرامی اور علمِ حدیث کے ساتھ اُن کے شغف سے کون واقف نہیں، البتہ خواجہ حسن الزمان کے فنِ حدیث پر کام کی نوعیت کے اعتبار سے اُن کے کلام کی اشاعت اور پذیرائی جس حد تک ہونی چاہیے تھی وہ نہ ہو سکی۔ سو راقم نے خواجہ حسن الزمانؒ کے علمِ حدیث پر کام کے تعارف کے لیے اس تحریر کو مختص کیا ہے۔

شیخ عبد الحی سے مراد صاحبِ کتاب "نزھۃ الخواطر" عبد الحی بن فخر الدین لکھنوی ہیں۔ "نزھۃ الخواطر" کا دوسرا نام "الاعلام بمن فی التاریخ الھند من الاعلام" بھی ہے۔ جب کہ عبد الحی الکِتانی سے مراد محمد عبد الحی بن عبد الکبیر المغربی

[1] لباس صوفیا۔ گدڑی یا خرقہ، بیعت و خلافت یا فقر کے مراتب طے کروانے کی خاطر دیا جاتا ہے۔

المتوفی ۱۳۸۲ھ ہیں۔ اسی طرح سے شیخ ممدوح سے مراد اس تحریر میں شیخ محمود سعید ممدوح ہیں۔ شیخ کرمانی سے مراد شیخ محمد بن مبارک کرمانی المعروف میر خورد، خلیفہ خواجہ نظام الدین محبوبِ الٰہی ہیں۔

نظام الملۃ والدین خواجہ نظام الدین اولیاء (۶۳۳ھ تا ۷۲۵ھ)

آپ کا مکمل نام محمد بن احمد بن علی البخاری البدایونی ہے، صاحب نزہۃ الخواطر، شیخ عبد الحی نے یوں مخاطب فرمایا، الشیخ، الامام، العالم الکبیر، العلامہ، صاحبِ مقامات العلیۃ والکرامات المشرقۃ الجلیہ۔ شیخ عبد الحی نے کہا کہ عبادت، ترکِ دُنیا اور ظاہری وباطنی علوم میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ شیخ کرمانی فرماتے ہیں، اکثر آپ کا دِل غلبۂ عشق میں ڈوبا رہتا، قوتِ صَحو کی وجہ سے محبوبِ حقیقی کے اسرار کی حفاظت بھی فرماتے اور آنکھوں سے ہر وقت آنسو بہتے رہتے۔

ایسی کیفیت کی منظر کشی امام بوصیری نے اپنے قصیدہ میں خوب کی ہے۔

ایحسب الصب ان الحب منکتم ما بین منسجم منہ و مضطرم

کیا عاشق یہ سمجھتا ہے کہ محبت چھپی رہنے والی ہے اس حال میں کہ آنسو جاری ہیں اور دِل سے شعلے نکلتے ہیں۔

فکیف تنکر حبا بعد ما شھد ت بہ علیک عد ول الد مع و السقم

عشق کا انکار تو کیسے کر سکتا ہے جب تجھ پر دو سچے گواہوں نے گواہی دی۔ ایک آنسو اور دوسرا تیرا بیمار ہونا۔

حضرت محبوبِ الٰہی ۶۳۳ھ کو بدایوں میں پیدا ہوئے، والد بچپن میں ہی فوت ہوگئے۔ والدہ محترمہ نے آپ کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ آپ کا رُجحان علومِ دینیہ کی طرف تھا۔ ابتدائی تعلیم شیخ علاء الدین اصولی سے حاصل کی۔ پندرہ سال کی عمر میں تخصص کے لیے سفر دلّی اختیار کیا۔ اساتذہ میں شیخ شمس الدین خوارزمی جیسے نابغہ شامل ہیں۔ "حریری" کے چالیس مقامات حفظ کرنے کے بعد شیخ رضی الدین صَغانی کی صحیحین پر لکھی کتاب "مشارق الانوار" کو اُن کے شاگرد شیخ کمال الدین محمد زاہد ماریکلی کے پاس حفظ فرمایا۔ پھر اجودھن (پاکپتن) کا رُخ کیا اور وہاں شیخ فرید الدین مسعود نے قرآن پاک کی تعلیم کے علاوہ، تصوف میں عوارف المعارف اور عقائد میں شیخ ابو شکور سالمی کی ماتریدی عقائد پر لکھی معروف کتاب "کتاب التمہید" پڑھائی۔ اس کے بعد خرقۂ خلافت سے نواز کر سلطنتِ ہندوستان کی شاہی عطا کی۔[۲]

حضرت محبوبِ الٰہی اور علمِ حدیث

صاحب سیر الاولیاء شیخ کرمانی نے وضاحت سے لکھا ہے کہ خواجہ صاحب نے نہ صرف "شوارق الانوار شریف" کو، کمال الدین کے پاس حفظ کیا تھا بلکہ جس قدر ہو سکتی تھیں روایات کی تحقیق بھی کی، شرح و علمی دقائق پر بھی توجہ فرمائی اور اس کتاب میں

---

[۲] عبد الحی بن فخر الدین، الاعلام بمن فی التاریخ الہند من الاعلام، ط: بیروت: لبنان، دار ابن حزم، ۱۹۹۹ء۔ ج: ۲، ص: ۱۹۳

کمال حاصل کیا۔ آپ کو شیخ کمال الدین زاہد نے صاحبِ کتاب تک متصل سند بھی عطا فرمائی جس کا عربی متن سیر الاولیاء میں، حالاتِ زندگی خواجہ نظام الدین کے باب میں درج ہے۔[۳]

آپ رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات کا مطالعہ کرنے سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ نے صرف علم حدیث شریف حاصل ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کا درس بھی دیا کرتے تھے، "فوائد الفواد" میں آپ کے درسِ حدیث کا ذکر موجود ہے۔ لہٰذا اس کتاب کی مجلس ۳۸، ج دوم میں ۱۳ شوال بروز ہفتہ، ۷۱۲ھ کی ایک مجلس کو قلم بند کرتے ہوئے خواجہ امیر حسن فرماتے ہیں کہ شیخ نوحؒ آپ کی مجلس میں "شوارق الانوار" کی تلاوت کر رہے تھے اور آپ ان احادیث کی تفصیل و تشریح فرمارہے تھے۔[۴] اس مجلس میں شوارق الانوار سے بابِ ثانی "اِنَّ" کی حروفِ تہجی کے اعتبار سے تین احادیث، (ان المومنین۔ ان المومن۔ ان المراۃ) تلاوت کی گئیں[۵]۔ مسلم کی روایت "ان المراة تقبل فى صورة الشيطان[۶]" کی وضاحت کرتے ہوئے خواجہ صاحب نے فرمایا۔ "بیاہے ہوئے شخص کی ایک خیریت یہ بھی ہے" (یعنی جب حدیث میں آیا کہ اگر مرد کا دِل گناہ کی طرف مائل ہونے لگا ہو تو اہلیہ کے قریب ہو، اس کو اللہ کے حلال کردہ عمل کی جانب لگانے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ خواجہ صاحب نے اس کو شادی کی صفات میں سے ایک صفت شمار طرح کی امثال خواجہ صاحب کے ملفوظات میں محفوظ ہیں جو نہ صرف اس بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ آپ نے حدیث شریف کا علم حاصل کیا بلکہ آپ کو درس و تدریس کی اجازات بھی حاصل تھی۔

شیخ سید محمد بن مبارک کرمانی نے خواجہ صاحب کی بابا فریدؒ سے جو خلافت عطا ہوئی اس کا عربی متن بھی لکھا ہے، بابا صاحب پہلے علمِ حدیث و علمِ عقائد کی صفات بیان کرتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ نظام الدین نے کانوں سے سُنا اور دِل سے جان لیا، اسی سَند میں خواجہ صاحب کو "کتاب التوحید" کا درس دینے کی اجازت ملی، جو صاحبِ کتاب تک جاتی ہے۔ اس سَند میں خلوت نشیں ہونے کا حکم بھی

---

[۳] محمد بن مبارک کرمانی، سیر الاولیاء، ط: اسلام آباد: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، ۱۳۹۸ھ، ص: ۱۱۴

[۴] امیر حسن سجزی، فوائد الفواد، ط، تہران: انتشارات زوار، ۱۳۸۵ھ۔ ص: ۱۷۲

[۵] پہلی دو احادیث صحیحین میں موجود ہیں جب کہ تیسری صرف مسلم کی روایت ہے۔ یہ احادیث امام صغانی کی ترتیب کے مطابق اکٹھی لکھی گئی ہیں کیوں کہ مشارق کی ترتیب سے جن احادیث کے متون "اِنَّ" سے شروع ہوتے ہیں ان کو "اِنَّ" کے بعد حروفِ تہجی کے حساب سے ذکر کیا گیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں شوارق الانوار۔

[۶] مسلم بن الحجاج، صحیح مسلم۔ ط، بیروت: دار طوق النجاۃ، ۱۴۳۳ھ۔ ج: ۴، ص: ۱۲۹۔ کتاب النکاح، باب ندب من رأی امرأۃ فوقعت فی نفسہ۔

[۷] سید اخلاق حسین قاسمی نے (فوائد الفواد کا علمی مقام، ص: ۴۳) لکھا ہے کہ خواجہ صاحب کتاب الطہارت کی حدیث کی شرح کرتے ہوئے کتاب النکاح پر گفتگو شروع فرمارہے ہیں اور اس کی ممکنہ توجیہ بھی پیش کر رہے ہیں۔ مگر راقم الحروف انتہائی ادب سے عرض گزار ہے کہ قاسمی صاحب نے سہواً ایسا لکھا ہے۔ جب کہ یہ تین احادیث، شیخ رضی الدین کی ترتیب ابواب کے مطابق اکٹھی آتی ہیں اور شوارق میں یہ اسی ترتیب سے اکٹھی ہی درج ہیں۔ جس ترتیب سے خواجہ صاحب کی مجلس میں تلاوت کی جارہی تھی اور اس پر توجیہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔

دیا[۸]۔ "نزھۃ الخواطر" میں لکھا ہے کہ بابا صاحب نے آپ کو قرآن یاد رکھنے، زیادہ روزے رکھنے، ذکر و عبادت کے ساتھ دُنیا کی چاہت سے کنارہ کش ہونے، بہترین اخلاق اپنانے کی تلقین بھی فرمائی تا کہ آپ اپنے مقام کو پالیں[۹]۔

خواجہ نظام اپنے پیر و مرشد کی طرح ہی سلاطینِ وقت کے عہدوں اور اُن کی دولت سے دور بھاگتے تھے، اگر کبھی علم ہوتا کہ سلطانِ وقت اُن کی خانقاہ کی جانب ملاقات کے لیے چل پڑا ہے تو خانقاہ سے جانب پاک پتن روانہ ہو جاتے۔ خواجہ صاحب کا محفل سماع سے متعلق مناظرہ بھی (جو کہ آپ کے علمی و روحانی مقام و مرتبہ کی دلیل ہے) چشت کی مستند کتب میں موجود ہے۔

شیخ کِرمانی نے لکھا کہ خواجہ نظام الدین کے مرید و خلیفہ الشیخ المحدث امام فخر الدین زرادی پہلے خواجہ صاحب پر شدید تنقید کیا کرتے تھے جس کی وجہ سماع کی محافل بھی تھیں، جب ان کو خواجہ کی محفل میں لایا گیا اور بعد ازاں جب خواجہؒ نے ان کے سبق کا پوچھ کر اسی کے مطابق نقاط بیان فرمائے، محفل سے شیخ مولانا فخر الدین متاثر ہو کر آپ کے دامن گرفتہ ہوئے[۱۰]۔

آپ بھی حدیث کے بہت بڑے عالم ہیں، آپ نے سماع کے موضوع پر دو رسائل تصنیف فرمائے ہیں، ایک کا نام "اصول السماع" ہے جس کا تفصیلی ذکر راقم کی زیر طبع کتاب "قوالی پر مابعد جدیدیت کے اثرات" میں موجود ہے، دوسرا وہ رسالہ ہے جس کا ذکر مزامیر کی حرمت بیان کرتے ہوئے امام احمد رضا نے فتاوٰی میں کیا ہے۔ اصول السماع میں خواجہ صاحب کے مرید نے سماع کی حلّت پر دلالت کرنے والی احادیث کی تخریج فرماتے ہوئے مزامیر کو جائز ثابت کیا ہے۔

خواجہ نظام الدینؒ کا مختصر ذِکر اس رسالہ میں کرنے کا مقصد آپ کی علمِ اقوال و افعالِ رسول ﷺ سے محبت ہے۔ آپ کے استاد (کمال الدین زاہد الماریکلی) نے اگرچہ دو مختلف اساتذہ کے واسطہ سے آپ کو "شوارق" کی سند عطا فرمائی مگر یہ بھی روایت ملتی ہے کہ وہ بذاتِ خود محدثِ اعظم اور حافظ الوقت شیخ رضی الدین صاغانی / صغانی کے شاگرد تھے اور علمِ حدیث انھیں سے حاصل کیا تھا۔ امام صغانی بھی وہ عظیم شخصیت ہیں جنھوں نے بخاری شریف اور مسلم شریف کی احادیث کو جمع فرمایا، ان کو عربی لغت کے اعتبار سے نئی ترتیب دی اور اس کا نام "شوارق الانوار" رکھا جو کہ اپنے وقت کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ آپ بخاری شریف کی کتابت کرنے والے متاخرین میں سے ہیں جنھوں نے نہ صرف اس کو جمع فرمایا بلکہ اس کی کتابت کرتے ہوئے آپ کے پاس بخاری کا ان کے شاگرد امام فَربری کا لکھا نسخہ بھی تھا جس کی اصل صرف امام صَغانی تک پہنچی، لہٰذا آپ کا کتابت کردہ بخاری شریف کے نسخہ میں اس سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا گیا ہے اور جہاں ضرورت پڑی اس میں نسخوں کے فرق کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اس نسخے پر تحقیق جاری ہے جو اگلے کچھ سالوں میں ان شاء اللہ منظر عام پر آجائے گا۔

---

[۸] کرمانی، سیر الاولیاء، ص:۱۲۸۔

[۹] عبد الحی، الاعلام۔ ص:۱۹۴

[۱۰] کرمانی، مترجم: غلام احمد بریاں، سیر الاولیاء۔ ط:، لاہور، مشتاق بک کارنر۔ ص:۳۷۴۔۳۷۵

آپ کے ملفوظات میں "فوائد الفواد" معروف ہے جو روحانی و ظاہری علوم سے بھرپور ہے۔ آپ ۷۲۵ھ میں ظاہری دُنیا سے پردہ فرما گئے اور مزارِ اقدس دہلی میں مرجع خلائق ہے۔ شیخ عبدالحی نے (ص:۱۹۵) ذکر کیا ہے کہ بہت سی کتب معتبرہ میں آپ کے حالات و آثار ذکر ہیں ان میں سب سے بہترین سیر الاولیاء ہے۔ اس کے علاوہ آپ کا بلند پایہ علمی مقام "الاثمار الجنیۃ فی اسماء الحنفیۃ"، "الالطاف الحقیۃ فی اشراف الحنفیۃ" اور "نفحات الانس" میں بھی بیان کیا گیا ہے، یہاں طوالت سے بچتے ہوئے صرف کتب کے اسما پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

محدثِ کبیر خواجہ حسن الزماں حیدرآبادی (۱۲۴۱ھ تا قریباً ۱۳۲۸ھ)[1]

آپ کا اسمِ گرامی حسن الزمان بن قاسم علی بن ذی الفقار علی بن امام قلی الترکمانی الحیدرآبادی ہے۔[2] جب کہ ڈاکٹر احمد خان نے اپنی تحریر" معجم المطبوعات العربیۃ فی شبہ القارۃ الھندیۃالباکستانیۃ" میں حسن الزمان محمد بن قاسم لکھا اور ذی الفقار کو ذوالفقار ذکر کیا ہے۔ شیخ عبدالحی الحسنی نے اپنی "اِعلام" میں آپ کا اسمِ گرامی ذکر کرنے سے پہلے الشیخ، العالم، المحدث کے القابات ذکر فرمائے اور پھر الترکمانی، الحیدرآبادی اور احد کبار العلماء بھی لکھا۔ شیخ عبدالحی الکتانی نے اپنی فہرس الفھارس میں ، الدکنی اور الھندی لکھا۔ "اللآلئ الدریۃ "میں شیخ النجمی کی اسانید ذکر کرتے ہوئے علامہ عبداللہ نے الدکنی، الترکمانی اور الحیدرآبادی لکھا۔ شیخ احمد صدیق الغُمَّارِی اپنی کتاب "البرھان الجلی فی تحقیق انتساب الصوفیۃ الی علیؓ" میں یہ القابات ادا کیے ہیں۔ الامام، العلامۃ، الحافظ، الصوفی۔ اسی کی تصدیق دیگر محققین نے بھی کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کا حقیقی نام محمد بن قاسم ہے، اور حسن الزمان[3]، آپ کو آپ کی سیادت اور علم و مرتبہ کی وجہ سے کہا گیا۔ "فیض الملک الوھاب المتعالی" میں شیخ عبدالستار دہلوی نے الشیخ الاجل والمحقق الاکمل کہہ کر ذکر فرمایا۔

ڈاکٹر محمود سعید بن محمد ممدوح، جو خطۂ عرب کے محدث و محقق ہیں۔ اپنی کتاب میں خواجہ حسن الزمان کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپؒ ۱۲۴۱ھ میں "ونقول" گاؤں میں پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں قرآن شریف کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد اپنے والدِ گرامی کے ساتھ حیدرآباد دکن تشریف لے آئے، محقق عبدالحی کے مطابق پیدائش بھی حیدرآباد میں ہوئی تھی۔

---

[1] ابوالخیر نے آپ کی ولادت ۱۲۴۱ھ لکھی ہے، فیض الملک میں بھی یہی درج ہے، شیخ ممدوح نے یہی نقل فرمائی۔ آپ کے مزارِ اقدس پر جو کتبہ لگایا گیا ہے وہاں وصال ۱۱ ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ درج ہے۔ الطباطبائی نے "اہل البیت فی المکتبۃ العربیۃ" میں ۱۳۲۸ھ لکھا۔ شیخ عبدالحی نے یہی ذکر کی، ڈاکٹر یوسف المرعشلی نے یہی نقل کی۔ شیخ ممدوح نے یہی نقل کی، "معجم المطبوعات العربیۃ" میں ڈاکٹر احمد خان نے ۱۳۲۹ھ لکھی۔

[2] عبدالحی بن فخر الدین، الاعلام بمن فی التاریخ الہند من الاعلام، ط: بیروت: لبنان، دار ابن حزم، ۱۹۹۹م۔ ج:۸، ص:۱۲۱۰

[3] مزار اقدس پر "حسن الزماں" لکھا ہے، عربی کتب میں "حسن الزمان، ن کے ساتھ ذکر ہے۔

شیخ ممدوح نے تعلیم سے متعلق تفصیل سے بیان کیا جب کے باقی کتب میں چند جملوں سے زیادہ حالات و آثار کسی نے نہیں بیان کیے، وہ چند کتب کا ذکر بھی کرتے ہیں جہاں سے انھوں نے حسن الزمان کے متعلق آثار جمع کیے۔ زیادہ تر معلومات خواجہ حسن الزمان کے شاگردِ خاص شیخ ابو الخیر عطار مکی کی کتاب "النفح المسکی" سے حاصل کیں۔ دس سال کی عمر میں آپ نے اپنے بھائی شیخ سلطان علی سے ابتدائی علوم، صرف و نحو اور منطق پڑھی۔ مولوی میر شیر علی حیدر آبادی سے شرح مُلا جامی پھر شیخ نیاز محمد بدخشانی اور قاضی محمد یاسین حیدر آبادی سے منطق کی منتہی کتب پڑھیں۔ شیخ شجاع الدین العمری الدکنی القندہاری سے شرح وقایۃ کے کچھ ابواب پڑھے، اور ہدایۃ کے لیے شیخ عبد الرحیم ہندی کی صحبت میں بیٹھے، اس دور کے اصولیین سے کتبِ اصول بھی پڑھیں۔ آپ کے خلفا میں شیخ لطیف الزمان اور سید میر خورسند علی شامل ہیں۔

خواجہ حسن الزمان بطور حافظ الحدیث:

شیخ عبد الستار بن عبد الوہاب الدھلوی الصدیقی المکی الحنفی نے خواجہ حسن الزمان کے سفر حدیث کو تفصیل سے بیان فرمایا۔[14] آپؒ فرماتے ہیں کے حسن الزمانؒ نے کتبِ احادیث شیخ شجاع الدین العمری سے پڑھیں جب کہ امام ترمذی کی شمائل اور حصن حصین شریف کی سند شیخ شجاع الدین علوی کی مجلس میں حاصل ہوئی، یہ متصل سند مذکورہ استاد سے محدث عبد الرحمن المعروف عزت یار خان شہید، ان سے شیخ خیر الدین السورتی اور ان سے شیخ کرامت علی دہلوی تک پہنچتی ہے۔ حج کے سفر پر گئے تو حرمین شریفین کے اساتذہ کے پاس بھی زانوے تلمذ تہ کیا اور پھر مزید علم کے شوق میں یمن روانہ ہوئے۔ وہاں شیخ الفقیہ سید محمد بن عبد الباری اور شیخ ابو عنایۃ سے مسلسلات وغیرہ حاصل کیں۔[15]

---

[14] عبد الستار الھندی المکی، فیض الملک الوھاب المتعالی، ط: مکۃ المکرمۃ: مکتبۃ الاسدی، طبع الثانیہ، ۱۴۳۰ھ۔ ج:۱، ص:۴۹۱۔

[15] المسلسلات سے مراد عموماً وہ احادیث ہوتی ہیں جن کی اَسناد کے تمام راوی یا تو کسی خاص صفت و خصوصیت کی وجہ سے مشترک ہوں یا کسی خاص صیغہ کے بیان کرنے میں متفق ہوں۔ یہ اشتراک رسول اللہ ﷺ سے لے کر جو راوی حدیثِ مسلسل حاصل کرتا ہے ان تک موجود رہتا ہے۔ اگر ایک بھی راوی اس صفت یا الفاظ سے خالی رہ جائے تو یہ تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔

مذکورہ مسلسلات میں سے شیخ حسن الزمان نے یمن سے مسلسل بالاشراف حاصل کی۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ان احادیث کے راوی تمام کے تمام سادات کرام تھے۔ کوئی ایک راوی بھی خواجہ صاحب تک غیر سید نہ تھا۔ علمِ حدیث کے دوران محدثین میں یہ طریقہ آج بھی رائج ہے اور اس کو باعثِ برکت سمجھا جاتا ہے، الحمدللہ راقم الحروف کو مسلسلات میں سے المسلسل بلاولیۃ، المسلسل بالمحبۃ، المسلسل بالصوفیہ اور عیدین وغیرہ کی اَسناد حاصل ہیں، علمِ حدیث میں قدم رکھنے کے بعد مسلسلات حاصل کرنے کا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کے وسیلہ سے اللہ کریم علم کے دروازے ہم پر کھول دے۔ ہمیں استقامت عطا فرمائے اور جو یہ مخصوص اَسناد زنجیر کی صورت درجہ بدرجہ رسولِ خدا ﷺ تک پہنچ رہی ہیں ان اسناد کے توسل سے ہم خطا سے بچتے ہوئے خدمتِ حدیث شریف میں مصروف رہیں بالواسطہ نبی کریم ﷺ کی نظر عنایت بھی ہم پر رہے۔

خرقۂ خلافت

خواجہ حسن الزمان نے سلسلہ چشتیہ نظامیہ میں خلافت خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسویؒ کے اولین خلفا میں سے معروف ترین خلیفہ شیخ علامہ محمد علی خیر آبادی(۱۱۹۲ھ تا۱۲۶۶ھ) سے حاصل کی اور انھوں نے خلافت موجودہ پاکستان میں نظامیہ سلسلہ کہ معروف بزرگ اور بارھویں صدی کے عظیم مصلح وپیشوا خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسوی(۱۱۸۴ھ تا۱۲۶۷ھ) سے حاصل کی۔ راقم الحروف کے لیے شرف کی بات یہ ہے کہ سلسلہ چشتیہ نظامیہ میں راقم کو خلافت متصل اسناد کے ساتھ (پانچ واسطوں سے) خواجہ حسن الزمان سے حاصل ہے، لہٰذا اسمائے مبارک خواجگان یہ ہیں۔

احقر منیب مسعود کو خواجہ طارق مسعود (والد) سے، ان کو خواجہ نثار احمد (راقم کے تایا) سے، ان کو خواجہ فضل داد عرف بہرام چشتی نظامی ثم القادری (راقم کے دادا) سے، ان کو خواجہ سید آلِ رسول علی خان (سجادہ نشین اجمیر شریف) سے، ان کو سید میر خورسند علی (آلِ رسول علی کے والد) سے، جب کہ ان کو خواجہ حسن الزمان حیدرآبادی سے، ان کو خواجہ محمد علی خیر آبادی سے اور ان کو خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسوی رضی اللہ عنہم سے خلافت حاصل ہے، یہ سلسلہ خواجگانِ چشت کے واسطہ سے رسول اللہ ﷺ تک پہنچتا ہے۔ والحمدللہ علی ذالک۔

تصنیفات

ڈاکٹر احمد خان نے "معجم المطبوعات العربیۃ" میں آپ کی درجہ ذیل کتب کے اسماذ کر کیے ہیں۔

"اصول الروایۃ عن اہل بیت الہدایۃ" جس کو حیدر آباد دکن کے مطبع یوسفی نے ۱۳۲۳ھ میں طبع کیا۔

"تحقیق الجلی" شیخ عبدالقادر جیلانی کے متعلق، حیدر آباد دکن سے اُردو ترجمہ کے ساتھ ۱۳۲۸ھ سے پہلے کسی سال طبع ہوئی۔ اس کے نام میں اختلاف ہے، (الحلی، الملی، الجلی) علامہ عبدالحی نے اس کا نام یوں بیان کیا۔ "تحقیق الجلی لنسب السید الجیلی"۔

"سقی العطشان من مشرب السید عثمان الھارونی" خواجہ عثمان ہارونی کے احوال درج ہیں، مذکورہ بالا مطبع سے ۱۳۲۵ھ میں طبع ہوئی۔ اس کا ایک نسخہ مکتبہ حرم المکی سعودیہ میں موجود ہے۔

"الفقہ الاکبر عن اہل البیت الاطہر" مطبع عزیز دَکن سے اس کی جلد اول اُردو ترجمہ کے ساتھ ۱۳۱۴ھ میں طبع ہوئی۔ اس میں علوم اہل بیت کو جمع فرمایا۔

جب کہ دوسری جلد صرف عربی میں مطبع یوسفی سے ۱۳۲۴ھ میں منظر عام پر آئی۔ جلد ثالث مطبع سبحانی سے طبع ہوئی۔

ایک جلد مطبع سبحانی سے ۱۳۲۸ھ میں چھپی۔

"القول المستحسن شرح فخر الحسن" ۱۲۹۲ھ میں سامنے آئی اور پھر حیدر آباد دکن سے ۱۳۲۸ھ سے پہلے کسی سال میں طبع ہوئی۔ یہ کتاب دو جلدوں میں طبع ہوئی جس کی دوسری جلد کی تلاش جاری ہے۔ ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کی لائبریری میں موجود ہے جو ۸۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

"ماتم الثقلین فی شهادة المو الی علی و الحسنین" امام حسین عالی مقام کے مناقب پر حیدرآباد دکن سے اشاعت آشنا ہوئی۔[16]

علامہ عبدالحی نے ایک اور کتاب "نور العینین فی فضیلة المحبوبین" کا ذکر فرمایا۔ اس کے علاوہ شیخ ممدوح نے یہ کتب بھی آپ سے ہی منسوب فرمائیں۔ "مطالب الارتضاء ومآرب الاصطفاء فی مذاهب الفقهاء ومشارب العرفاء"[17]۔ ایک رسالہ جو مسئلہ تفضیل اور ایک رسالہ جو حدیث سکتتین کے موضوع پر تحریر فرمایا۔

راقم کو آپ کا حدیثِ قرطاس پر لکھا ایک رسالہ کتب خانہ مولانا محمد علی مکھڈیؒ، مکھڈ شریف (اٹک) میں ملا۔ وہ بھی حیدرآباد دکن سے ہی طبع شدہ ہے۔

آپ کی کتب کے اکثر نسخہ جات نا صرف مکتبہ آصفیہ وحیدرآباد دکن وغیرہ میں موجود ہیں بلکہ انڈیا و پاکستان سمیت اکثر ممالک میں قدیم نسخہ جات میں آپ کی کتب کا نام آتا ہے، اٹک میں کتب خانہ محمد علی مکھڈی میں بھی آپ کی کتب موجود ہیں۔[18]

علمی مقام و مرتبہ

آپ کے علمی مقام کو الفاظ میں بیان کرنا آسان نہیں، جہاں ایک جانب آپ کی تحریریں ایک صاحبِ علم اور محقق کی عقل کو دنگ کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں وہاں دوسری جانب آپ کی بلادِ عرب حاضری پر محدثین کا آپ سے سندِ روایت کرنا اور ابوالخیر المکی جیسے معروف محدثین کا باقاعدہ آپ کی شاگردی اختیار کرنا اور سبقاً سبقاً آپ کی تحریر کردہ تحقیقات کو آپ کے پاس بیٹھ کر سماع کرنا روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔ ذیل میں آپ کے علم و فضل سے متعلق چند امثال تحریر کی جا رہی ہیں۔

شیخ عبدالحی الکتانی، جو کہ مغربی مسلم ممالک کے معروف محدث، مسند، مورخ، تمام علوم پر دسترس رکھنے والے اور مختلف موضوعات پر سینکڑوں تحقیقی کتب لکھنے والے تھے۔ آپ نے اپنے شیوخ میں جن سے اجازات حاصل کیں، خواجہ حسن الزمان کا نام بھی ذکر فرمایا ہے۔[19] اسی اجازت کی تصدیق اکثر مورخین نے کتب میں فرمائی ہے۔ ابوالخیر احمد عطاری مکی بھی وقت کے مشہور عالم

---

[16] یہ کتاب حضرت علی المرتضیٰ اور آپ کے دو صاحبزادوں، امام حسن اور امام حسین، کے فضائل، آثار اور ان کی شہادت کے اوپر لکھی گئی ہے، ایک نسخہ حال ہی میں ایران سے دوبارہ طبع کیا گیا ہے۔ ایک نسخہ کتب خانہ مولانا مکھڈیؒ، مکھڈ میں موجود ہے۔

[17] ابو مالک العوضی نے "الفہرس" میں اس کا ذکر کیا کہ اس کا ایک نسخہ مکتبۃ القادریۃ، بغداد میں موجود ہے جو چودھویں صدی ہجری میں لکھا گیا ہے۔

[18] اس مختصر تحقیق کی تکمیل کے فوراً بعد ہی راقم، شیخ وجاہت حسین الحنفی کے ساتھ کتب خانہ مولانا مکھڈی، مکھڈ شریف حاضر ہوا، جہاں محترم ساجد نظامی کی معاونت میں چند مزید نسخے دریافت ہوئے۔ علوم اہل بیت کی پہلی کتاب "فقہ الاکبر" کی تیسری جلد، دوسری کتاب "أصول الدرایۃ" کا ایک نسخہ، "ماتم الثقلین" کی ایک صاف کاپی اور سب سے بڑھ کر فارسی زبان میں ایک رسالہ "دفاع الوسواس الخناس عن ایقاع الالتباس فی حدیث قرطاس" ملا، جس کا ذکر دیگر کتب میں موجود نہ تھا، حال ہی میں اس کی طباعت کا ذکر عارف نوشاہی کی "فہرست نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان" کی چوتھی جلد میں نظر سے گزرا۔

[19] عبدالحی الکتانی، فہرس الفہارس والاثبات، ط: بیروت، دار الغرب الاسلامی۔ ج: ۱، ص: ۶۰۔

گزرے ہیں، الکتانی نے آپ کو بھی اپنے شیوخ میں ذکر کیا ہے۔ آپ نے باقاعدہ خواجہ حسن الزمان سے اپنی سند و اجازت بیان کرتے ہوئے آپ کی زندگی سے متعلق اہم نقاط کو واضح فرمایا۔ جس کا ذکر موضوع کی مناسبت سے کیا جائے گا۔ آپ نے یہ بھی بیان فرمایا کہ میں نے حیدرآباد میں باقاعدہ آپ کی اولین تصنیف "القول المستحسن " کو پڑھا، اس اجازت کے ساتھ ساتھ مجھے شیخ نے اپنی تمام کتب کی تمام شیوخ سے اجازہ عامہ بھی عطا فرمائی، اور رسالہ "مطالب الارتضاء "کے مطلق فرمایا کہ نمازِ جمعہ کے بعد ماہِ رجب ۱۳۰۳ھ، میں 'میں نے قرآت مکمل کی۔

پچھلی صدی کے عظیم محقق و محدث اور ساداتِ غماریہ کے معزز شیخ، احمد صدیق الغماری، امام حسن بصری کی حضرت علی علیہ سلام سے سماع کو ثابت کرتے ہوئے اپنی تحقیق کے دوران خواجہ صاحب کی کتاب سے اقتباس نقل کرتے ہیں تو خواجہ صاحب کو حافظ الحدیث کے لقب سے نوازتے ہیں، اسی طرح شیخ علوی بن طاهر بن عبد اللہ الحدادنے القول الفصل فیما لبنی ھاشم۔۔۔ میں آپ کو حافظ الحدیث کہا ہے، اس بات کی تصدیق شیخ ممدوح نے بھی مذکورہ بالا کتاب میں صفحہ ۱۸۹ پر فرمادی۔

حافظِ حدیث کی کئی ایک تعریفات عام کتب میں لکھی مل جاتی ہیں جن میں حافظ اس کو کہا گیا ہے جسے کئی لاکھ احادیث مع اسناد اَزبر ہوں مگر حفاظ کے مراتب کی معیاری و مدلل تعریف شیخ عبد اللہ بن صدیق الغماری نے فرمائی، آپ نے ان مراتب کو یوں ترتیب دیا۔ المسند، المحدث، المفید، الحافظ، امیر المومنین فی الحدیث، آپ حافظِ حدیث کے مطلق فرماتے ہیں کہ بہترین حافظہ والی ایسی شخصیت کہ اس کو صرف احادیث ہی حفظ نہ ہوں بلکہ جس کی روایات پر بھی نظر ہو، راویوں کے نہ صرف طبقات بلکہ ان کے احوال سے بھی خوب واقف ہو، جس کو قواعدِ تصحیح و تضعیف یعنی حدیث پر درست حکم لگانے کا پورا پورا اِدراک ہو اور جس کو علل و غرائب کی مکمل معرفت ہو۔ اگر وہ کسی راوی کے متعلق "لااعرف "بول دے تو اس راوی کو مجہول کے مرتبہ پر رکھا جائے گا۔

اب حدیث کے طلبا اس مقام کو بہتر سمجھ سکتے ہیں، اور خواجہ حسن الزمان اہلِ عرب و عجم کے ہاں کیا مقام رکھتے تھے۔ شیخ محمود سعید ممدوح کو جب خواجہ صاحب کے اس مرتبہ سے واقفیت ہوئی اور انھوں نے اس صدی کے عرب و عجم کے رہنے والے محدثین کی خدمات دیکھیں تو ایک کمال کا فقرہ کہا۔ فرمایا:

اعلم اهل عصره بالهند فی القواعد الحديثية والرجال والتصحيح والتضعيف، بل لايوجد له نظير فی المعرفة الحد يثية فی بلاد العرب فی عصره .[20]

جاننا چاہیے کہ اہلِ علم میں سے ہند میں قواعدِ حدیث، علمِ اسماء الرجال اور حدیث کا صحیح مرتبہ پہچان کر اس پر حکم لگانے میں، (حضرتِ حسن الزماں) کہ صرف عجم ہی میں نہیں بلکہ عرب میں بھی اِس عہد میں آپ کی مثل کوئی تھا ہی نہیں۔ ہمیں تیرھویں اور چودھویں صدی میں بہت بڑے بڑے محدثین کے نام ملتے ہیں۔ پھر مصنف نے کیوں خواجہ صاحب کے متعلق یہ جملے لکھ دیے، کیا

---

[20] محمود سعید ممدوح، الاتجاهات الحديثية، ط: بیروت، دار الکتب المصرية، ۱۴۳۸ھ۔ ج: ۰۳، ص: ۱۸۷۔

وہ تاریخ سے واقف نہیں تھے؟ حالاں کہ وہ تاریخ علمِ حدیث کا صحیح ادراک رکھنے والی شخصیت ہیں اسی وجہ سے اتنی بڑی بات کہہ دی، وجہ یہ ہے کہ جب کوئی بھی شخصیت جو علم حدیث کی تمام جہات کو خوب جاننے والی ہو، اس کی نظر سے جب خواجہ صاحب کا کلام گزرتا ہے تو عقل دَنگ رہ جاتی ہے کہ ہند میں بیٹھ کر کیسی کیسی کتاب تک آپ کو رسائی حاصل تھی، یہی وجہ ہے کہ وہ محدثین جو ان باریکیوں کو جاننے والے ہیں انھوں نے ان القابات سے آپ کو نوازا ہے۔

آپ کے مزارِ اقدس کا اسمِ مبارک جو درگاہ میں داخل ہوتے ہوئے نظر آتا ہے۔"درگاہِ روضۃ الحدیث" ہے، "روضۃ"سبزہ زار، باغ اور خوشبودار پھولوں کے مسکن کو کہتے ہیں یعنی علمِ حدیث کے باغیچہ کی درگاہ۔ یہ درگاہ حیدرآباد دکن کی پرانی بستی میں "رین بازار" اور "پھول باغ" کے قرب وجوار میں واقع ہے۔ اب ان کی چند کتب کو باریک بینی سے دیکھتے ہیں تاکہ ہم جیسے کم علم مبتدی کو کچھ نہ کچھ اندازہ ہو کہ آپ کیسا کلام فرمایا کرتے تھے اور آپ کو اس فن میں کتنا عبور حاصل تھا۔

کتب کا تفصیلی تعارف

ان کی کتب پر تحقیق کا کام الحمدللہ جاری ہے، راقم کو اپنے استادِ محترم[21] اور ان کے احباب کی ذوق اور توجہ سے جن کتب تک رسائی حاصل ہو چکی ہے ان میں "الفقہ الاکبر"، "اُصول الدرایہ"، "ماتم الثقلین"، "القول المستحسن"، شامل ہیں کچھ کتب کے متعلق صرف اتنا علم ہوا ہے کہ وہ کن کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ان تک رسائی کی کوشش جاری ہے۔ جب کہ کچھ ابھی تک مفقود ہیں، مختلف تصنیفات میں ان کے صرف نام ملتے ہیں۔ جب کہ شیخ وجاہت کے شاگرد، آپ کے حکم پر درگاہ شریف حاضری دے چکے ہیں، وہاں کے مکتبہ کی اور درگاہ کی تصاویر بھی بھجوائیں گئیں، وہاں موجود آپ کی کتب دیکھنے سے معلوم ہوا کہ آپ نے تفسیرِ قرآن بھی تصنیف فرمائی ہے۔ محکمہ اوقاف انڈیا کے زیر انتظام یہ کتب خانہ حیدرآباد دکن میں موجود ہے۔ خدائے محمد ﷺ اہلِ بیتِ اطہار کے محبین کو یہ توفیق ارزانی کرے کہ وہ نہ صرف ان کتب کی فہارس کی ترتیبِ نَو پر جدید تقاضوں کے مطابق کام کریں۔ بلکہ ان کی جملہ تصانیف کی طباعت وحفاظت کی ذمہ داری بھی احسن انداز سے پوری کریں۔ امید ہے کہ محکمہ اوقاف بھی اس سلسلے میں اپنا تعاون پیش کرے گا۔ کیوں کہ یہ ایک علمی و تحقیقی تعاون ہے۔

الفقہ الاکبر عن اھل البیت الاطھر

الشیخ الحافظ خواجہ حسن الزمان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ علومِ اہل بیت کو جمع فرمانا ہے، اس کتاب کو ۱۹ مزید حصّوں میں تقسیم فرمایا اور اس کا حجم ۱۹ سے بھی کہیں زیادہ جلدوں پر محیط ہے، اس کے متعلق کچھ کتب میں یہ روایت ملی کہ یہ ۲۴ جلدوں پر مشتمل ہے، مگر مطبع دکن سے چھپی۔ پہلی جلد کے ناشرین نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ علومِ اہل بیت کی ۱۹ کتب میں سے بعض کتب ایک ایک، بعض دو، دو، تین تین یا چار اور پانچ جلدوں پر بھی مشتمل ہیں۔ واللہ اعلم بصواب

---

[21] خواجہ حسن الزمان کی خدماتِ حدیث سے متعلقہ کتب کی جانب توجہ دلوانے میں اہم کردار جناب حسن نظامی اور وجاہت حسین الحنفی کا ہے، الحمد للہ ان شخصیات کے ذوقِ تحقیق کی بدولت حضرتِ حسن الزمان کی کتب کو سامنے لانے، ترجمہ کرنے، تخریج کرنے اور شروحات لکھنے کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔

"فقہ الاکبر" اور "اُصول الروایۃ" اسی بڑی کتاب "علومِ اہل بیت" کا حصہ ہیں۔ خواجہ صاحب نے پہلی کتاب "فقہ الاکبر" کے مقدمہ میں اس پوری کتاب کی تقسیم یوں بیان فرمائی ہے۔

۱۔ "کتاب الایمان" ہے جس کا نام "الفقہ الاکبر عن اہل البیت الاطہر" ہے، (جس میں عقائد اہلِ سنت کا مفصل بیان ہے)

۲۔ "کتاب العلم" ہے جو "اصول روایۃ العلم عن اہل بیت مدینۃ العلم" کے نام سے موسوم ہے (یہ روایتِ حدیث کے متعلق ہے۔)

۳۔ "اصول الدرایۃ عن اہل بیت الہدایۃ" ہے (اس میں اصولِ درایت کا بیان ہے۔)

۴۔ "کتاب اصول المسائل عن اہل بیت الفضائل" (جمیع مسائل سے متعلق)

۵۔ "کتابِ فقہ الاسلام عن اہل بیت النبوۃ الاعلام" (بالخصوص مسائل فقیہہ کے بیان میں۔)

۶۔ "کتاب قرات القرآن عن اہل بیت الذکر والاتقان"۔

۷۔ "کتاب علوم القرآن عن اہل بیت النبوۃ والعرفان"۔

۸۔ "کتاب انباء العالم عن آلِ النبی المکرم ﷺ ہے" (بطور سیر، تمام عالم کے اَخبار سے متعلق)

۹۔ "کتاب الحکمۃ والموعظۃ عن اہل بیت الفطرۃ والمعرفۃ" (مواعظ ونصائح)

۱۰۔ "کتاب الادب عن اہل بیت النبی المودب ﷺ" (آداب)

۱۱۔ "کتاب الطب عن اہل بیت الحب ﷺ"۔

۱۲۔ "کتاب الادعیۃ والاذکارِ عن اہل بیت الاطہار" (اس کا لقب صحیفہ فاضلہ ہے، اہل بیت کے اوردو واذکار سے متعلق)

۱۳۔ "کتاب فقہ الاحسان عن اہل بیت الحکمۃ والعرفان" (علومِ معرفت)

۱۴۔ "کتاب آیات النبوۃ عن رایات الفتوۃ" (معجزات کا بیان)

۱۵۔ "کتاب جوامع الاخبار والآثار عن اہل البیت الاخیار"۔

۱۶۔ "كتاب الصحف المطهرة العلوية للحضرة الموقرةالعلوية" (حضرت علی المرتضیٰ کے مکتوب مبارک)

۱۷۔ " كتاب اصول العربية المحصول من الحضرة العلويه" (صرف ونحو کے قوائد، دیگر لغات واشعار)

۱۸۔ "الکتب والخطب عن اہل بیت علو الرتب" (اہل بیت کے خطوط و خطبات، اسے آپ نے "منہاج البلاغہ" کا نام دیا ہے)

۱۹۔ "معرفۃ الرجال الرواۃ عن اہل بیت الکمال (اہل بیت سے احادیث روایت کرنے والے راویوں کا تفصیلی بیان)۔[۲۲]

وجۂ تالیف:

اس کتاب کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے صرف اہل بیت کی روایات کو جمع فرمایا ہے، تمام تر علوم اہل بیت کی روایت کردہ احادیث سے ثابت کیے ہیں۔ لہٰذا آپ خود مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ مجھ تک یہ اعتراض واضح طور پر پہنچتا رہتا ہے جو الزام اہل تشیع، اہل السنہ پر لگاتے ہیں یعنی (ہم پر ان کا اعتراض یہ ہے کہ) ہم نے صحابہ و تابعین کو تھام کر آئمہ اہل بیت کی راہ کو چھوڑ دیا ہے اور ان سے کنارہ کش ہو گئے ہیں، مگر غور کیا جائے تو حضرت علی علیہ سلام کے حقیقی پیروکار، اہل السنہ ہی ہیں۔ اور مولا علی کے علم کا جتنا ذخیرہ اہل السنہ کے پاس ہے اس کا بہت ہی کم حصہ دوسروں کو میسر ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ تمام تر اہل بیت تو در حقیقت صحابی بھی تھے اور تابعین بھی تھے تو کیسے کہا جاسکتا ہے کہ صحابی کی پیروی کرنے والا آئمہ کا پیروکار نہ ہو گا؟

اس کے بعد آپ نے کچھ کتب کا حوالہ دینے کے بعد فرمایا کہ اہل سنت کے پاس اہل بیت کا بہت بڑا ذخیرہ علما و عُملا محفوظ ہے جو معتبر و مستند ہے، لہٰذا آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے علوم کو جو اہل بیت سے مروی اور اہل السنہ کی کتب میں موجود ہیں۔ جمع فرمادیا۔ آپ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مختلف اکابرین و اسلاف و مشہور لوگوں سے روایات لینے کے بعد جو حدیث پر حکم لگانے کا کام ہے وہ اہل السنہ کے اصولوں کے مطابق کیا ہے۔ پھر مقدمہ میں اپنے طریقہ کار کو مفصل بیان فرماتے ہیں، کہ کس طرح کی روایات کی تخریج کی ضرورت پیش آئے گی وغیرہ۔

مثال: اول الذکر کتاب الفقہ الاکبر صفحہ ۹۲۔۹۷ میں فرماتے ہیں۔

روایت کیا ابن اسحٰق نے، ان کی جہت سے یعقوب بن ابراہیم دورقی نے۔ پھر ذکر کیا امام دارمی، امام احمد اور امام ابویعلیٰ نے اپنی مسانید میں، ابن جریر نے "تہذیب الآثار" میں، اور خطیب نے اپنی تاریخ میں عبید اللہ بن ابی رافع سے، وہ اپنے باپ سے اور وہ مولا علی علیہ اسلام سے روایت کرتے ہیں کہ بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "اگر اپنی امت کو مشقت میں ڈالنا مجھ کو ناگوار نہ ہوتا تو میں انھیں ہر نماز کے وقت مسواک کے لیے اور ثُلثِ شب تک نمازِ عشاء کی تاخیر کے لیے حکم کرتا۔ کیوں کہ جب رات کا ایک ثُلث گزر جاتا ہے تو باری تعالیٰ آسمانِ دنیا کی طرف (رحمت کا نزول) فرماتا ہے اور طلوعِ فجر تک وہاں جلوہ گر رہتا ہے، پھر منادی پکارتا ہے کہ کیا ہے کوئی مانگنے والا کہ اس کو دیا جائے، ہے کوئی دُعا کرنے والا کہ قبول کی جائے، ہے کوئی بیمار جو شفاء چاہتا ہو اس کو شفاء دی جائے، ہے کوئی گنہگار جو بخشش چاہتا ہو کہ اس کی مغفرت کی جائے"۔ اور ابویعلیٰ کی روایت میں "الاسائل یعطی" والا جملہ ذکر نہیں۔ اس

---

[۲۲] حسن الزمان محمد چشتی، الفقہ الاکبر، ط: حیدرآباد دکن، مطبع عزیز دکن، ۱۳۱۴ھ۔ ج: ۱، ص: ۱۲۔۱۴

حدیث کو ابو ہریرہ نے بھی روایت کیا، چناچہ ابنِ اسحٰق، ان کی جہت سے ابنِ دروقی، دارمی، عبد الرزاق، احمد، ابن نصر و ابی یعلیٰ و ابنِ جریر نے بھی ذکر کیا ہے۔ اور امام مسلم نے بھی (صرف ذکرِ نزول)۔

پھر خواجہ صاحب امام الصابونی کی علی المرتضیٰ سے اسی سے متعلق ایک اور روایت بھی لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اس کو امام مالک نے یحییٰ کی روایت میں ذکر کیا جس کو امام مسلم نے لکھا، اور القعنبی کی روایت میں جس کو ابوداود نے لکھا، بقیہ ائمہ ستہ و دارمی و ابویعلی و صابونی نے بھی طرقِ کثیرہ کے ساتھ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی لیا۔ پھر فرماتے ہیں کہ اس کو جبیر بن مطعم عبادہ بن الصامت، جابر، عبد اللہ بن مسعود، ابو الدرداء، ابنِ عباس، عائشہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنھم نے بھی روایت کیا جس کو صابونی وغیرہ نے ذکر کیا، اور نسائی و ابنِ ماجہ نے ابو ہریرہ سے "حتیٰ يطلع الفجر" کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔ الغرض ہر شب کے متعلق متعدد احادیث ہیں جن کا ذکر طویل ہو گا۔

پھر اس کی ثقاہت بیان کرنے کے بعد دو' روایات میں تطبیق کے اقوال ذکر فرماتے ہیں اور پھر مختلف کتب سے شعبان کی نصف رات میں نزول والی روایات اکٹھی کر کے فرماتے ہیں کہ یہ ابو بکر ابن عبد اللہ بن محمد المدنی کے باعث ضعیف سمجھی جاتی ہیں، ان پر احادیث گھڑنے کا گمان کیا گیا ہے۔ اور فرماتے ہیں ظاہر یہ ہے کہ یہ گمان ایسی ہی حدیث کی وجہ سے ہو گا۔ اور مخفی نہ رہے کہ اس حدیث کے شواہد بہت ہیں، چناں چہ ابو بکر (قاضی)، عائشہ، معاذ، ابو ثعلبہ، ابنِ عمر، ابو موسیٰ، عثمان بن ابی العاص، راشد بن سعد و ابو ہریرہ رضی اللہ عنھم بھی اس کے راوی ہیں۔ اور ثقات کی بڑی تعداد پر صرف اس وجہ سے جرح کی گئی ہے کہ وہ احادیثِ صفات بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد خواجہ حسن الزمان ابو بکر راوی حدیث کی تعدیل اور دیگر اسناد ذکر کرتے ہیں۔

راقم عرض کرتا ہے کہ مختصر تحریر کے لیے نہ تو مکمل تخریج جو خواجہ نے فرمائی نقل کی جا سکتی ہے' نہ ہی اس تخریج کا تعاقب کیا جا سکتا ہے، جو کہ کئی صفحات کو گھیر سکتا ہے اور ایک الگ رسالہ کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ لہٰذا فقط یہ بتانے کی خاطر کہ خواجہ جی کس درجہ علوم کو جاننے والے، رِجال حدیث پر گہری نظر رکھنے والے تھے قاری کو کچھ حد تک اندازہ ہو جائے یہاں ایک حدیث نقل کر دی گئی۔

القول المستحسن شرح فخر الحسن

یہ کتاب علامہ فخر الدین دہلوی نظامی کی تصنیف "فخر الحسن فی سماع الحسن" (جو کہ شیخ ولی اللہ دہلوی کے قول کے رَد میں اور اس ثبوت میں لکھی گئی کہ امام حسن بصری کی حضرت علی المرتضیٰ سے سماع موجود ہے) کی شرح ہے۔ خواجہ حسن الزمان نے یہ کتاب بھی باقی تمام تصنیفات کی طرح عربی زبان میں لکھی ہے اور یہ بغیر ترجمہ کے مطبع عزیز دکن سے شائع ہوئی، اس کی ۱۳۱۲ھ میں اشاعتِ دوم ہونے والے نسخہ کی نقل بہ آسانی دستیاب ہے۔ شیخ ممدوح فرماتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ کے حق میں کچھ معترضین نے فخر الحسن کا رَد کیا تو شیخ حسن الزمان نے اس کا تعاقب کیا۔ اور مزید دو کتب "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین" اور "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ

الخلافاء" کی ابحاث کارَد کرتے ہوئے واضح فرمادیا کہ مذکورہ دونوں کتب ایک ہی مرکز کے گرد گھومتی ہیں، اور ان کے منہج کا ماخذ، ابنِ تیمیۃ ہے۔ خواجہ نے ان کے متعلق خود بھی یہ الفاظ بیان فرمائے۔

"وصاحب القرة راكب سنن ابن تيمية حذو النعل بالنعل ويترقى فى الفعل والجمل۔"[۲۳]

شیخ ممدوح نے اس کتاب پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، بے شمار فوائد حدیثیہ کی نشاندہی کی ہے اور ایسی تحقیقات وعبارات کی طرف اشارہ کیا جو کہ ایک ہندی محدث کے علم میں ہونا حیران کن ہے جیسا کہ خواجہ صاحب اسی کتاب کے صفحہ ۱۵۱ پر یہ رائے پیش کرتے ہیں کہ امام سیوطی کچھ مقامات پر امام ابنِ حجر پر سبقت لے گئے اور ابنِ حجر کچھ مقامات پر سیوطی پر سبقت لے جاتے ہیں۔ خواجہ حسن الزمان نے " حديثِ طير"، "غدير خُم" ،" حديثِ موالاة "و دیگر بے شمار احادیث کو اس کتاب میں اپنا موضوع بنایا۔ اُن کی بے شمار روایات اکٹھی فرمائیں، رِجال پر حکم لگایا اور امام حسن بصری کے سماع پر دلائل دیے۔

حافظ العصر اور اہلِ ہند کی چشم پوشی

تیرہویں صدی وچودھویں صدی ہجری محدثین سے خالی نہیں، عرب و عجم نے اس دور میں بہت علمی کام کیا، اسی وقت میں خواجہ حسن الزمان نے بھی تحریری خدمات پیش کیں، مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ آپ کی تصنیفات منظر عام پر کیوں نہ آئیں؟ اہلِ زمانہ نے آپ کے گُن کیوں نہ گائے؟ حالاں کہ ہند میں تو اس علمِ حدیث کی جتنی شدت سے ضرورت تھی، جس نے کوئی ترجمہ کر دیا یا حاشیہ لکھ دیا وہ بھی شیخ الحدیث کے مقام کو چُھونے لگا۔ تو اس کا جواب بھی، خواجہ صاحب کے اپنے شاگرد ابوالخیر احمد المکی اور شیخ ممدوح نے دیا ہے۔

یہ صاحبان فرماتے ہیں کہ خواجہ صاحب ہند میں اس وقت پیدا ہوئے جب بنا تحقیق صرف تقلید و نقل کا دور دورہ تھا، ہند میں دو مخالف نظریات حنفیہ و وہابیۃ پروان چڑھ رہے تھے، اس وقت میں آپ نے ناقل بن کر نہیں لکھا اور ان کی تحریر زمانے سے بے خوف ہو کر لکھی گئی ہیں، نقل پر اڑ نہیں گئے بلکہ جو تحقیق سے ثابت کیا وہی دُنیا کے سامنے لے آئے۔

ایک بات جس نے آپ کو مفقود رکھا وہ ناقلین کی مخالفت کرنا تھا، یعنی اگر ناقلین شاہ ولی اللہ کی اس بات کو حرفِ آخر سمجھ بیٹھے کہ حسن بصری کا سماع ثابت نہیں تو اب اسی کو تسلیم کر لینا ہے جب کہ آپ نے اس کارَد لکھا۔ دوسری بڑی وجہ مشہور نہ ہونے کی یہ لکھی کہ ان کا تعلق کسی بڑے، دیوبندی، سہارنپوری یا پھر ابنِ تیمیہ کے نظریات کی عکاسی کرنے والے خاندان کے ساتھ نہ تھا، اس وقت ہند میں ابنِ تیمیہ کے نظریات پروان چڑھنے لگے تھے اگر اس سوچ سے تعلق ہوتا تو خواجہ صاحب کی فضیلت کا ڈھنڈورا سارے عرب و عجم میں پیٹا جاتا اور ان کے گُن گائے جاتے، ان کی تحقیقات کو سامنے لایا جاتا، اس پر مضامین لکھے جاتے۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ

---

[۲۳] حسن الزمان، القول المستحسن، طبع الثانیۃ، حیدر آباد دکن: مطبع عزیز، ۱۳۱۲ھ، ص: ۲۳۲۔ وایضا: محمود سعید ممدوح، ج:۳، ص: ۱۹۱۔

خواجہ حسن الزمان نے ان مخصوص نظریات کے بجائے ساری زندگی اہلِ بیت کے فضائل بیان کرنے اور ان کے علوم کو ظاہر کرنے میں گزار دی۔ اور یہ ثابت شدہ ہے کہ اسلام کی تاریخ میں کسی نے بھی عقائدِ اہل السنہ کو فقط اہلِ بیت سے ثابت نہیں کیا مگر اہل السنہ کو اہل بیت سے جوڑ دینے کا سہرا صرف خواجہ کے سر ہے اور یہ علمی کارنامہ دُنیا یاد رکھے گی۔

ابوالخیر نے خواجہ صاحب کے کچھ مزید شیوخ، کتب اور طلبِ علم کے لیے "رحلۃ" کا ذکر فرمایا، ساتھ ہی وہ لکھتے ہیں کہ "الفقہ الاکبر" لکھنے کی وجہ سے ان پر تشیع ہونے کا الزام بھی لگا۔ مولوی محمد شاہ قمیصے نے خواجہ صاحب کی دو کتب "الفقہ" اور "القول المستحسن" کا رَد لکھا اس بات کو شیخ عبدالحی نے بیان کیا۔ ان میں سے ایک کتاب مجھے شیخ کی وساطت سے ملی جس کا نام "احسن الذریعۃ" ہے، اس پوری کتاب کا لبِ لباب یہ ہے کہ خواجہ حسن الزمان نے امام ابو حنیفہ کو چھوڑ کر اپنی فقہ ثابت کی، اور شیعہ کی طرفداری کی۔ راقم الحروف احقر عرض کرتا ہے کہ خواجہ صاحب نے آئمہ اہلِ بیت سے جو فقہ ثابت کی وہ آپ کے اہل السنہ سے ہونے کا واضح ثبوت ہے، آپ کی اس گفتگو کا مختصر تذکرہ ہو چکا ہے۔ جس کی تفصیل کے لیے محبین ان کتب کی طرف رجوع کر سکتے ہیں جن کو ماخذ بنایا گیا ہے۔

آخر میں احقر عرض کرنا چاہتا ہے کہ ہمارے اسلاف کے متعلق دورِ حاضر میں جو الزام تراشی کرتے ہوئے فتنہ پھیلایا جا رہا ہے اس کے سدِّباب کی ضرورت ہے، جو بھی کسی بھی نسبت سے خواجگان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کو اس نسبت کا حق ادا کرنے کی کاوش میں زندگی صرف کرنی چاہیے۔ خواجگان جتنا ظاہری شریعت کے پابند تھے اس سے کہیں زیادہ اپنے باطن کو رَغبتِ دُنیا سے دور کر رکھا تھا اور عشقِ الٰہی کو ریاضت و مجاہدہ و علوم ظاہری و باطنی کے ساتھ عروج تک پہنچایا کرتے تھے، ہمیں ان کی پیروی کی ضرورت ہے، ہمیں نہ صرف خود قربِ خداوندی کی راہ کی طلب رکھنی چاہیے بلکہ اپنی اولاد و مریدین کو بھی اسی ایک نسبت کی خاطر خود سے جوڑے رکھنا چاہیے، یہ واحد ہی ہمارے مشائخ کا تفویض کردہ راہِ حق ہے۔ اللہ کریم حق کو ہم پر واضح فرمائے اور آنکھوں کو نورِ صداقت سے روشن فرمائے۔

مختلف المسالک چکڑالوی علما: مولانا عبد اللہ چکڑالوی کی آرا کا

تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر عطا المصطفیٰ مظہری☆

میانوالی سے جانبِ شرق تلہ گنگ جانے والی سڑک جھیل نمل کے مغرب سے گزر کر بن حافظ جی پر پہنچتی ہے تو یہاں شمال کی طرف دس کلو میٹر کے فاصلے پر چکڑالہ ایک نشیبی جگہ پر واقع ہے۔ چکڑالہ ایک بارانی نالہ کے کنارے واقع ہے۔ قدیم زمانے میں اس نالہ میں پانی جاری تھا۔ لوگ خود بھی پیتے جانوروں کو بھی پلاتے۔ چکڑالہ عرصہ قدیم سے علمی مرکز رہا ہے۔ یہاں ایسے علما بھی پیدا ہوئے جنھوں نے نئے افکار و نظریات کی بنیاد رکھی اور ایسے اصفیا بھی ہوئے جنھوں نے قدیم فقہی وصوفیانہ روایت کو "شرابِ کہن در جام نَو" کے مصداق نئی عصری جہت اور تعبیر مہیا کی۔ علما میں مولانا قاضی قمر الدین محدث چکڑالوی، مولانا قاضی کلیم اللہ، مولانا عبد اللہ چکڑالوی، مولانا ابراہیم چکڑالوی، مولانا سید محمد باقر شاہ، مولانا عنایت اللہ چشتی، مولانا پروفیسر حافظ محمد اجمل معروف ہوئے۔ صوفیہ میں خواجہ احمد خان ثانی میروی، پیر سید مقصود علی شاہ کوٹ گلوی اور مولانا اللہ یار خان زیادہ مشہور ہوئے۔ یہاں اکثر آبادی اعوانوں کی ہے۔

اس تحقیقی مقالہ میں چکڑالہ کے مختلف الخیال بعض علما و صوفیہ کے مختصر حالات ذکر کیے جائیں گے اور مولانا عبد اللہ چکڑالوی کے افکار و آرا کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

☆ مولانا ابراہیم چکڑالوی (م ۱۹۱۹ء)

ابراہیم بن عبد اللہ چکڑالوی ۱۸۷۰ء میں چکڑالہ ضلع میانوالی میں پیدا ہوئے ان کے والد مولوی عبد اللہ چکڑالوی، فرقہ اہلِ قرآن کے بانی تھے مگر مولانا ابراہیم نے ان کے نظریات کا ساتھ نہ دیا۔ مولانا ابراہیم نے علومِ مروجہ کی تحصیل ضلع ہزارہ کے مدارس و مساجد میں رہ کر کی، حدیث کی سند سید نذیر حسین دہلوی (م ۱۳۲۰ھ) سے حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہو کر خان گڑھ ضلع مظفر گڑھ آ گئے۔ چند ماہ یہاں مقیم رہ کر غازی پور (ملتان) منتقل ہو گئے۔ آخر میں جلال پور پیر والہ میں سکونت پذیر تھے کہ ۱۷ اگست ۱۹۱۹ء کو وفات پائی۔[1]

☆خواجہ احمد خان ثانی میروی (م ۱۹۳۱ء)

مولانا احمد خان بن محمد پناہ چکڑالہ ضلع میانوالی میں ۱۸۷۰-۷۱ء میں پیدا ہوئے۔ آپ اعوان قبیلہ کی جدھال شاخ سے

☆ محقق و دانشور، میانوالی

تعلق رکھتے تھے۔ والد کا سایہ بچپن میں سر سے اُٹھ گیا۔ والدہ نے قرآنِ مجید پڑھانے کے لیے حافظ محمد عبداللہ صاحب کے پاس داخل کرا دیا۔ استادِ محترم میرا شریف سے نسبت رکھتے تھے۔ زیارت کے لیے پیدل میرا شریف چلے گئے۔ حضرت ثانی کا دِل بے چین ہوا اور قسمت انھیں کھینچ کر میرا شریف لے گئی۔ قطبِ زماں حضرت خواجہ احمد میروی کی زیارت کے ساتھ ساتھ اپنے استاد سے قرآن بھی حفظ کرتے رہے اور چھ مہینے کے بعد گھر واپس آئے، لیکن دِل میرا شریف ہی چھوڑ آئے۔ چند دنوں بعد دوبارہ والدہ کے ہمراہ حاضر ہوگئے۔ حضورِ اعلیٰ نے فرمایا بیٹے تعلیم حاصل کرو۔ والدہ سے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس بچے سے بڑا کام لینا ہے تم گلہ بانی کے لیے کوئی اور انتظام کرو۔ یہ بچہ میرا شریف میں ہی تعلیم حاصل کرے گا۔ حفظ کے بعد "صَرف" کی تعلیم کے لیے کھیوال ضلع جہلم تشریف لے گئے۔ فنون کی تکمیل کے لیے بدھو، ہری پور، گڑھی شریف کے سفر اختیار کیے۔ تکمیلِ علوم کے بعد میرا شریف حاضر ہو کر حضرت خواجہ احمد میرویؒ کے دستِ حق پر بیعت ہوئے اور اجازت لے کر چکڑالہ واپس آگئے لیکن والدہ کے انتقال کے بعد دِل اُچاٹ ہو گیا، سب مال و اسباب چچا کے سپرد کر کے میرا شریف اقامت پذیر ہوگئے۔

آپ نے جملہ منازلِ سلوک اپنے پیر و مرشد کی نگرانی میں طے فرمائے۔ پیر کی پیروی میں چچا کی بیٹی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا اور شیخ کی خدمت کو اپنا مطمع نظر بنا لیا۔ خلوصِ دل نے کام دکھایا حضور اعلیٰ نے لنگر و زمینوں کی نگرانی کے لیے آپ کو انچارج بنا دیا۔ لنگر کے حسن و انتظام اور طلبا و درویشوں کی خدمت گذاری نے آپ کی روحانیت کو چار چاند لگا دیئے۔ معمر خلفا مولانا جلال الدین بلوچ جُھگی والے مولانا امیر احمد سیالوی، سید احمد شاہ صاحب جھنگوی، پیر فتح شاہ صاحب کے ہوتے ہوئے حضورِ اعلیٰ نے حضرت ثانی کو اپنا قائم مقام نامزد فرما دیا اور اپنی وفات سے قبل سوموار ۲۷ ذوالحجہ ۱۳۲۹ھ کو تحریری وصیت نامہ کے ذریعے سجادگی بھی سپرد فرما دی:

این سعادت بزورِ بازو نیست
تانہ بخشدِ خدائے بخشندہ

آپ نے اپنے شیخ کی عطا کردہ امانت کو خوب پروان چڑھایا، سلسلہ درس و تدریس منظم فرمایا۔ سینکڑوں طالبانِ حق دربار میں مقیم رہ کر واصل باللہ ہوئے۔ آپ نے قرآنِ مجید کے حفظ کے لیے سات درس اور درسِ نظامی کی تعلیم کے لیے دو درس قائم فرمائے۔ طالبانِ حق کی تعداد علیحدہ قیام پذیر رہا کرتی تھی بہ یک وقت سات سو طلبا بھی زیر تعلیم رہے۔ ان کی جملہ ضروریات لنگر سے پوری ہوتی تھیں۔ حضرتِ ثانیؒ کے حسنِ انتظام نے دربار کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ میرا شریف باوجود دور افتادہ پہاڑی ہونے کے تشنگانِ طریقت و معرفت کی ایک بہت بڑی تربیت گاہ بنا۔ حضرت مولانا محمد اکبر اعلیٰؒ سے حضرت ثانی کا تعلق دو گونہ تھا۔ حضورِ اعلیٰ کے ناطہ سے پیر بھائی اور کسبِ فیض کے لحاظ سے مرادِ ثانی تھے۔ روحانی رابطہ اتنا مضبوط تھا کہ جب ضرورت ہوتی خواب میں بُلا لیتے اور "چھب" ریلوے اسٹیشن پر سواری بھی ارسال فرما دیتے۔ اپنے انتقال سے پہلے حضور اعلیٰ کی امانت سپرد کرنے کی خواہش کا اظہار فرمایا

لیکن مولانا محمد اکبر علیؒ نے یہ بارِ گراں اُٹھانے سے معذرت کی۔ عرض کی میرا شریف کا لنگر مجرد لوگوں کی امانت ہے میں عیال دار آدمی ہوں۔ بال بچوں کو کھلا کر مجرم نہیں بننا چاہتا۔

تقاضا اس طرح جاری رہا آخر رمضان المبارک ۱۳۴۹ھ کو ایک تحریری وصیت نامہ اپنے خلیفہ عبدالرحیم پشاوری سے لکھوایا اور انھیں حکم دیا کہ وفات کے بعد یہ امانت میانوالی پہنچا دینا۔ اس طرح حق بحق دار رسید والا معاملہ برحق ہوا۔

حضرت ثانی کا جسم وظیفۂ انفاس کی وجہ سے کمزور ہو گیا۔ وظیفہ انفاس آپ کا آخر تک معمول بنا رہا۔ ایک مہینہ استغراق کی حالت میں گزرا۔ نماز باجماعت کے لیے آپ کی چارپائی مسجد میں صفوں کے برابر لائی جاتی۔ نماز ادا فرما کر پھر استغراق میں چلے جاتے۔ آخر کار ۲۱ صفر المظفر ۱۳۵۰ ہجری دارِ فنا سے دارِ بقا کی طرف کوچ فرما گئے۔ آپ کا مزارِ مقدس حضرت خواجہ میروی حضور اعلیٰ کے پہلو میں بنایا گیا۔

وصیت نامہ

حضرت خواجہ مولانا احمد خان ثانی، سجادہ نشین میرا شریف، ضلع اٹک

بر جملہ پیر بھائیاں معلوم باد کہ مارا بذریعہ وصیت نامہ مورخہ ۲۷ ذوالحجہ ۱۳۲۹ ہجری حضرت احمد میرویؒ قائم مقام خود کردہ وکارِ لنگر ہر قسم سپردِ من فرمودہ 'چونکہ عمر ناپائدار است وضعفِ بدنی روز بروز افزان است سجادگی ایں لنگر موروث نیست مولوی محمد اکبر علی کہ بصحبت خواجہ میروی باریاب است وازیں جانب مجاز گشتہ است۔ عالم جامع درکار لنگر واقع است ومارا اُمیدِ قوی است درکارِ کردگی ایشاں ترقی سلسلہ خواہد شُد۔ با اثبات ہوش وحواس اور قائم مقام خود متولی لنگر میرا شریف بعد خود کردہ ام۔ مولوی فقیر عبد اللہ کہ برادر زادہ است اور پنج روپیہ ماہواری ومیاں حاجی احمد دربانِ قدیمی و خادم ایں جا است سہ روپیہ ماہوار بشرطِ اقامت در لنگر جاری دارند وخرچ وخوراک ہم چوں دیگر درویشاں ہر دو 'را باشد۔ ومالِ وقف شدہ از قسم اراضی چاہی وغیرہ ودیگر ہائے وکتب ہائے موافق وصیت حضورِ میرویؒ فقیرانِ لنگر میرا شریف باشد۔

بعد ادائے قرضۂ لنگر وخرچ جنازہ وگور وکفن ہر مال کہ باقی ماند باتولیت ایشاں باشد۔ بر ایشاں لازم باشد کہ خدمتِ درویشان وسلسلہ درس وتدریس جاری دارند تا کہ درویشان بہ دروازہ دُنیاداران نہ روند وباشغلِ علومِ دینیہ وذکر وفکر مشغول باشد۔ لہٰذا وصیت نامہ ہٰذا روبروئے گواہانِ معتبراں تحریر ونمو شد۔[۲]

الرقوم: ۱۸، رمضان المبارک ۱۳۴۹ھ،

العبد: فقیر احمد خان بقلم خود

☆ مولانا اللہ یار خان (م ۱۹۶۴ء)

۱۹۰۴ء میں چکڑالہ میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ اَمینیہ، دہلی میں جناب مفتی کفایت اللہ مرحوم سے دورہ حدیث مکمل کیا۔ ابتدا میں شیعہ حضرات کے رَد میں کتابیں بھی لکھیں اور مناظرے بھی کیے اس موضوع پر انھیں ماہرانہ دسترس حاصل تھی۔ ابتدا سے ہی سلسلہ نقشبندیہ سے منسلک ہوئے پھر نسبتِ اویسیہ میں ترقی کرتے ہوئے اپنے دور کے شیخ سلسلہ بنے۔ آپ کے مرید پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ آپ کا قائم کردہ مرکز دارالعرفان ایک بین الاقوامی تعلیمی اور تربیتی مرکز بن گیا۔ ان کی یاد میں "المرشد" کے نام سے ایک ماہنامہ بھی جاری کیا گیا ہے جو دینی مقالات کا خزانہ ہوتا ہے۔ مولانا ۱۹۶۴ء کو چکڑالہ میں فوت ہوئے۔ بیس سے زائد کتابیں آپ کی یادگار ہیں۔[۳]

مولانا اللہ یار خان کی چند مشہور مطبوعہ کتب:

(۱) دلائل السلوک (۲) حیات النبی ﷺ (۳) حیات برزخیہ (۴) اسرار الحرمین

(۵) علم وعرفان (۶) عقائد وکمالاتِ علمائے دیوبند (۷) سیفِ اویسیہ

(۸) تفسیر آیاتِ اربعہ (۹) الدین الخالص (۱۰) ایمان بالقرآن

(۱۱) تحذیر المسلمین عن کید الکاذبین (۱۲) تحقیق حلال وحرام (۱۳) شکست اعدائے حسین

(۱۴) دامادِ علی (۱۵) بناتِ رسول ﷺ (۱۶) الجمال الکمال (۱۷) حیاتِ طیبہ

☆ پروفیسر مولانا میاں محمد اجمل (۱۹۳۰-۱۹۸۴)

پروفیسر مولانا میاں محمد اجمل مذہباً حنفی، مشرباً چشتی، نسبتاً تونسوی اور وطناً ڈُھرنکوی و چکڑالوی تھے۔ آپ کے نانا قاضی کلیم اللہ چکڑالوی حضرت قاضی قمر الدین محدث چکڑالوی (م ۱۹۰۹) کے داماد اور جانشین تھے۔ پروفیسر صاحب نے درسیات کی تکمیل حسبِ ذیل فاضل واکابر علما سے کی۔

(۱) استاذ العلما قاضی کلیم اللہ چکڑالوی (۲) امام المناطقہ علامہ عطا محمد بندیالوی

(۳) شیخ الحدیث علامہ غلام فخر الدین گانگوی (۴) مولانا خواجہ محمد اکبر علی چشتی میروی

(۵) حضرت مولانا ولی اللہ (۶) مولانا رسول خان ہزاروی

آپ کو علامہ عطا محمد بندیالوی کے اجلہ تلامذہ میں شمار کیا جاتا ہے اور آپ علامہ بندیالوی کی ابتدائی کلاس کے طلبا میں شامل تھے۔ مولانا اللہ بخش واں بھچروی آپ کے ہم درس تھے۔ بیعتِ روحانی سلسلہ چشتیہ نظامیہ سلیمانیہ میں حضرت خواجہ حافظ سدید الدین تونسوی سے تھی۔ حضرت مولانا الشاہ ضیاء الدین احمد مدنی سے بھی ارادت رکھتے تھے۔ مشائخ میں حضرت خواجہ محمد صدیق بھوروی، خواجہ قمر الدین سیالوی، خواجہ درویش محمد تونسوی اور پیر سید علی حسین شاہ نقش لاثانی سے خصوصی نیاز مندی رہی۔ طبقہ علما میں مولانا محمد ذاکر (جامعہ محمدی شریف جھنگ) مجاہدِ ملت مولانا عبد الستار خان نیازی، علامہ سید محمود احمد رضوی، خواجہ غلام جیلانی، مفتی

محمد حسین نعیمی، مولانا محمد علی نقشبندی (جامعہ رسولیہ شیرازیہ)، مولانا سعید احمد مجددی، مولانا محمد عالم سیالکوٹی، ابوالفتح مولانا اللہ بخش واں بھچروی سے تعلقات رہے۔

۱۹۶۰ء میں جامعہ پنجاب سے ایم اے عربی کا امتحان دیا۔ صوبہ بھر میں سیکنڈ پوزیشن حاصل کی۔ ۲۲ جنوری ۱۹۶۱ء میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبہ عربی کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ بھی رہے۔

سیاست میں جمعیت علما پاکستان کے ساتھ وابستہ رہے۔ علاقائی سیاست اور علما میں آپ کے وقار کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مجاہدِ ملت مولانا عبدالستار خان نیازی نے ڈُھرنکہ جلسے میں برملا کہا تھا کہ نواب آف کالا باغ کے جبر واستبداد کا مقابلہ کرنے کے لیے میں جس شخص کو اپنا متبادل سمجھتا ہوں وہ پروفیسر حافظ میاں محمد اجمل ہیں۔ اگر یہ اس علاقے سے بطورِ اُمیدوار قومی اسمبلی کھڑے ہو جائیں تو ان کے علم وفضل کی وجہ سے میں ان کے حق میں بیٹھ جاؤں گا۔

آپ علم وفضل کے اعتبار سے علما میں ایک امتیازی وقار کے حامل تھے۔ مولانا اللہ بخش واں بھچروی آپ کے علم وفضل کے معترف تھے۔ ہر سال میلاد النبی ﷺ کے پروگرام میں باقاعدگی سے شرکت فرماتے۔ صاحبزادہ محمد عبدالمالک چشتی نظامی نے راقم السطور کو بتایا کہ انھوں نے اپنی زندگی کی پہلی تقریر پروفیسر صاحب کے روبرو ڈُھرنکہ میں کی تھی۔ صاحبزادہ صاحب مولانا اللہ بخش واں بھچروی کے تلمیذِ رشید ہیں۔ مولانا واں بھچروی نے ہی تقریر کا حکم دیا اور ساتھ فرمایا کہ تقریر اچھی طرح تیار کرنا۔ پروفیسر صاحب بھرپور فاضل ہیں ان کے سامنے کوئی غلطی نہ ہونے پائے۔ حضرت مولانا حافظ صاحب کا وصال ۱۹۸۴ء میں ہوا اور تدفین آبائی علاقہ ڈُھرنکہ میں ہوئی۔

☆سید باقر چکڑالوی (م ۱۹۶۶ء)

مولانا سید محمد باقر بن گل محمد شاہ نقوی سادات سے تھے۔ ان کا خاندان چکڑالہ ضلع میانوالی کے معزز محترم خانوادوں میں سے ایک ہے۔ سید محمد باقر ۷ اجولائی ۱۸۸۲ء کو پیدا ہوئے۔ پرائمری تعلیم کے بعد صرف ونحو اپنے بھائی سید طالب حسین شاہ اور والد بزرگوار سے پڑھی۔ مولانا عبداللہ چکڑالوی کے فرزند مولانا محمد یحییٰ سے کافیہ، شرح جامی اور منطق کے بعض رسائل پڑھے۔ اس کے بعد ملتان گئے اور مولوی سید علی نقی سے اکتسابِ فیض کیا۔ مولانا شریف حسین جگراؤں کے ممتاز شیعہ عالم تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اسباق کے لیے کچھ عرصہ لکھنو میں بھی مقیم رہے۔ دینی علوم کی تکمیل کر کے واپس وطن آئے۔ ۱۹۰۹ میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان اعزاز سے پاس کیا اور طلائی تمغہ کے مستحق قرار پائے۔ اس کے بعد منشی فاضل کی سند حاصل کی۔

۱۹۱۴ میں وطن میں تعلیم وتدریس شروع کی۔ دس سال بعد چک ۳۸ کے اہلِ تشیع انھیں اپنے ہاں لے گئے۔ بیس برس تک اس علاقے کے شیعہ عوام کی اصلاح وتربیت میں مصروف رہے۔ ۱۹۴۴ء میں جھنگ چلے گئے اور درس وتدریس سے وابستہ ہوئے۔ ۲۹ مئی ۱۹۶۶ء کو بیمار ہوئے اور اپنی زمین واقع کھاڑو ضلع میانوالی چلے گئے۔ وہیں ۱۰ جون ۱۹۶۶ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔ مولانا سید محمد باقر بلند پایہ اور جید شیعہ عالم تھے۔ کتب درسی پر حیرت انگیز عبور رکھتے تھے۔ ان سے سینکڑوں افراد نے اکتسابِ علم کیا۔[۴]

☆فاتحِ قادیان مولانا عنایت اللہ چشتیؒ (م ۱۹۹۳)

مولانا عنایت اللہ چشتی اعوان قبیلے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے والد حافظ نور خان علاقے میں انتہائی معزز اور نیک سیرت انسان تھے آپ کی پیدائش ۱۹۰۰ء میں ہوئی ابتدائی تعلیم مقامی سکول میں حاصل کی۔

درسیات کی تعلیم کے لیے آپ میرا شریف چلے گئے۔ صرف و نحو کی ابتدائی تعلیم حضرت احمد شاہ ہمدانی اور مولانا صالح محمد (میرا شریف) سے حاصل کی اور اس کے بعد حصول علم کے لیے دور دراز علاقوں میں پھرتے رہے۔ منطق کی تعلیم کے لیے مولانا غلام رسول (اَنہی، ضلع گجرات) کے پاس جا پہنچے اور تعلیم حاصل کرتے رہے لیکن ایک واقعے کی وجہ سے وہاں سے تعلیم مکمل نہ کر سکے دراصل مولانا غلام رسول کی بیعت مولانا حسین علی ساکن واں بھچراں سے تھی اور اسی مقام پر مولانا حسین علی کا حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ سے ایک علمی مناظرہ ہوا۔ ایک انبوہِ کثیر "واں بھچراں" میں اکٹھا ہوا۔ واپسی پر طلبا نے استاذ کے پاس اَنہی (ضلع گجرات) پہنچ کر شکایت کی کہ ہمارا ایک طالب علم عنایت اللہ پیر صاحب گولڑہ شریف کے کیمپ یعنی مخالف کیمپ میں بیٹھا تھا۔ استاذ نے اس پر خفگی کا اظہار کیا اور درس چھوڑنے کو کہا۔ مولانا عنایت اللہ، مولانا حسین علی کے پاس آئے انھوں نے کاغذ کے پُرزے پر لکھ دیا کہ نیک لوگ عذر قبول کرتے تھے۔ استاذ نے شاملِ درس تو کر لیا لیکن توجہ میں خاصی کمی آ گئی۔ اس کے بعد آپ استاذ العلما حضرت مولانا یار محمد صاحب بندیالوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہاں سے اکتساب فیض کرنے کے بعد اجمیر شریف مولانا امجد علی خانؒ (مصنف بہارِ شریعت) کی خدمت میں حاضر ہوئے وہاں کچھ عرصہ ٹھہر کر دیوبند جا پہنچے۔

مولانا غلام رسول کی شاگردی کے حوالے سے وہاں داخلہ آسانی سے مل گیا لیکن بس ایک دو دن قیام کے بعد کوچ کر لیا۔ بالآخر جامعہ فتحیہ اِچھرہ، لاہور آ گئے پھر یہیں مستقل قیام کیا۔ دورۂ حدیث یہیں سے کیا۔ بعد فراغت مسجد شاہ چراغ مزنگ، لاہور میں خطیب مقرر ہوئے اور ساتھ ہی بطور مدرس بھی کام کرتے رہے۔ مولانا علی محمد مظاہری نے آپ کے متعلق لکھا۔ بڑے سادہ اور منکسر مزاج تھے۔ ۱۹۰۰ء میں چکڑالہ میں پیدا ہوئے۔ مختلف مقامات سے علمِ دین کی تحصیل مکمل کی۔ حزب الاحناف، لاہور سے فارغ التحصیل ہوئے۔ ان دنوں مرزائیت کا فتنہ عروج پر تھا۔ ردِّ مرزائیت کے لیے جمعیت الاحرار سرگرم عمل تھی۔ مولانا چشتی بھی بڑے شعلہ بیان مقرر تھے۔ احرار میں شامل ہو گئے اور اپنے آپ کو مرزائیت کے مرکز قادیان میں جا کر اشاعتِ اسلام کے لیے پیش کر دیا۔ اسی لیے انھیں فاتحِ قادیان کہا جاتا ہے۔ انھوں نے قادیان جا کر جس جرات اور پامردی سے مرزائیت کا مقابلہ کیا اس کا اعتراف چودھری افضل حق جیسے بڑے آدمی نے اپنی تصنیف "تاریخِ احرار" میں کیا اور انھیں فاتحِ قادیان کا لقب عطا کیا ہے۔

۱۹۴۰ء میں احرار کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور مجاہدانہ کردار ادا کیا۔ کافی عرصہ تک میرا شریف میں تدریس دین کا شغل رہا۔[۵]

سیاسی اور مذہبی خدمات کے حوالے سے آپ کے متعلق خالد علوی لکھتے ہیں کہ اُن دنوں لاہور میں برطانوی استعمار کے خلاف کانفرس، خلافتِ جمعیت علماء ہند اور مجلسِ احرار کے دھواں دھار جلسے ہو رہے تھے۔ انگریز دشمنی کا جذبہ مولانا کو کشاں کشاں ان

جلسوں میں لے جاتا۔ یہ ۱۹۲۷ء کی بات ہے کہ جب لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس دلیپ سنگھ نے گستاخِ رسول ﷺ راجپال (ہندو ناشر جس نے گستاخی پر مبنی کتاب شائع کی اور جس کو غازی علم الدین شہیدؒ نے جہنم واصل کیا) کو قانونی سقم کی آڑ میں رہا کر دیا تو برصغیر کے مسلمانوں میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ لاہور کے ڈپٹی کمشنر مسٹر اوگلوی نے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی۔ عطا اللہ شاہ بخاری نے احاطہ عبد الرحیم میں جلسہ کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ ادھر احاطہ کے دروازے پر پولیس کا پہرہ تھا۔ شاہ جی نے اس موقع پر جو تقریر کی اس سے متاثر ہو کر مولانا عنایت اللہ چشتی مجلسِ احرار میں شامل ہو گئے اور تبلیغی خدمات سرانجام دینے لگے۔ جب احرار نے تحریکِ کشمیر شروع کی تو مولانا ایک گروہ کے ساتھ کشمیر کی حدود میں داخل ہونے پر گرفتار کر لیے گئے۔

قادیان میں مولانا عنایت اللہ کی تبلیغی خدمات کا ذکر مفکرِ احرار چوہدری افضل حق کی زبانی سنئے۔

> جولائی ۱۹۳۵ء میں امرتسر میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ فیصلہ ہوا کہ جو ہو سو ہو۔ احرار کا قادیان میں مستقل دفتر کھولنا چاہیے۔ معلوم کیا کہ ہم میں کون ہے جو علم میں پورا اور عمل میں پختہ ہے۔ جو موت کی مطلق پروانہ کرے اور اللہ کا نام لے کر کفر کے غلبے کو مٹانے کے عزم سے اس جگہ اقامت اختیار کرے اور مرزائیوں کی ریشہ دوانیوں کی نگرانی کرے۔ خدا نے مولانا عنایت اللہ کو توفیق دی۔ وہ شادی شدہ نہ تھے اس لیے جماعت کو یہ غم نہ تھا کہ ان کی شہادت کے بعد کنبہ کا بوجھ اٹھانا ہے اور بچوں کی پرورش کا سامان کرنا ہے۔ غرض خطرات کے ہجوم میں مولانا کو یہ اہم فریضہ سونپا گیا۔ دارالکفر میں اسلام کا جھنڈا گاڑنا معمولی بات نہیں تھی۔ مولانا عنایت اللہ کو دفتر لے کر دیا گیا اور قادیان میں احرار کا جھنڈا لہرانے لگا۔ ہم نے اول ان احباب کی فہرست تیار کر لی جو مولانا عنایت اللہ کی شہادت کے یکے بعد دیگرے یہ سعادت حاصل کرنے کے لیے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر قادیان پہنچ جائیں۔ دوسرے ہم نے فوراً مولانا عنایت اللہ کے نام قادیان میں مکان خرید دیا تاکہ مرزائیوں اور حکام کا یہ عذر بھی جاتا رہے کہ مولوی صاحب موصوف ایک اجنبی ہیں اور ان کا قادیان سے کوئی تعلق نہیں۔[۶]

مولانا عنایت اللہ دس سال تک قادیان میں مقیم رہے اور ہر قسم کے خوف کو بالائے طاق رکھ کر اعلائے کلمۃ الحق کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ انھی کی شبانہ روز جدوجہد کے نتیجہ میں قادیان میں احرار تبلیغ کانفرنس تزک و احتشام سے منعقد ہوئی جس میں لاکھوں پرستارانِ توحید نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں تقریروں کی پاداش میں مولانا عطا اللہ شاہ بخاری اور مولانا عنایت اللہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ قادیان میں احرار تبلیغ کانفرنس کی کامیابی کے بعد لاہور میں باغ بیرون، دہلی دروازہ مجلس احرار کا عظیم الشان جلسہ ہوا۔ انھی خدمات کے نتیجہ میں آپ کو فاتح قادیان کا لقب دیا گیا۔ آپ نے قادیان میں اپنی دس سالہ تبلیغی زندگی میں ایک کتاب "قادیان میں دس سال" تحریر فرمائی۔

جب ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی تو مولانا عنایت اللہ نے مجلسِ احرار سے مستعفی ہو کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی اور قادیان کی اقامت کو ترک کر کے اپنے آبائی ضلع میانوالی میں مسلم لیگ کو تقویت پہنچانے کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ مولانا عبدالستار خان نیازی کو میانوالی میں اس بزرگ سیاست دان کی معیت میں کام کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔

۱۹۴۳ء میں آپ وطن واپس آئے۔ کچھ عرصہ نواب کالاباغ کے ہاں رہے لیکن ان کی کچھ باتوں سے بددِل ہو کر کالاباغ چھوڑ دیا اور پھر حزب الاحناف، لاہور سے وابستہ ہو کر "اخبار الدعوۃ" میں کام کرتے رہے۔ پھر پیر مقبول احمد میروی کے اصرار پر میرا شریف تعلیم و تدریس میں مشغول ہوگئے اور آخر دم تک وہیں رہے۔

آپ نے وصیت کی تھی کہ مجھے جس جگہ موت آئے وہیں دفن کر دینا۔ آپ میرا شریف سے چکڑالہ آئے تو طبیعت خراب ہوگئی اور آخر کار ۱۲ مارچ ۱۹۹۳ء کو علم کا یہ سورج غروب ہوگیا۔ آپ کا مدفن چکڑالہ کے قبرستان میں ہے۔

تصنیفات:

(۱) برہان القرآن

(۲) بشریت النبی ﷺ المعروف رسالہ نور: مولوی نور الحق کی کتاب کے جواب میں لکھی جسے حزب الاحناف، لاہور نے شائع کیا۔

(۳) مشاہداتِ قادیان: قادیان میں دس سالہ قیام کے دوران پیش آنے والے واقعات کو قلم بند کیا۔ سید عطا اللہ شاہ بخاری کے فرزند اکبر نے طویل مقدمہ لکھا اور ملتان سے شائع کرایا لیکن بعد میں آنے والوں نے اس میں کوئی دلچسپی نہ لی اور دوسرا ایڈیشن نہ آسکا۔ شاید احرار سے علیحدگی کا شاخسانہ ہو۔

(۴) ہفت مسائل: شیعہ عقائد پر سیر حاصل تبصرہ چھپوانے کے لیے ایک دوست کے حوالے کی تھی خدا معلوم کیا ہوا۔

(۵) دیوبندی بریلوی (مقالہ): یہ دیوبندی بریلوی عقائد کے بارے میں ایک مقالہ ہے۔

☆ مولانا قاضی قمر الدین (م ۱۹۰۹ء):

حضرت مولانا قاضی قمر الدین کی ولادت ۲۲ رمضان ۱۲۷۴ھ کو چکڑالہ کے قاضی خاندان میں ہوئی۔ آپ کے والد کا اسم گرامی قاضی محمد سلیمان تھا۔ آپ نے ابتدائی دینی کتابیں اپنے والد صاحب سے پڑھیں۔ پھر انگہ ضلع خوشاب میں کئی سال پڑھتے رہے۔ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی انگہ میں آپ کے ہم درس تھے۔ ۱۲۹۳ھ میں سہارن پور تشریف لے گئے۔ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پور اور حضرت مولانا احمد حسین کانپوری سے تفسیر و حدیث اور فنون کی بقیہ کتابیں پڑھیں۔ ذوالحجہ ۱۲۹۶ھ میں سند فضیلت حاصل کر کے وطن تشریف لائے۔ ۱۲۹۸ھ میں بستی قاضیاں والی ضلع مظفر گڑھ میں قاضی فقیر محمد صاحب سے طب پڑھی۔ گھر آکر ابھی مَطب کا سلسلہ شروع نہیں کیا تھا کہ آپ کے چچازاد بھائی غلام نبی المعروف مولوی عبد اللہ چکڑالوی کو تبدیلی عقیدہ کی وجہ سے افتاء و خطابت سے معزول کر دیا گیا۔ جس کے بعد علاقہ کے لوگوں کے اصرار پر آپ نے یہ ذمہ داریاں قبول کرلیں اور

ساتھ ہی تدریس بھی شروع کر دی۔ آپ کے شاگردوں میں بلند پایہ مفسر، محدث اور مشائخ طریقت ہوئے۔ آپ کے مشہور شاگردوں میں سید شاہ محمد دندہ شاہ بلاول، مولانا قاضی شمس الدین ڈُھر نالوی (گوجرانوالہ)، حضرت غلام حسن سواگ شریف، مولانا نصیر الدین غور غُشتی، مولانا ولی اللہ انھی (گجرات)، مولانا فضل علی قریشی مسکین پور (مظفر گڑھ)، مولانا نور زمان شاہ کوٹ چاندنہ (میانوالی)، پیر فضل حسین شاہ پیر پہائی (میانوالی)، مولانا احمد دین کیلوی (شاہ پور)، مولانا رسول احمد ڈھوک بھرتال، مولانا میاں محمد (کفری) وغیرہ شامل ہیں۔[7]

آپ کا تعلقِ بیعت موسیٰ زئی شریف کے حضرت خواجہ محمد عثمان سے تھا۔ حضرت خواجہ کو آپ کی علمی و روحانی استعداد پر پورا اعتماد تھا۔ مولانا اکبر علی دہلوی نے، مجموعہ فوائدِ عثمانی کتاب لکھی تو حضرت خواجہ صاحب نے آپ سے تصحیح کرانے کا حکم دیا۔ حضرت صاحبزادہ خواجہ محمد سراج الدین کی دستارِ فضیلت کی تقریب میں اساتذہ اور خلفا کے ساتھ آپ کی بھی دستار بندی ہوئی۔ حضرت خواجہ محمد عثمان نے ۱۳۱۴ھ میں سفرِ آخرت فرمایا تو آپ نے ان کے جانشین فرزند شیخِ کامل حضرت محمد سراج الدینؒ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ تکمیلِ سلوک کے بعد خلافت و اجازت سے سرفراز ہوئے۔
قاضی محمد ظفر ذبیح آپ کے متعلق لکھتے ہیں۔

> سید لعل شاہ ہمدانی دندہ شاہ بلاول کی خدمت میں لے جا کر مرید کرا دیتے حالاں کہ آپ کے پیر و مرشد آپ کی تعریف کرتے ہوئے آپ کے نام ایک مکتوب میں فرماتے ہیں۔ خداوندِ کریم نے اپنے فضل و کرم سے آپ کا استغراق قوی عطا فرمایا ہے اور ان شاء اللہ اسی استغراق کے سبب آپ کو جنابِ اقدس کی جانب کشش عطا فرمائے گا۔ یہاں سے جب فقیر آپ کی جانب متوجہ ہوتا ہے تو پہلے کی نسبت آپ کے باطن میں وسعت زیادہ معلوم ہوتی ہے ایک قسم کی بے رنگی آپ کے باطن میں پائی جاتی ہے یہ وسعت اور سرنگی لطیفہ نفس میں معلوم ہوتی ہے امید ہے کہ آپ کو اس کا مشاہدہ ہوتا ہو گا۔[8]

آپ مناظرہ اور مباحثہ کو پسند نہیں فرماتے تھے لیکن کوئی مجبور کر دیتا تو پھر میدان میں ڈٹ جاتے۔ آپ کے مقابلہ میں کوئی مناظر ٹھہر نہ سکتا تھا۔ منکرینِ صحابہؓ سے بھی آپ کے کامیاب مناظرے ہوئے۔ عبد اللہ چکڑالوی کے لیے آپ نے زمین تنگ کر دی تھی۔ مولانا احمد الدین گانگوی اور قاضی قمر الدین چکڑالوی کی ہی کاوشوں سے مولانا عبد اللہ چکڑالوی ناکام ہوئے۔ تحریر و تقریر میں ہر دو حضرات کے مابین رابطہ رہتا۔ ۱۸۸۰ء کی دہائی میں مولانا غلام نبی معروف بہ عبد اللہ چکڑالوی نے ابتداً تقلید اور تصوف کا انکار کیا۔ تقلید کے مسئلے پر مولانا گانگوی نے بہ زبانِ عربی "نور الایمان فی تائید مذہب النعمان"، کے نام سے ایک مدلل کتاب لکھی۔ جس میں نواب صدیق حسن خان بھوپالی، سید نذیر حسین دہلوی اور مولانا عبد اللہ چکڑالوی کے نظریات کا رد کیا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد مولانا چکڑالوی نے حدیث کا انکار کر دیا اور صرف قرآن کو ہی کافی قرار دیا۔

میانوالی سے اٹک تک درجنوں قصبات میں دسیوں جلسے، مناظرے اور مباحثے ہوئے جس میں اہلِ سنت کی طرف سے قاضی قمر الدین محدث چکڑالوی، مولانا عبد اللہ چکڑالوی کی آرا کا رَد کرنے میں پیش پیش رہے۔ عبد اللہ چکڑالوی یہاں سے مایوس ہو کر لاہور چلے گئے اور پھر وہاں انھوں نے اپنے خیالات کا پرچار کیا۔ وصال سے چند دن پہلے مولانا عبد اللہ چکڑالوی یارو خیل (میانوالی) آ گئے۔ یہیں ان کا وصال ہوا اور قبرستان یارو خیل میں مدفون ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تلہ گنگ اور میانوالی میں مولانا چکڑالوی کا کوئی ایک پیروکار بھی نظر نہیں آتا۔ شاید اس کی وجہ مولانا گانگوی اور قاضی قمر الدین کا قائم کردہ علما و مشائخ کا اتحاد تھا جس کے شواہد مخطوطات اور قلمی مکتوبات میں موجود ہیں۔

قاضی قمر الدین نے صرف و نحو اور دیگر موضوعات پر عربی اور فارسی میں کئی چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں۔ مگر ایک آدھ کے سوا اشاعت کی نوبت نہ آئی۔

۱۔ حاشیہ سنن ابی داؤد ۲۔ قمریہ سفر نامہ حجاز ۳۔ فوائدِ قمریہ

۴۔ شرح قواعدِ قمریہ ۵۔ الضابطہ السراجیہ

۶۔ تحفۃ الاخیار فی مواقیت الصلوٰۃ والافطار

وغیرہ اب بھی غیر مطبوعہ آپ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔[۹]

آپ بیمار ہوئے تو حضرت خواجہ محمد سراج الدین ایک دن چھوڑ کر دوسرے دِن حالت معلوم کرنے کے لیے دریاخان سے آدمی بھیجا کرتے۔ حضرت خواجہ صاحب کا قیام ان دنوں دریاخان تھا۔ ایک دن اطلاع کی انتظار کیے بغیر حضرت دریاخان سے چکڑالہ روانہ ہو گئے۔ سحری کے وقت چکڑالہ پہنچے تو حضرت قاضی صاحب کا آخری وقت تھا۔ قاضی صاحب نے اپنے شیخ کی زیارت کی اور روح پرواز کر گئی۔ حضرت خواجہ صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور اسی دن ۱۲ شوال ۱۳۲۷ھ کو علم و معرفت کا یہ خزانہ لحد کے حوالے کر دیا گیا۔ آپ کا مزار چکڑالہ کے قبرستان میں ہے۔ آپ کی نرینہ اولاد نہ تھی۔ آپ کی ایک بچی تھی جو کہ قاضی کلیم اللہ کے گھر تھی۔ آپ بھی وقت کے بہت بڑے عالم ہو گزرے ہیں۔

مولانا عبد اللہ چکڑالوی (م ۱۹۱۵ء):

مولانا علی محمد مظاہری، مولانا عبد اللہ چکڑالوی کے متعلق لکھتے ہیں:

> مولانا عبد اللہ چکڑالوی بہت بڑے عالم دین تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان کا نام غلام نبی تھا اہلِ حدیث ہوئے تو نام تبدیل کر کے عبد اللہ رکھ لیا، آریہ سماجیوں کے ساتھ بڑی معرکہ آرایاں کیں۔ پھر حدیث کا مطلق انکار کر دیا اور اہلِ قرآن کہلانے لگے۔ میانوالی میں مخالفت شروع ہوئی تو لاہور چلے گئے اور مسجد چینیانوالی میں ڈیرہ لگا لیا وہاں سے "اشاعت القرآن" کے نام سے ایک ماہنامہ نکالا جو کافی عرصہ تک چلتا رہا۔[۱۰]

غلام نبی المعروف مولوی عبد اللہ چکڑالہ نے ۱۲۳۰ھ میں چکڑالہ کے معروف قاضی خاندان میں آنکھ کھولی۔ والد کا نام قاضی نور عالم تھا۔ جو قاضی قمر الدین کے حقیقی چچا تھے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولوی عبد اللہ کو مزید تعلیم کا شوق کشاں کشاں ڈپٹی نذیر احمد کے پاس لے گیا۔ بقولِ عنایت اللہ چشتی جب وہ ڈپٹی صاحب کے ہاں دہلی پہنچے اور تعلیم کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے کہا، پنجابی ڈھگے یہاں دوڑے آتے ہیں۔ میرے پاس وقت نہیں۔ اِدھر حصولِ علم کی طلب صادق تھی اُدھر انکار تھا۔ تاہم طالب علم کے اصرار پر انھوں نے جو وقت دیا وہ یہ تھا کہ جب میں ظہر کی نماز کے لیے وضو کرنے بیٹھوں تو تم سبق پڑھ لیا کرو۔ کچھ دن یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر طالب علم کی علمی استعداد اور خداداد قابلیت کے جوہر دیکھ کر استادِ محترم نے توجہ اور لگن سے پڑھانا شروع کر دیا اور پھر انہوں نے اپنے بیٹوں کا استاد مقرر کر دیا۔"

۱۸۸۲ ء میں عبد اللہ چکڑالوی وہاں سے فراغت کے بعد وطن واپس آئے اور چکڑالہ میں خطیب اور مفتی مقرر ہوئے۔ پکے حنفی تھے۔ مگر آہستہ آہستہ تقلید کا رنگ اُڑنے لگا اور اہلِ حدیث مسلک اختیار کر لیا۔ مقتدیوں نے "فاتحہ الامام" اور "رفع یدین" کی حد تک تو ساتھ دیا مگر جب انھوں نے جنگل کے حرام جانور گوہ کو حلال اور اس کے کھانے پر مردہ سنت کو زندہ کرنے کا ثواب بتانا شروع کیا تو لوگ متنفر ہوگئے اور انھیں خطابت و امامت سے الگ کر دیا۔ قاضی غلام نبی نے انکارِ تقلید کے کچھ عرصہ بعد انکارِ حدیث کا فتنہ برپا کر دیا اور اپنے آپ کو اہلِ حدیث کی بجائے اہلِ قرآن کہلانے لگے۔ پھر مذہب کی اس تبدیلی کے ساتھ اپنا نام بھی غلام نبی سے بدل کر عبد اللہ رکھ لیا اور نظریہ انکار حدیث کا خوب پرچار کیا۔ کچھ ڈپٹی صاحب کی تعلیم کا اثر اور کچھ علمی ذوق نے راہ دکھائی۔ فکر و نظر کی تبدیلی کے ساتھ تفسیر قرآن لکھنے کا خیال آیا۔

ایک کتاب "صلوٰۃ القرآن علی برھان الفرقان" کے نام سے لکھی۔ جس میں اوقاتِ نماز، تعدادِ نماز اور رکعاتِ نماز قرآنی آیات سے اَخذ کیں۔ پھر ایک مفصل کتاب "کتاب الصلوٰۃ" لکھی۔ جو شائع ہوئی۔ نحو، منطق، فلسفہ اور بلاغت میں مہارت کی وجہ سے قرآنی آیات کی تاویل و تحقیق ان علوم کے ذریعے کی۔ پھر ایک تفسیر، بیان القرآن، اس دور میں لکھی جب مسلک اہلِ حدیث سے ہٹ کر اہلِ قرآن بننے پر علمائے وقت سے ان کے اختلافات پیدا ہوئے۔ اتفاق سے اس زمانے میں چکڑالہ میں کئی ممتاز علمائے کرام جمع ہوگئے تھے۔ چنانچہ غلام نبی (عبد اللہ چکڑالوی) کے لیے یہاں اپنے نظریات کا فروغ ممکن نہ رہا تو وہ لاہور چلے گئے۔ جہاں ایک متمول شخص چٹو نامی نے ان کے لیے ایک مکان اور جائیداد وقف کر دی۔ امرتسر میں ایک جماعت، مسلمہ، کی بنیاد رکھی، عیسائی پادریوں سے مناظرے کیے۔ قادیان جا کر مرزا غلام احمد سے مناظرہ کیا جو اس زمانے میں بہت بڑی جسارت تھی۔ چکڑالہ میں قیام کے دوران انھوں نے جو نئی بات کی وہ یہ تھی کہ مسجد کے محراب کو گرا کر وہاں ایک دروازہ رکھ دیا جو کئی سالوں تک جب تک وہ پرانی مسجد رہی، موجود رہا، یہ مسجد وہابیاں والی مشہور تھی۔

مرحوم مسلک کے اختلاف سے قطع نظر ایک جید عالم تھے۔ تحقیق میں لغزش اور ٹھوکر کھا جانا انسانی خاصہ ہے۔ آخری عمر میں میانوالی سے ملحقہ گاؤں یارو خیل آگئے۔ ۱۹۱۵ء میں یہیں انتقال ہوا اور اپنی وصیت کے مطابق یہیں دفن کئے گئے۔ قابلِ ذکر اَمر

یہ ہے کہ چکڑالہ کے پورے علاقے میں ایک بھی متنفس ان کا پیروکار نہیں لیکن ان کی جائے پیدائش ہونے کی وجہ سے یہ بدنامی چکڑالہ کے حصے کچھ اس طرح آئی کہ آج بھی لوگ ان کے نظریہ انکارِ حدیث کو چکڑالویت کا نام دیتے ہیں۔

مولانا علی محمد مظاہری، مولانا عبد اللہ چکڑالوی کے انکارِ تقلید پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اُن کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ انھوں نے حدیث کا مکمل انکار کر دیا تھا اس لیے انھیں نماز کے اوقاتِ پنجگانہ، رکعات وغیرہ قرآن سے ثابت کرنا پڑیں اور اکثر جگہ رکیک تاویلات سے کام لیا۔ انھوں نے قرآنِ حکیم کی تفسیر بھی لکھی تھی اور نماز کے لیے "برہان القرآن" کے نام سے ضخیم کتاب بھی لکھی تھی ان کا بہت بڑا کتب خانہ تھا جو اَب برباد ہو چکا ہے۔ علامہ اسلم جیراج پوری نے ان سے ملاقات کر کے لکھا کہ وہ سنتِ متواترہ کا انکار کر کے مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ مولانا چکڑالوی کے فرزند قاضی محمد عیسیٰ بھی بڑے زبردست عالم تھے ان کے بیٹے قاضی یحیٰی بھی دادا کے مسلک پر تھے۔"[12]

عبد اللہ چکڑالوی کی تالیفات:

☆	برہان الفرقان علی صلاۃ القرآن	☆	ترجمۃ القرآن بہ آیات الفرقان
☆	رسالہ بیاج خوری	☆	صلوٰۃ القرآن
☆	اشاعت القرآن بجواب اشاعۃ السنتہ	☆	زکوٰۃ صدقات کما جاء فی آیاتِ بینات
☆	روح الانسان کما بین القرآن	☆	حالاتِ عیسیٰ رسول ربانی و تردید اوھام قادیانی۔[13]

مولانا عبد اللہ چکڑالوی کے افکار و نظریات:

ترجمہ القرآن بہ آیات الفرقان:

یہ تفسیر پہلی بار ۱۹۰۶ء میں اشاعت القرآن، لاہور نے شائع کی تھی اور اس کے بعد ۲۰۰۷ء میں سرسید ریسرچ اکیڈمی نے اسے دوسری بار شائع کیا۔ زیادہ تر یہ ایک مختصر حواشی کی صورت میں ہے۔"[14]

یہ وہ مقامات ہیں جہاں چکڑالوی جمہور سے اختلاف کرتے ہیں۔

خاص ان مقامات پر تفصیل سے کام لیا گیا ہے جہاں چکڑالوی اپنے فکر سے گفتگو کرتے ہیں، عبد اللہ چکڑالوی کا کہنا ہے کہ انھوں نے قرآنِ حکیم کا ترجمہ اسی اَشد ضرورت کے تحت کیا ہے۔ ایسا ترجمہ کیا جائے جس سے کلام الٰہی کا منشاء پورا ہو اور غیر کے کلام و خیالات کا اس میں دخل نہ ہو، غیر کے کلام سے اس کا مراد احادیثِ نبویہ ﷺ ہے۔ اس کے نزدیک سارا ذخیرہ حدیث، یہودی روایات پر مبنی ہے اور سنت و حدیث سے قرآن کی تفسیر کرنا جو کہ تفسیر کا دوسرا بڑا مصدر ہے، غیر کے کلام و خیالات کو قرآن میں داخل کرنا ہے۔

عبد اللہ چکڑالوی کے افکار و نظریات:

مولانا چکڑالوی کے تسامحات اور تفردات سے ان کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ یہاں چند ایک تفردات اور نظریات زیرِ بحث لائے جاتے ہیں۔ چکڑالوی نے اپنے اصولِ تفسیر بیان کیے ہیں جو "۲۸ "نکات پر مشتمل ہیں۔[۱۵]

چکڑالوی شانِ نزول کے متعلق کہتا ہے کہ کوئی خاص واقعہ کسی آیت کا شانِ نزول نہیں ہے، جیسا کہ عام لوگوں کا خیال ہے۔

عبد اللہ چکڑالوی ذخیرۂ حدیث کو ناقابلِ اعتماد سمجھ کر رَد کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھتے ہوئے حدیث سے استدلال کو کتاب اللہ کے ساتھ شرک کہتے ہیں۔ اس کی وضاحت میں وہ کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام سوائے کتاب اللہ کے کسی غیر اللہ کی حدیث پر چلتے تو مشرک ہو جاتے۔ اس جگہ شرک سے مراد خاص کتاب اللہ کے ساتھ ہی شرک کرنا مراد ہے۔[۱۶]

پس کتاب اللہ کے ساتھ شرک کرنے سے یہ مراد ہے کہ جس طرح کتاب اللہ کے احکامات کو مانا جاتا ہے اسی طرح کسی اور کتاب یا شخص کے قول یا فعل کو دینِ اسلام میں مانا جائے، خواہ وہ جملہ رسل و انبیا کا قول یا فعل ہی کیوں نہ ہو۔ اس پر مزید اضافہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ واضح رہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اپنے ذاتی اجتہاد، افعال و اقوال کے اتباع کا خدا نے حکم نہیں دیا، بلکہ جو آیات آپ ﷺ پر نازل ہوئیں ان ہی کے اتباع کا حکم ہے، اس میں آپ ﷺ کے اقوال و افعال کا کوئی تعلق نہیں ہے۔[۱۷]

وہ نسخ سے مراد، قائم مقام لیتے ہیں، اور اس کی وضاحت خود کرتے ہیں کہ، اگر کوئی شخص ایک حکم کا مکلف ہو اور پھر اس حکم کے بجائے دوسرے کا مکلف بنا دیا جائے، تو دوسرا حکم پہلے کا قائم مقام ہو گا اور وہ یا تو پہلے کے مثل ہو گا، یا اس سے بہتر[۱۸]

وہ اس کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ

اگر کوئی شخص وضو کرنے کا مکلف تھا اور اسے بہ وجوہ، تیمم کا حکم دے دیا گیا تو یہ تیمم وضو کا ناسخ یعنی قائم مقام ہو گا اور وضو کا مثل ہو گا اس سے بہتر نہیں اور جب وضو کا مکلف ہو جائے گا تو یہ وضو تیمم کا ناسخ ہو جائے گا اور اس سے بہتر ہو گا نہ کہ مثل۔[۱۹]

معتزلہ کی طرح چکڑالوی معجزات کی تاویل کرتے ہیں۔ سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۶۰ کا ترجمہ وہ یوں کرتے ہیں۔

جب موسیٰ نے پانی مانگا تو ہم نے کہا کہ اپنے گروہ کو لے کر چشموں والے پہاڑ کی طرف چلے جاؤ جب جا کر دیکھا تو اس پہاڑ سے بڑے بڑے چشمے بہہ رہے تھے۔[۲۰]

ولادت و رفع عیسیٰ کے بارے میں چکڑالوی کے تفردات :

عبد اللہ چکڑالوی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ پیدائش کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ اس پر دلیل دیتے ہوئے اسے فطرت کے خلاف نہیں سمجھتے۔

عیسیٰ کا حال اللہ کے نزدیک آدم کا سا ہے کہ اس نے مٹی سے ان کا قالب بنایا۔ اور پھر فرمایا کہ انسان ہو جا، تو وہ انسان ہو گئے، اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کا بن باپ کے پیدا ہونا، ممثل و مشبہ قرار دیا گیا ہے اور آدم علیہ السلام کا خالی مٹی سے پیدا ہونا، بغیر باپ اور ماں کے مشبہ بہ اور ممثل بہ ٹھہرا دیا گیا۔ بلا ریب آدم علیہ السلام کا پیدا ہونا، بڑھ کے خارقِ عادت ہے، عیسیٰ علیہ السلام کے بن باپ ہونے سے، کیوں کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش میں والدہ کا نام ہونا موجود ہے، لیکن آدم علیہ السلام کی پیدائش میں ماں نہ باپ، دونوں ہی مفقود و معدوم ہیں، غرض آدم علیہ السلام کے بغیر ماں باپ پیدا ہونے سے فطرت کا زوال نہیں ہوتا، اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے صرف بن باپ کے پیدا ہونے کو بھی کسی طرح سے فطرت کے خلاف نہیں سمجھا جاسکتا۔ جس قادر و قیوم "**فعال لمایرید**" سے آدم کا بن باپ پیدا ہونا ظہور میں آگیا، خاص وہی قادر و قیوم "**فعال لمایرید**"، اس بات پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بن باپ پیدا کر دکھائے۔[21]

مولانا چکڑالوی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کے تو قائل نہیں، لیکن وفات کے بھی قائل نہیں ان کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی تک زمین پر کہیں موجود اور زندہ ہیں۔

آیت میں وفات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہرگز ہرگز نہیں ہے، بلکہ جسدِ عُنصری زندہ بالکل صحیح سالم ان یہودیوں موذیوں سے جدا کر کے اسی دنیا میں روئے زمین پر، کسی اور جگہ بہ حفاظت تمام اقامت پذیر ہیں، اور اس سے دُنیا ہی مراد ہے۔[22]

وہ اس کے بھی قائل ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، قُربِ قیامت میں اُس دُنیا سے اِس دنیا میں ظہور کریں گے۔ ویکلم الناس کو دلیل بناتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حضرت عیسیٰ کے متعلق دو پیشین گوئیاں کی ہیں، ایک یہ کہ وہ ماں کی گود میں کلام کریں گے اور دوسرا کہولت میں، بلاشبہ دونوں کلام بطورِ معجزہ وخوارق عادت ہی بطورِ پیشین گوئی مریم کی بشارت دی گئی، ایک ظاہر ہوا، اور دوسری قُربِ قیامت میں ظاہر ہو گی۔[23]

اور جب ان کے بارے میں وعدہ پورا ہو گیا تو ہم ان کے لیے زمیں سے جانور نکالیں گے، جو ان سے باتیں کرے گا، وہ کہتے ہیں کہ آیت میں لفظ "دابۃ" حضرت عیسیٰ کی جگہ آیا ہے۔[24]

ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری سے نکاح کی حرمت:

آج کے دور کا ایک اہم مسئلہ تعدادِ ازواج کا بھی ہے اس مسئلہ میں اعتزالی فکر کے حامل افراد مثلاً چکڑالوی، پرویز یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک بیوی کی موجودگی میں، دوسری سے نکاح کرنا ناجائز ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ جس آیت سے تعددِ ازواج ثابت کیا جاتا ہے، وہی آیت اس کی ممانعت پر نص قطعی ہے۔[25]

نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کی بھی نفی کرتے ہیں:

علامہ چکڑالوی بیک وقت رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کی بھی نفی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ ﷺ بھی اسی قرآنی حکم کے پابند تھے اور بیک وقت ایک سے زیادہ بیویاں نہیں رکھیں۔[26]

(اے نبی ﷺ اپنی بیویوں سے کہ اگر تم دُنیا کی زندگی اور اس کی زینت و آرائش کی خواست گار ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ مال دوں اور اچھی طرح سے رُخصت کر دوں)۔ میں "ازواجک" میں صیغہ جمع پر اپنی رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ قرآنِ مجید میں جہاں کہیں بھی "ازواج یانِساء" وغیرہ جمع کے صیغے آئے ہیں۔ ان کا کسی جگہ سے اشارۃً یا کنایۃً ایک ہی وقت میں جمع ہونا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ وہ اس طور پر ہو سکتا ہے کہ کوئی ایک کے مرنے کے بعد دوسری اور دوسری کے مرنے کے بعد تیسری وغیرہ، اسی طرح وہ سب عورتیں ازواج ونساء کہلاتی ہیں لیکن یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ سب ازواج جمع تھیں۔[27]

وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ازواج کو بھی جمع کے صیغے سے بیان کیا گیا۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ساری ایک ہی وقت آپ ﷺ کے پاس تھیں، ایک کے مرنے کے بعد دوسری سے آپ ﷺ نے نکاح کیا، لیکن ایک وقت میں ایک ہی آپ ﷺ کے حرم میں رہیں۔ وہ "قل لازوجک" کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ اے نبی ہمارا یہ حکم ہے کہ ضرور ہی سنا دیا کرو کہ اپنی تمام بیویوں کو، جو جو وقتاً فوقتاً کتاب اللہ کے مطابق تیرے نکاح میں آیا کریں۔[28]

عید قرباں اسراف و تبذیر ہے:

چکڑالوی کے خیال میں جب تمام لوگ قربانی کرتے ہیں تو وہ ضائع ہو جاتی ہے۔[29]

ان کا کہنا ہے کہ بہ صورتِ ضرورت قربانی کے عوض صدقہ دینا جائز ہے اور موجودہ حالات میں جائز ہے کہ مکہ میں قربانی کے عوض صدقہ دے دیا جائے، جب کہ مکہ کے علاوہ دیگر مقامات پر اگر مساکین و فقرا موجود ہیں تو وہاں قربانی کرنا جائز ہے وہ کہتے ہیں کہ "یوم النحر" میں حاجی جس کثرت سے قربانی کرتے ہیں، وہ اسراف و تبذیر ہے کہ تمام ضائع ہو جاتی ہے۔

کتاب اللہ کے مقابل احادیث پیش کرنا:

عبد اللہ چکڑالوی لکھتے ہیں:

کتاب اللہ کے مقابلہ میں انبیا اور رسولوں کے اقوال وافعال یعنی احادیث قولی و فعلی و تقریری پیش کرنے کا مرض ایک قدیم مرض ہے اور جس طرح مختلف فرقے آج کل قرآنِ مجید کے مقابلے میں احادیث پیش کرتے ہیں اور اُن کو محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہی حال اُن لوگوں کا تھا جو آپ کے مقابل و مخاطب تھے۔ وہ بھی یقیناً اہل حدیث تھے۔ کیوں کہ ابراہیم، اسماعیل، سلیمان، یعقوب، اسحاق سلام اللہ علیہم کی احادیث کتاب اللہ کے مقابلوں میں پیش کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن انبیا علیہم السلام کی ایسی احادیث سے بریت ظاہر کی اور اُن احادیث کو کفر و شرک کہا۔[30]

چکڑالوی کا خود کو کافر کہے جانے کا تذکرہ:

عبد اللہ چکڑالوی کے انحراف کی وجہ سے بعض علمانے ان کی تکفیر کی ہے۔ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

کیا خدا کو لغو گو سمجھنا اچھی بات ہے؟ افسوس ہے کہ ان لوگوں کی طرف تو کوئی نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، لیکن مجھے اس بات کے لیے بھی کافر کہا جاتا ہے کہ میں کلام اللہ کو ایک کامل اور ہر طرح کافی شافی جانتا ہوں۔[۳۱]

علما پر تنقید:

عبد اللہ چکڑالوی نے جابجا علما و فقہا پر تنقید کی ہے۔ انھوں نے محدثین، مفسرین، مشائخ و صوفیہ الغرض ہر طبقہ کے علما پر انتہائی سخت نقد کیا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں۔

ہاں ہمارے وسواسی ملاؤں نے گندی احادیث و فقہ کی بنا پر ضرور دین کو ایک ہیبت ناک دیو بنا دیا جس کے قریب آنے سے عوام الناس ڈرتے ہیں۔ طہارت بے شک نماز کے لیے فرض ہے۔ لیکن ان وَہم پرستوں نے اس میں حد سے زیادہ مبالغہ کیا ہے۔ اور اس کے متعلق ان کم بختوں نے ایسی موشگافیاں کی ہیں کہ ان کے ہزلیات سُن کر بے چارے عوام الناس کے یہ ذہن نشین ہو جاتا ہے کہ طہارت بھی ایک کیمیا گری ہے۔ جس کا حاصل ہونا ہم دُنیا داروں کو مشکل ہے اور اس لیے وہ نماز سے کنارے رہنا ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ خدا ہدایت کرے ان ظالموں کو جنھوں نے لاکھوں لوگوں کر تارکِ نماز بنا دیا۔[۳۲]

انکارِ حدیث کی تفصیل:

عبد اللہ چکڑالوی انکارِ حدیث کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

میں اس اَمر کو ثابت و ظاہر و واضح و روشن کرنا چاہتا ہوں کہ قرآنِ مجید من کل الوجوہ ایک کامل اکمل مکمل کتاب ہے اس میں دینِ اسلام کے تمام مسائل پوری تشریح کے ساتھ مذکور ہیں اور اس کے ہوتے ہوئے امورِ دین میں کسی دوسری کتاب کی کوئی ضرورت و حاجت نہیں۔[۳۳]

علما و صوفیہ پر نقد:

اور اگر تمہارے سارے مولوی، محدث، امام، پیر، صوفی اور سجادہ نشین بھی جمع ہو جائیں تو قرآنی دُعاؤں جیسی جامع اور پُر اثر دعائیں اور اذکار نہ بنا سکیں گے۔[۳۴]

تقلید کا رَد:

عبد اللہ چکڑالوی آئمہ مذاہب کی تقلید کا رَد کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

کوئی چیز ایمان کو اس قدر ضرر نہیں پہنچا سکتی جس قدر کہ تقلید، کلام الٰہی کے فہم صحیح سے لوگ محروم رہے وہ بھی اس بلا کی وجہ سے۔ اپنے اماموں اور بزرگوں اور راویوں کی تقلید سے۔ اُمورِ دین میں جس طریقہ ورَوِش ومذہب کے پابند تھے مترجمین ومفسرین نے آیاتِ قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر کو اس سانحہ وقالب میں ڈھالا۔ حنفی مفسرین نے توڑ موڑ کر امام اعظم صاحب کے مذہب کے موافق تفسیریں کیں۔ شافعیوں نے اپنے مذہب کے مطابق۔ مالکی اسے کھینچ تان کر اپنے امام کی طرف لے گئے اور سب سے بڑا ظلم ان مفسرین نے کیا جنھوں نے حدیث کو قرآنِ مجید کا قاضی وحاکم ٹھہرادیا اور دھینگا مشتی سے آیات کو احادیث کے سائے تلے چلایا۔[۳۵]

مزید لکھتے ہیں کہ:

اگر یہ لوگ قیدِ تقلید سے آزاد ہوتے اور فقہ وحدیث کی رنگین عینک سے کتاب اللہ کو دیکھتے تو انھیں صاف نظر آجاتا کہ اس دُعا کا موقعہ نماز ہی ہے۔ انسان جس رنگ کی عینک سے دیکھتا ہے اس کو زمین وآسمان کی ہر ایک چیز میں وہی رنگ نظر آتا ہے۔ لیکن اشیا کو اصلی رنگت میں وہی شخص دیکھتا ہے جس کی نظر صحیح وسالم ہے اور جو بغیر عینک کے دیکھ سکتا ہے۔ پس اے لوگو! پاک وآزاد دِل سے کلامِ الٰہی کو پڑھو اور اپنی آنکھوں سے پڑھو تاکہ تمہیں حقیقت نظر آئے۔ بخاری، مسلم یا ابو حنیفہ، شافعی یا فخر الدین وجلال الدین کی آنکھوں سے نہ دیکھو۔[۳۶]

سید احمد الدین گانگوی اور قاضی قمر الدین محدث چکڑالوی کا تعاقب ومحاسبہ:

مذکورہ بالا تفصیل سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عبد اللہ چکڑالوی کے نظریات کس نوعیت کے تھے۔ ۱۸۸۰ء کی دہائی میں عبد اللہ چکڑالوی ہندوستان سے فارغ التحصیل ہو کر اپنے آبائی علاقہ چکڑالہ واپس پلٹے تو اس وقت یہاں کی اکثریت حنفی مسلک اور صوفی المشرب تھی۔ عبد اللہ چکڑالوی، سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد ہونے کی وجہ سے مسلک اہلِ حدیث اختیار کر چکے تھے۔ ابھی تک عبد اللہ چکڑالوی، قاضی غلام نبی چکڑالوی کے نام سے موسوم تھے جو ان کے والد نے رکھا تھا۔ عبد اللہ چکڑالوی نے جگہ جگہ تقریروں میں تصوف اور تقلید کا رَد شروع کر دیا۔ مولانا گانگوی سے انکارِ تقلید کا سدّباب کرنے کی علمائے میانوالی نے التجا کی۔ اس پر مولانا گانگوی نے نواب صدیق حسن خان بھوپالی، سید نذیر حسین دہلوی اور مولانا عبد اللہ چکڑالوی کے رَد میں بزبان عربی "نور الایمان فی تائید مذہب النعمان" کے نام سے ایک معرکتہ آرا کتاب تصنیف فرمائی۔ چونکہ مولانا چکڑالوی نے ابھی تک حجیتِ حدیث اور محدثین کا انکار نہیں کیا تھا اس لیے مولانا گانگوی نے محدثین اور فقہا کی صدیوں پر مشتمل روایت سے اجتہاد اور تقلید کے قضیوں کو معقولی انداز میں سمجھانے کی سعی کی۔

مولانا عبد اللہ چکڑالوی اور مولانا قاضی قمر الدین: علمی معرکے اور مباحثے

قاضی غلام نبی سے عبد اللہ چکڑالوی :

قاضی ظفر ذبیح اپنی کتاب "گلدستہ ذبیح" میں قاضی غلام نبی اور قاضی قمر الدین کے خاندانی رشتے اور علمی سلسلے کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

> حضرت شیخ الحدیث قمر الاولیاؒ جب اپنے وطن چکڑالہ شریف تشریف لائے تھے اور مدرسہ میں تدریس شروع فرمائی تھی تو انھی دِنوں آپ کے چچازاد بھائی جن کا نام قاضی غلام نبی تھا اور ان کے والد کا نام قاضی نور عالم تھا۔ جب کہ حضرت کے والد ماجد کا نام حضرت سلیمانؒ ہے۔ ایک بھائی کا لڑکا حضرت شیخ الحدیث، مفسرِ حدیث اور حکیم بنے۔ نورِ عالم صاحب نے بھی اپنا لڑکا غلام نبی علم حاصل کرنے کے لیے دہلی بھیجا۔ وہ بھی ۱۲۸۲ھ میں علومِ دین حاصل کر کے واپس آئے تھے۔ غلام نبی دہلی میں ایسے اساتذہ کے پاس رہے جو غیر مقلد تھے اس لیے غلام نبی غیر مقلد بن کر لوٹا۔[۳۷]

قاضی ظفر ذبیح، مولانا عبد اللہ چکڑالوی کے ابتدائی مسلک کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> علاقہ کے لوگ غلام نبی کے نظریہ سے ناواقف تھے۔ غلام نبی کو چکڑالہ کا خطیب اور مفتی مقرر کر دیا تھا۔ ارد گرد کافی دور دور سے لوگ جمعہ پڑھنے کے لیے چکڑالہ آتے تھے۔ سب لوگ غلام نبی کا دِل سے احترام کرتے تھے اور ان کے فتویٰ قبول کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد غلام نبی کے نظریات میں تبدیلی رونما ہونے لگی۔ شروع شروع میں تو قاضی غلام نبی نے اپنے استاد ڈپٹی نذیر احمد کا عدم تقلید اور انکارِ تقلید کا مسلک اپنایا اور اپنے آپ کو اہلِ حدیث کہلوانے لگے اس سے علاقہ کے لوگ کنارہ کش ہوگئے اور ان کے فتویٰ کا اعتماد ختم ہو گیا مگر اس کے بعد قاضی غلام نبی نے اپنا نام بھی بدل کر عبد اللہ رکھ لیا۔ اور عبد اللہ چکڑالوی کے نام سے مشہور ہوا۔[۳۸]

مولانا عبد اللہ چکڑالوی کو علما قاضی غلام نبی سے ہی ذکر کیا کرتے۔ سید گانگوی، مولانا حسین علی کا رَد کرتے ہوئے "لوامع الضیاء" میں ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

> ثالثاً مانا کہ وہ بڑا عالم ہے مگر یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ وہ حق پر بھی ہے کیوں کہ بڑا عالم ہونا مستلزم اتباعِ حق نہیں ورنہ شیطان بھی حق پر ہوتا جس کا بڑا عالم ہونا مسلم الکل ہے، علیٰ ہٰذا القیاس مرزا قادیانی، غلام نبی چکڑالوی وسید احمد نیچری وغیرہم یہ سب بڑے عالم ہیں جب کہ مولوی حسین علی ان کا طفل مکتب کہلانے کا حق بھی نہیں رکھتا۔[۳۹]

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہے کہ علمائے میانوالی مولانا عبد اللہ چکڑالوی کا ذکر قاضی غلام نبی کے نام سے کرتے ہیں۔ چکڑالہ پر نئے نظریات اور عقائد کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے قاضی ظفر لکھتے ہیں۔

ایسے ایسے مسائل بیان کرنا شروع کر دیے کہ لوگوں کے لیے موجبِ وحشت بن گئے۔ عوام متنفر ہو گئی۔ علاقہ بھر کے لوگوں کے اصرار پر یہ خطابت والی ذمہ داری بھی حضرت شیخ الحدیث قمر الاولیا قاضی قمر الدینؒ کو سونپ دی۔ حضرت نے خواجگان موسیٰ زئی شریف، خواجگانِ دندہ شاہ بلالؒ شریف ضلع اٹک (حال: ضلع چکوال) کے حکم پر یہ ذمہ داری قبول فرمائی اور جمعہ پڑھانا شروع کر دیا۔ فتویٰ دینے شروع فرما دیے۔ قاضی غلام نبی ۱۴ سال تک خطیب و امام رہ چکا تھا۔ انکارِ حدیث کی وجہ سے اب اہلِ حدیث کی بہ جائے اپنے آپ کو اہلِ قرآن کہلوانا شروع کر دیا اور اپنا نام عبد اللہ چکڑالوی رکھ لیا۔[۴۰]

مولانا عبد اللہ چکڑالوی نے مسلک اہلِ قرآن کی بنیاد رکھی تو علاقہ سے کوئی بھی شخص اس کی حمایت کے لیے تیار نہ ہوا۔ حتیٰ کہ بیٹے بھی حمایت سے دستبردار ہو گئے۔ صرف ایک پوتا ان کے مسلک پر آخری دَم تک رہا۔

اس باطل مذہب کی پیروی کے لیے اپنے دونوں صاحب علم بیٹوں قاضی محمد ابراہیم اور قاضی محمد عیسیٰ پر زور ڈالا، دباؤ ڈالا لیکن قاضی محمد ابراہیم نے تو صاف انکار کر دیا۔ عبد اللہ چکڑالوی نے اپنے اس بیٹے کو جائیداد سے محروم کر دیا۔ قاضی محمد ابراہیم نے جائیداد سے محروم ہونا قبول کر لیا لیکن دین نہ چھوڑا اور نقل مکانی کر کے پیروالہ، ضلع ملتان میں امامت کر لی اور آسودگی سے زندگی گزار دی۔ دوسرے بیٹے قاضی محمد عیسیٰ نے جائیداد کی محرومی کے ڈر سے وقتی طور پر حامی بھر لی اور بیٹا محمد یحیٰ عبد اللہ چکڑالوی کے حوالے کر دیا۔ آزمائشی دور گزار کر خود قاضی محمد عیسیٰ اسلام اور مسلک حنفی پر قائم ہو گئے۔ لیکن اپنے بیٹے محمد یحیٰ کو واپس نہ لا سکے۔ وہ اپنے دادا کے مذہب پر قائم رہا اور آخر دم تک رہا۔ چکڑالہ میں صرف یہی ایک شخص اہلِ قرآن تھا۔[۴۱]

عبد اللہ چکڑالوی سے پہلے اس علاقہ کے اکثر لوگ صوفیائے نقشبند سے وابستہ تھے اور صوفیانہ طرزِ زندگی یہاں رائج تھا۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے قاضی ظفر ذبیح لکھتے ہیں۔

اس زمانہ میں چکڑالہ میں حضرت شیخ الحدیثؒ کے پیر بھائی مولانا نور خانؒ غازی خیل جو ایک جاگیر دار تھے اور حضرت محبوبِ سبحانی خواجہ محمد عثمان دامانیؒ کے خلیفہ مجاز بھی تھے چکڑالہ میں مقیم تھے۔ فقیر غلام عباس خانؒ بھی ایک جاگیر دار اور حضرت خواجہ سراج الاولیا خواجہ محمد سراج الدینؒ کے خلیفہ تھے۔ حضرت سید الاولیاء پیر لعل شاہ صاحبؒ دندہ شاہ بلاول والے حضرت سراج الاولیاؒ کے خلیفہ تھے۔ مولانا محمد صدیقؒ ڈھوک زمان والے۔ مولانا محمد حسینؒ تھمے والی والے۔ یہ تمام حضرات خواجگان موسیٰ زئی شریف کے خلفا تھے۔[۴۲]

مولانا عبد اللہ چکڑالوی اور قاضی قمر الدین محدث چکڑالوی کے مابین ہونے والے مباحثوں کا ذکر کرتے ہوئے قاضی ظفر ذبیح لکھتے ہیں۔

> عبد اللہ چکڑالوی جہاں بھی نظریہ انکارِ حدیث کا پرچار کرنے کے لیے جاتا حضرت شیخ الحدیث قمر الاولیاءؒ بھی اس کے تعاقب میں وہیں پہنچ جاتے اور اسی مجلس میں لوگوں کو عبد اللہ چکڑالوی کے غلط عقائد سے آگاہ فرماتے۔ حدیث و سنت کا مقام اور اہمیت بیان فرماتے چوں کہ علاقہ پہلے بھی عقیدت مند تھا اس لیے حضرت شیخ الحدیثؒ کے الفاظ مبارک سینوں میں اترتے تھے اور سینے منور ہو جاتے۔ [۴۳]

مولانا عبد اللہ چکڑالوی اپنی علمی کم مائیگی کی وجہ سے اکثر مناظروں میں ناکامی سے دوچار ہوتے۔ عوام بھی ان کے اس طرز عمل سے تنگ تھی۔ بہ ایں وجہ مزید کچھ وقت گزرنے کے بعد انھوں نے لاہور کا رُخ اختیار کیا۔

> مباحثہ میں عبد اللہ چکڑالوی کو لاجواب اور مبہوت کر دیتے۔ عبد اللہ چکڑالوی برس ہا برس اس سارے علاقہ اٹک، فتح جنگ، پنڈی گھیب، ٹمن، تراپ، انجرہ مارا مارا پھرتا رہا مگر حضرت شیخ الحدیثؒ کی مساعی مبارک کی بدولت اس کی پذیرائی نہ ہوئی۔ چکڑالہ شہر میں بھی ایک آدھ کے سوا کسی کو اپنا ہم نوا نہ بنا سکا۔ [۴۴]

چکڑالہ سے لاہور منتقلی:

ایک ہی خاندان سے ہونے کے سبب مولانا عبد اللہ چکڑالوی اور قاضی قمر الدین کے مابین عدالتی مخاصمت بھی جاری رہی۔ بالآخر مولانا چکڑالوی یہاں سے لاہور منتقل ہو گئے۔

> قاضی عبد اللہ نے شیخ الحدیث قمر الاولیاءؒ کے خلاف جھوٹے مقدمات شروع کر دیے لیکن بے سود، یہ مقدمہ بازی بھی حضرت شیخ الحدیثؒ کے کام میں کوئی رُکاوٹ نہ بن سکی۔ اس جھوٹی مقدمہ بازی سے عبد اللہ چکڑالوی کی شرافت کا بھانڈہ پھوٹ گیا اور عوام میں زیادہ رُسوا و ذلیل ہو گیا۔ جب دینی اور دنیاوی لحاظ سے اپنا اعتماد کھو بیٹھا تو اپنے پوتے جو اس کا شاگرد اور خلیفہ بھی تھا۔ قاضی یحییٰ کو ساتھ لے کر لاہور چلا گیا وہاں "اشاعت القرآن" کے نام سے رسالہ جاری کیا۔ [۴۵]

وفات سے کچھ دن قبل مولانا چکڑالوی دوبارہ میانوالی آ گئے اور یہیں ان کا مدفن بنا۔

> اور مذہب اہلِ قرآن کے نام سے انکارِ احادیث کا پرچار کرتا رہا جب ضعف اور بڑھاپا کی وجہ سے کام کاج کے قابل نہ رہا تو کچھ دن ملتان میں اپنے ایک پیروکار کے پاس رہا۔ آخری دنوں میں میانوالی کے ملحقہ گاؤں یارو خیل میں رہا۔ ۱۹۱۵ھ میں یارو خیل میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوا۔ [۴۶]

قاضی ظفر ذبیح کے بقول آبائی قصبہ چکڑالہ میں عبد اللہ چکڑالوی کے پیروکار نہیں پائے جاتے۔ اس بات کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

ہمارے پورا علاقہ اٹک، فتح جنگ سے لے کر میانوالی تک خواجگان موسیٰ زئی شریف کے فیوضات و برکات سے منور ہے اور منور تھا۔ ایک آدمی بھی عبد اللہ چکڑالوی کا پیروکار نہ بن سکا۔ لیکن چکڑالہ چوں کہ عبد اللہ کا آبائی وطن تھا اس لیے یہ بدنامی چکڑالہ کو ملی اور آج بھی اُن کے خلافِ اسلام نظریات کو چکڑالویت کا نام دیتے ہیں۔ مرزائیت تو ایک فرد کے ذمہ تھی لیکن ہماری بدقسمتی کہ چکڑالویت پورے قصبہ کے نام پر مشہور ہوئی۔[47]

سید احمد الدین گانگوی اور قاضی قمر الدین چکڑالوی کی مساعی سے علمائے میانوالی کے مابین اتحاد و اتفاق کی فضا قائم ہوئی اور تمام علما نے مل کر مولانا چکڑالوی کے نظریات کا رَد کیا۔ مولانا گانگوی کے ہی تلمیذِ رشید مولانا سید غلام قاسم چکبندی جب مسئلہ تکفیر میں ابہام کا شکار ہوئے تو انھوں نے بعض علما کے اقوال اور فتاویٰ مولانا گانگوی کی طرف ارسال کیے اور اپنے شبہات آپ کے سامنے رکھے۔ جس کے جواب میں سید گانگوی نے انھیں خط لکھتے ہوئے وضاحت کی کہ الحاد کے رَد میں علما کے اتفاقی قول کا التزام کیا جائے۔ خط کی ابتدا میں ہی مولانا گانگوی لکھتے ہیں۔

۷۸۷

عالی قدر والا جاہ جناب مولانا مولوی غلام قاسم شاہ صاحب دامت برکاتہ

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ برکاتہ مزاجِ اقدس سرفراز نامہ بمعہ استفتاء۔ ہم دستی جناب پیر فیض اللہ شاہ صاحب پہنچے مافیہا سے آگاہی ہوئی۔ جواباً دوستانہ مشورہ عرض ہے اس کو کسی خود غرضی تاتخالف پر محمول ہرگز نہ فرماویں جس پر ناراض ہوئے ہیں۔ بلکہ مخلصانہ مشورہ ہے اور دوستانہ تبادلہ خیالات ہے چونکہ زمانہ کے حالات بہت بگڑے ہوئے ہیں جو ملاحدہ اور زنادقہ نے مختلف رنگوں میں اپنے ملک برادری میں گونا گوں پیرائے اختیار کر رہے ہیں۔ جو سادہ لوح اہل سنت والجماعۃ ان کی ملمع کاریوں کی جال میں پھنس جاتے ہیں۔ مکائد کے پول کھل جانے کے بعد بہ ہر کیف افسوس ملنے کے دیگر کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

زمین پُرس فرسودہ روزگار[48]

سید گانگوی مولانا سید غلام قاسم کو مخاطب کرتے ہوئے اور ان کی رائے کا نقص انتشار و افتراق اہلِ سنت کی صورت میں ظاہر ہونے کا خدشہ ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

لہٰذا ہر ایک معاملہ میں اپنے ایمان اور خودداری کا ہر وقت لحاظ رکھنا چاہیے اب مقدمہ مذکورہ میں بھی آپ کے ساتھ یہی معاملہ ہوا ہے۔ ان لوگوں نے آپ کو ایک نیک نام عالم سمجھ کر دام تزویر میں پھنسا لیا۔ اب آپ کو ان کے اسلام ثابت کرنے کی اس لیے ضرورت پیش آگئی کہ آپ کی مخلصی سوا اِن کے اسلام ثابت کرنے کے مشکل۔ مصیبت تو یہ ہے اس لیے کہ آپ ان کا اسلام خواہ مخواہ ثابت کریں اور دوسری علما اس

کے نافی اب دونوں طرف علمائے اہلِ سنت والجماعۃ کا مقابلہ یہ لوگ تماشا دیکھ کر تالیاں بجارہیں۔ نہایت افسوس۔ اگر آپ اس معاملہ کو پہلے سوچ لیتے تو یہ تماشا کیوں بنتا۔[49]

آپ انھیں مزید تنبیہ کرتے ہوئے اور ثبوت اسلام کے لیے محض اشیائے ستہ کی تصدیق کو ناکافی قرار دیتے ہوئے اور تمام ضروریات دین پر ایمان ہونے کو لازم سمجھتے ہوئے لکھتے ہیں۔

جناب من یہ لوگ غالباً ملحد چکڑالوی کے پیروکار ہوں گے۔ جس کی تکفیر پر علما وسیع الظرف نے اقدام کیا ہے۔ ان کا اسلام صرف اشیائے ستہ کی تصدیق سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ اگر اشیائے ستہ کی زبانی تصدیق اور قبلہ کی طرف نماز پڑھ لینا۔ ثبوت اسلام کے لیے کافی ہیں۔ خواہ جو کچھ بھی عقیدہ صرف کرے یا زبان سے بکواس کرتا پھرے تو مرزائیوں اور رافضیوں اور وہابیوں گلابیوں نے کونسا قصور کیا ہے کہ علمائے محققین نے ان کی اعلانیہ تکفیر کر دی ہے کیا وہ اس قبلہ کی طرف نماز نہیں پڑھتے یا اشیائے ستہ کی تصدیق نہیں کرتے۔ سب کچھ کرتے ہیں مگر پھر بھی دائرہ اسلام سے خارج۔[50]

مرزائیوں اور نیچریوں کی تکفیر کو بطورِ دلیل پیش کرتے ہوئے سید گانگوی لکھتے ہیں۔

نیچریوں کو اس زمانہ کے تمام علما بلکہ حضرت شاہ اسحاق جیسے وسیع الظرف نے کفر کا حکم دے دیا تھا۔ زمانہ حال میں مولانا معین الدین اجمیری و مولانا انور شاہ صاحب مرحوم نے مرزائیوں کو صرف کافر نہیں بلکہ ملعون مردود وغیرہ القاب دیئے حالاں کہ ہیں وہ بھی وسیع الظرف اور مرزائی نہ اشیائے ستہ کے منکر ہیں۔ اور نہ ہی کسی دوسری قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔[51]

مسئلہ تکفیر میں سید غلام قاسم شاہ کی بدلتی رائے پر انھیں توجہ دلاتے ہوئے اور دیگر فرق کے متعلق ان کی سابقہ رائے کو بنیاد بناتے ہوئے سید گانگوی انھیں تلقین کرتے ہیں۔

میں حیران ہوں کہ کل تو جناب کے ہاتھ میں گلابیوں کی تکفیر کا فتویٰ تھا جو علما سے دستخط کراتے پھرتے اور آج کہتے ہیں کہ اہلِ حدیث کو میں مسلمان جانتا اور اہلِ قرآن بلاشک وشبہ مسلمان ہیں۔ ان کی تکفیر مخالفت ادلہ قطعیہ اور تنگ ظرفی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ گلابی کم از کم مقلد حنفی تو ہیں البتہ بعض مسائل میں وہابیوں سے ملنے کی وجہ سے مورد طعن و تشنیع ہیں۔ اور اہلِ حدیث جس کا دوسرا نام وہابی ان کے کارناموں سے تو زمین و آسمان کانپ رہے ہیں۔[52]

بطورِ خاص دیگر فرق کے مقابل اہلِ قرآن کی شدید انحرافی روش کو واضح کرتے ہیں۔

اہلِ قرآن جس کا دوسرا نام چکڑالوی ہے اس کی بات نہ پوچھئے تمام قرآن شریف کو الٹ پلٹ کر دیا ہے اور حدیث شریف سے قطعی انکار ہے اور رسول اللہ ﷺ مدنی کی کی نسبت وہ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو لکھنے

کو زبان اور سننے کو کان گوارہ نہیں کرتے دیکھنے ہوں۔ تو چکڑالوی تفسیر القرآن دیکھ کر اپنا جی ٹھنڈا کر سکتے ہیں۔ اب یہ تو جناب کے نزدیک بلاشبہ وشک مسلمان ہیں تو بتایئے کفر کس گدھی کا نام ہو گا اور جناب کو فقہ اکبر کی عبارت اور لا نکفر واہل القبلۃ کی غلط فہمی ہوئی اس کو محققین اصول کی کتابیں دیکھ کر تشفی کر لینی چاہیے اور آیۃ شریفہ فلاوربک آہ کے غور کرنے سے غالباً بہت مشکوک رفع ہو سکتے ہیں۔ ہذا والباقی عند التلاقی۔ از ملال تو خائف شدم۔۔۔ اور جناب کے استفتا کو مختصر کر کے جواب از خود لکھا گیا ہے جس سے جناب کا دامن اس لوث سے مبرا ہو جائے گا۔ اُمید ہے کہ اس کو احترام اور وقعت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ فقط، احمد الدین گانگوی۔[۵۲]

حواشی

۱۔ اختر راہی، تذکرہ علمائے پنجاب، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۴۱
۲۔ چشتی، مولانا محمد عبدالمالک، جمال فقر، بار سوم، ۲۰۱۳ء، انجمن اکبریہ، میانوالی، ص ۷۱-۷۴
۳۔ مظاہری، مولانا علی محمد، علماو صلحا (تاریخ میانوالی)، ص ۲۶۳
۴۔ اختر راہی، تذکرہ علمائے پنجاب، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۶۴۲
۵۔ مظاہری، مولانا علی محمد، علماو صلحا (تاریخ میانوالی)، ص ۲۶۳
۶۔ سید طارق مسعود، تاریخ اولیاء میانوالی، ص
۷۔ قاضی محمد ظفر ذبیح، فیض قمر الاولیاء، ص ۱۳۴-۱۳۵
۸۔ قاضی محمد ظفر ذبیح، وظیفہ قمریہ، ص ۱۱۹
۹۔ قاضی محمد ظفر ذبیح، فیض قمر الاولیاء، ص ۱۳۶
۱۰۔ ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی، تاریخ میانوالی، ص ۲۶۰
۱۱۔ قاضی محمد ظفر ذبیح، فیض قمر الاولیاء، ص ۱۳۹
۱۲۔ ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی، تاریخ میانوالی، ص ۲۶۰
۱۳۔ شیخ محمد اکرام، موج کوثر، ص ۷۰
۱۴۔ مولانا عبد اللہ چکڑالوی، برہان الفرقان علی صلوٰۃ القرآن، لاہور، سر سید ریسرچ اکیڈمی لاہور ۲۰۰۷، ص ۴۱۵
۱۵۔ مولانا عبد اللہ چکڑالوی، ترجمہ القرآن بایات الفرقان، ج ۱، ص ۱
۱۶۔ ایضاً، ص ۳

۱۷۔ ایضاً، ص۹۶۔۹۷

۱۸۔ مولانا عبد اللہ چکڑالوی،، ترجمہ القرآن بآیات الفرقان، ج ا ص۹۷۔۹۸

۱۹۔ ایضاً

۲۰۔ ایضاً، ص۴۵

۲۱۔ مولانا عبد اللہ چکڑالوی، ترجمہ القرآن بآیات الفرقان، ج ا، ص۱۸۷

۲۲۔ ایضاً، ص۱۷۹

۲۳۔ ایضاً، ص۱۶۳

۲۴۔ سورۃ النمل، ۸۲

۲۵۔ سوۃ النساء، ۱۲

۲۶۔ سورۃ الاحزاب ۲۸

۲۷۔ مولانا عبد اللہ چکڑالوی، ترجمہ القرآن بآیات الفرقان، ج ا، ص۳۸

۲۸۔ سورۃ البقرہ، ۱۹۶

۲۹۔ مولانا عبد اللہ چکڑالوی،، ترجمہ القرآن بآیات الفرقان، ج ا، ص۳۸

۳۰۔ مولوی عبد اللہ چکڑالوی اہل قرآن، برہان الفرقان علیٰ صلوٰۃ القرآن، ۲۰۰۷ء، آصف پرنٹرز لاہور، ص۱۵-۱۶

۳۱۔ مولوی عبد اللہ چکڑالوی اہل قرآن، برہان الفرقان علیٰ صلوٰۃ القرآن، ص۶۹

۳۲۔ ایضاً، ص۸۷-۸۸

۳۳۔ ایضاً، ص۱۰۸

۳۴۔ ایضاً، ص۲۵۲

۳۵۔ مولوی عبد اللہ چکڑالوی اہل قرآن، برہان الفرقان علیٰ صلوٰۃ القرآن، ص۲۷۷

۳۶۔ ایضاً

۳۷۔ قاضی محمد ظفر ذبیح، گلدستہ ذبیح، ص۱۱۷

۳۸۔ قاضی محمد ظفر ذبیح، گلدستہ ذبیح، ص۱۱۷

۳۹۔ سید احمد الدین گانگوی، لوامع الضیاء، قلمی، ص۱۳

۴۰۔ قاضی محمد ظفر ذبیح، فیض قمر الاولیاء، ص۱۴۰

۴۱۔ قاضی محمد ظفر ذبیح، فیض قمر الاولیاء، ص۱۴۰

۴۲۔ ایضاً

۴۳۔ ایضاً

۴۴۔ قاضی محمد ظفر ذبیح، فیض قمر الاولیاء، ص ۱۴۰

۴۵۔ ایضاً

۴۶۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۴۷۔ ایضاً

۴۸۔ گانگوی مجموعہ مکاتیب، قلمی، میانوالی، شمس العلوم لائبریری، ش ۳۰، م ن ۱۳۰

۴۹۔ ایضاً

۵۰۔ گانگوی مجموعہ مکاتیب، قلمی، میانوالی، شمس العلوم لائبریری، ش ۳۰، م ن ۱۳۰

۵۱۔ ایضاً

۵۲۔ ایضاً

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز علیہ الرحمہ کے علمی وادبی آثار

علامہ محمد طفیل احمد مصباحی☆

قطب الاقطاب، شیخ المشائخ، ابو الفتح، صدر الدین، ولی الاکبر الصادق سید محمد حسینی عرف حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز قدس سرہ (متوفیٰ: ۸۲۵ھ) کی تہہ دار فکر و شخصیت بہت سارے فضائل و کمالات اور نوع بہ نوع اوصاف و خصوصیات کی جامع تھی۔ آپ شریعت و طریقت کے مجمع البحرین تھے۔ علم و حکمت، فضل و کمال، سلوک و عرفان، طریقت و معرفت، ولایت و روحانیت اور زہد و تقویٰ کی ساری خوبیاں ایک مرکز پر سمٹ آئی تھیں، جن کے سبب آپ کی شخصیت فائق الاقران بن گئی تھی۔ آپ کی ذات اپنے اندر بڑی کشش اور وسعت و جامعیت رکھتی ہے۔ آپ جامع العلوم والفنون اور جامع الحیثیات والکمالات تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے اپنے وقت کے اکابر علما و مصنفین اور عظیم المرتبت مشائخ طریقت نے آپ کے علم و ولایت اور بلند علمی و روحانی مقام کا کھلے دِل سے اظہار و اعتراف کیا ہے۔ غوث العالم حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی علیہ الرحمہ جیسی عظیم المرتبت ہستی جو علم و حکمت کے جبلِ شامخ اور بحر ولایت و روحانیت کے غواص تھے، آپ کی علمی و روحانی عظمتوں کو یوں اجاگر فرماتے ہیں :

در سیر نخستیں کہ بہ جانبِ دیارِ دَکن واقع شد، ملازمتِ حضرت میر سید محمد گیسو دراز کردیم بہ غایت عالی شان یافتم و تصنیفاتِ بسیار از آں حضرت سر بر زدہ............ چوں بشرفِ ملازمت حضرت میر سید محمد گیسو دراز مشرف شدم، آں مقدار حقائق و معارف کہ از خدمتِ وے بہ حصول پیوست اندیچ مشائخ دیگر نہ بود۔ سبحان اللہ چہ جذبہ ٔ قوی داشتہ اند۔ یعنی دکن کی پہلی سیر کے دوران ہم میر سید محمد گیسو دراز کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھیں ہم نے عظیم المرتبت اور عظیم الشان بزرگ پایا۔ حضرت کے قلم سے بہت ساری کتابیں وجود میں آئی ہیں۔ جب میں حضرت میر سید محمد گیسو دراز کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان سے ایسے ایسے حقائق و معارف حاصل ہوئے کہ دوسرے مشائخ سے نہ ہوئے۔ سبحان اللہ! وہ کیا قوی جذبہ رکھتے تھے۔

(بزم صوفیہ بحوالہ مراۃ الاسرار، ص:۵۰۸، ناشر: دار المصنفین، اعظم گڑھ)

ولادت، نام ونسب، تعلیم وتربیت

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز علیہ الرحمہ کی ولادت ۷۲۱ ہجری میں بمقام دہلی ہوئی۔ جس وقت حضرت نظام الدین اولیاء کا وصال ہوا، آپ چار سال کے تھے۔ نسبی لحاظ سے آپ کا تعلق حسینی سادات سے ہے۔ بائیسویں پشت میں جاکر آپ کا سلسلۂ نسب حضور نبی اکرم ﷺ سے مل جاتا ہے۔ "سیر محمدی" (جو خواجہ بندہ نواز گیسو دراز علیہ الرحمہ کی حیات و خدمات اور احوال و آثار

☆ مدیر مسئول: ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور، بھارت

پر لکھی گئی سب سے مستند اور قدیم کتاب سمجھی جاتی ہے) میں آپ کا شجرۂ نسب یوں بیان کیا گیا ہے۔

سید السادات، منبع السعادات، صدر الملۃ والدین، الولی الاکبر الصادق ابو الفتح سید محمد بن یوسف بن علی بن محمد بن یوسف بن حسن بن محمد بن علی بن حمزہ بن داؤد بن زید بن ابو الحسن الجندی بن حسین بن ابی عبد اللہ بن محمد بن عمر بن یحییٰ بن حسین بن زید المظلوم بن علی اصغر زین العابدین بن الحسین السبط الشہید بن فاطمۃ بنت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

(سیر محمدی، ص:۷، مطبوعہ: یونانی دواخانہ پریس، الہٰ آباد)

چار سال کی عمر میں اپنے والد شیخ یوسف بن علی کے ہمراہ دہلی سے دولت آباد چلے گئے اور وہیں اپنے والد اور دادا سے ابتدائی تعلیم و تربیت پائی۔ ۱۶۔ سال کی عمر میں اپنی والدہ اور بھائی حسین بن یوسف کے ہمراہ دہلی تشریف لے گئے۔ اس وقت دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاء کے خلیفۂ اعظم حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کی ولایت کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ایک روز حضرت گیسو دراز، خواجہ چراغ دہلوی کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی خواہش ظاہر کی۔ چراغ دہلوی نے ان کی ذہانت وطباعی اور حسنِ گفتار و کردار کی تعریف کے ساتھ باطنی علوم سے قبل ظاہری علوم کی تکمیل کا مشورہ دیا، جسے آپ نے قبول کرتے ہوئے دینی علوم کی تحصیل میں لگ گئے۔ حضرت علامہ سید شرف الدین کیتھلی، حضرت علامہ تاج الدین المقدم اور فقیہِ دوراں حضرت علامہ قاضی عبد المقتدر الکندی علیہم الرحمہ سے خواجہ گیسو دراز نے مروجہ علومِ درسیہ وفنونِ ادبیہ کی تحصیل و تکمیل فرمائی۔ آپ نے سب سے زیادہ علمی استفادہ قاضی عبد المقتدر الکندی سے کیا اور ان سے الشمسیہ، الصحائف، مفتاح العلوم، ہدایہ، اصولِ بزدوی اور تفسیر کشاف جیسی اہم کتابیں پڑھ کر علم و فضل میں یگانۂ روزگار ہو گئے۔

ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے باطنی علوم حاصل کر کے "شیخ المشائخ" اور "قطب الاقطاب" کے مقامِ رفیع پر فائز ہوئے۔ نیز اپنے فضل و کمال، علمی تبحر، ذہانت و فطانت اور زہد و تقویٰ کے سبب آپ بہت جلد حضرت چراغ دہلوی کے مقرب اور منظورِ نظر مرید و خلیفہ بن گئے۔ آپ کے پیر و مرشد حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کی وفات ۷۵۷ھ میں ہوئی۔ اس کے بعد آپ ایک زمانے تک دہلی میں رہے اور اپنے علم و روحانیت سے بندگانِ خدا کو فائدہ پہنچاتے رہے اور ۸۰۱ھ میں جب کہ امیر تیمور نے دہلی پر حملہ کیا، آپ دہلی سے ہجرت کر کے دَکن کی طرف روانہ ہو گئے۔ گوالیار، چندیری، بڑودہ اور کھمبات ہوتے ہوئے گجرات گئے اور پھر دولت آباد کے راستے گلبرگہ شریف پہنچے اور اس مقام کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے رشکِ جنت بنا دیا اور اپنی بے مثال دینی، علمی، روحانی، دعوتی اور تصنیفی خدمات سے پورے عہد کو متاثر کیا۔

(تذکرہ علمائے پاکستان وہند، ص:۲۹۳ / ۲۹۵، مطبوعہ: تخلیقات، مزنگ روڈ، لاہور)

گلبرگہ آنے اور یہاں مستقل قیام کرنے کے بعد آپ کے وعظ و ارشاد، تعلیم و تبلیغ، تصنیفی خدمات اور علمی مشاغل کے حوالے سے بابائے اردو مولوی عبد الحق لکھتے ہیں:

شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے خلیفہ و مرید سید محمد بن سید یوسف الحسنی الدہلوی (وفات:۸۲۵ھ) تھے جو "گیسو دراز" کے لقب سے مشہور ہیں۔ یہ اپنے پیر و مرشد کی وفات کے بعد جب ۸۰۱ھ / ۱۳۹۸ء میں گجرات کے رستے مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے دکن روانہ ہوئے تو شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے بہت سے مرید ان کے ہمراہ ہو لیے اور اس قافلہ کے ساتھ سن ۸۱۵ھ میں حوالی حسن آباد، گلبرگہ میں فائز ہوئے۔ وہ زمانہ فیروز شاہ بہمنی کا تھا۔ بادشاہ کو جب فیروز آباد میں آپ کے آنے کی خبر ہوئی تو تمام ارکان و امرائے دولت اور اپنی اولاد کو ان کے استقبال کے لیے بھیجا۔ بادشاہ کا بھائی احمد خاں خانخاناں جو بعد میں اس کا جانشیں ہوا، خواجہ بندہ نواز کا بہت بڑا معتقد ہو گیا۔ آپ نے اپنی بقیہ زندگی یہیں بسر کی اور سرزمینِ دکن کو اپنی تعلیم و تلقین سے فیض پہنچاتے رہے۔ حضرت، صاحبِ علم و فضل اور صاحبِ تصانیف بھی تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ نمازِ ظہر کے بعد طلبہ اور مریدوں کو حدیث اور تصوف و سلوک کا درس دیا کرتے تھے اور گاہے گاہے درس میں کلام و فقہ کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ جو لوگ عربی و فارسی سے واقف نہ تھے، ان کے سمجھانے کے لیے ہندی (اردو) زبان میں تقریر فرماتے تھے۔

(اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص:۲۲، مطبوعہ: انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان)

"گیسو دراز" کی وجہِ تسمیہ

قطب الاقطاب حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا اصل نام "سید محمد" ہے، لیکن "بندہ نواز گیسو دراز" سے مشہور ہیں۔ صاحبِ تذکرۂ علمائے ہند کے بیان کے مطابق آپ کو "گیسو دراز" اس لیے کہا جاتا ہے کہ ایک دن آپ نے کچھ لوگوں کے ساتھ اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کی پالکی اٹھائی ہوئی تھی، پالکی اٹھاتے وقت آپ کے گیسو (بال) جو قدرے لمبے تھے، پالکی میں پھنس گئے۔ آپ نے شیخ کی تعظیم و ادب اور غلبۂ عشق کی وجہ سے بال کو پالکی سے چھڑانے کی کوشش نہیں کی اور سارا سفر اسی حالت میں طے کیا۔ جب آپ کے پیر و مرشد کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس حسنِ ادب سے بہت خوش ہوئے اور یہ شعر پڑھا:

ہر کہ مریدِ سیدِ گیسو دراز شد
واللہ خلاف نیست آں عشق باز شد

اس کے بعد سے آپ کا لقب "گیسو دراز" پڑ گیا اور عوام و خواص آپ کو اسی نام سے یاد کرنے لگے۔

(تذکرۂ علمائے ہند فارسی، ص:۸۲، مطبوعہ: منشی نولکشور، لکھنؤ)

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا علمی مقام و مرتبہ

قطب الاقطاب حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز قدس سرہ جامعِ معقول و منقول، ماہر شریعت و طریقت اور بلند علمی مقام رکھنے والے عالم و صوفی تھے۔ آپ کا شمار جلیل القدر اصحابِ طریقت اور مایۂ ناز رجالِ علم و معرفت میں ہوتا ہے۔ باطنی علوم کے ساتھ

ظاہری علوم وفنون میں بھی آپ کا پایہ کافی بلند تھا۔ آپ کی علمی جلالت تاریخی مسلمات سے ہے۔ آپ کی گراں قدر تصانیف اور آپ کی نوکِ قلم سے وجود میں آنے والے مختلف علوم وفنون پر مشتمل تقریباً ایک سو کتب ورسائل اس بات کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے کافی ہے کہ آپ صرف مسندِ ولایت وروحانیت کے ہی صدر نشیں نہ تھے، بلکہ اپنے وقت کے جلیل القدر عالم وفاضل، بلند پایہ محدث و مفسر، بے مثال فقیہ، محقق و مفکر اور اعلیٰ درجہ کے مصنف بھی تھے۔ مروجہ دینی وادبی علوم کے جملہ شعبوں پر آپ کی نظر تھی۔ کسی بھی علمی موضوع پر مجتہدانہ شان اور عالمانہ طمطراق کے ساتھ گفتگو فرماتے تھے۔ آپ کے مجموعۂ ملفوظات "جوامع الکلم" کا مطالعہ کرنے والے قارئین آپ کی علمی جلالت اور عالمانہ شان وشوکت کا اعتراف کرنے پر خود کو مجبور پائیں گے۔ جناب محمد علی خاں مجددی نقشبندی آپ کی علمی جلالت، علوم وفنون میں مہارت وحذاقت، اجتہادی فکر وبصیرت اور آپ کے عالمانہ جاہ وجلال پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے کے وہ جلیل القدر عارف اور ولیِ کامل تھے کہ ان کی عظمت وجلالت کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ آپ جامع کمالاتِ ظاہری وباطنی تھے۔ علومِ ظاہری میں نہایت اونچا درجہ رکھتے تھے۔ حضرت خواجہ گیسو دراز نے بڑی اور چھوٹی تقریباً ایک سو پانچ (۱۰۵) کتابیں تصنیف فرمائیں۔ آپ اپنے عہد کے ایک عظیم ترین قطبِ کامل اور عارف وواصل ہوئے ہیں۔ آپ شریعت وطریقت کے جامع اور حقیقتِ حق واسرارِ حقیقت کے محرمِ راز تھے۔ آپ یکتائے روزگار تھے اور ایک ایسا مقام رکھتے تھے جس کی نظیر اولیائے کرام میں بہت کم یاب ہے۔ آپ علوم وفنون میں ایک کامل واکمل محققِ زمانہ تھے۔ تمام علومِ مشرقی، ادبِ عربی وفارسی، علومِ دینی، تفسیر وحدیث، فقہ واصولِ فقہ، کلام وبلاغت ومعانی، علومِ عقائد وعلومِ حکمت میں آپ ایک امامِ وقت اور مجتہدِ عصر کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کا فیضانِ علمی ہر وقت جاری رہتا تھا اور ہمیشہ درس وتدریس کے ذریعہ تحقیقاتِ علمیہ کا انکشاف ہوتا رہتا تھا۔ آپ علوم وفنون میں درجۂ کمال رکھنے کی وجہ سے اکثر مشائخِ چشت بلکہ اپنے زمانے کے تمام کاملین میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔

آپ نے علومِ حقائق اور علومِ اسرارِ باطن میں وہ موشگافیاں کی ہیں کہ آج منتہی اور صفِ اول کے علما ان کو سمجھ ہی لیں تو وہ بہت کامیاب عالم کہلائیں گے۔ آپ کے سامنے تمام علوم صف بستہ کھڑے رہتے تھے اور جس علم وفن پر آپ اظہارِ خیال فرماتے تھے، یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا اسی علم کے خاص ماہر ہیں۔ علومِ حکمت اور علومِ فلسفہ میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔

(سوانح حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، ص: ۲۲ / ۲۳، مطبوعہ: کمرشیل بک ڈپو، حیدر آباد)

خواجہ بندہ نواز کی قلمی وتصنیفی خدمات

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز علیہ الرحمہ کو اولیائے چشت اہلِ بہشت میں یہ امتیاز وانفراد بھی حاصل ہے کہ آپ کثیر التصانیف عالم وصوفی گذرے ہیں۔ آپ نے مختلف موضوعات پر ایک سو سے زیادہ کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔ سلطان المحققین، مخدوم جہاں حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری، غوث العالم، محبوبِ حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی اور قطب الاقطاب حضرت خواجہ

بندہ نواز گیسو دراز علیہم الرحمۃ والرضوان کا زمانہ قریب قریب ایک ہے اور یہ تینوں بزرگ کثیر التصانیف ہوئے ہیں۔ خواجہ بندہ نواز علیہ الرحمہ کی پوری زندگی درس و تدریس، تعلیم و تلقین، دعوت و تبلیغ، تصنیف و تالیف اور بندگانِ خدا کی ہدایت و اصلاح میں بسر ہوئی۔ آپ نے بیک وقت تقریر و تحریر دونوں مورچوں کو سنبھالا اور اسلام کی ترویج و اشاعت کے حوالے سے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ آپ نے تصنیفی میدان میں جو گراں قدر نقوش چھوڑے ہیں، ان کی تجلیوں سے ایوانِ شریعت و طریقت میں آج بھی اُجالا پھیلا ہوا ہے۔"

تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند" کے مقالہ نگار ڈاکٹر احسان الٰہی رانا مستند کتبِ تذکرہ و سوانح کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

برِ صغیر پاک و ہند میں اشاعتِ اسلام اور روحانی ہدایت کے ساتھ ساتھ عربی زبان اور اسلامی علم کی شاندار خدمات انجام دینے والے متشرع صوفیوں میں سید محمد بن یوسف بن علی دہلوی ثم گلبرگوی عرف سید بندہ نواز گیسو دراز کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا .... تصوف اور تبلیغ کے ساتھ ایک سو پچیس (۱۲۵) کتابیں تصنیف کرنا، یقیناً ایک غیر معمولی کارنامہ ہے اور خصوصاً اس دور میں جب کہ صوفیائے کرام کے لیے عبادت و ریاضت، اوراد و وظائف اور غیر مسلموں میں تبلیغِ اسلام کے علاوہ کسی دوسرے کام کے لیے وقت نکالنا، ایک مشکل کام تھا۔

(علمائے پاکستان و ہند، ص:۲۹۳، مطبوعہ: تخلیقات، مزنگ روڈ، لاہور)

"صاحبِ سیر محمدی" اور "مصنفِ بزمِ صوفیہ" کے بیان کے مطابق آپ کے تحریر کردہ کتب و رسائل کے نام یہ ہیں :

(۱) ملتقط :

یہ قرآن کریم کی صوفیانہ تفسیر ہے۔ اس میں صوفیانہ و عارفانہ رنگ میں قرآنی آیات کی توضیح و تشریح بیان کی گئی ہے۔

(۲) تفسیرِ کلام پاک :

یہ تفسیر کشاف کی طرز پر صرف پانچ پاروں کی تفسیر ہے۔

(۳) حواشی تفسیر کشاف :

یہ جار اللہ زمخشری کی بلند پایہ تصنیف "تفسیرِ کشاف" پر گراں قدر حواشی ہے، جو بیش قدر علمی و تفسیری مباحث پر مشتمل ہے۔

(۴) شرحِ مشارق الانوار :

حدیث کی مشہور کتاب "مشارق الانوار" کی عالمانہ و محققانہ توضیح و تشریح۔

(۵) ترجمہ مشارق الانوار :

یہ مشارق الانوار کا فارسی ترجمہ ہے۔

(۶) معارف :

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی علیہ الرحمہ کی مشہور آفاق کتاب "عوارف المعارف" کی عربی شرح۔

(۷) ترجمہ عوارف :

یہ عوارف المعارف کی فارسی شرح ہے، لیکن "ترجمہ عوارف" سے مشہور ہے۔

(۸) شرحِ تعرّف :

حضرت شیخ ابو بکر محمد بن ابراہیم بخاری نے "تعرف" کے نام سے تصوف کی ایک معرکۃ الآراء کتاب لکھی ہے۔ یہ اسی کی شرح ہے۔

(۹) شرحِ آداب المریدین (عربی) :

حضرت شیخ ضیاء الدین ابو النجیب عبد القادر سہر وردی علیہ الرحمہ کی مشہور اور بلند تصنیف "آداب المریدین" کی فاضلانہ عربی شرح۔

(نوٹ): سلطان المحققین، مخدوم جہاں حضرت شیخ شرف الدین احمد یحیٰی منیری علیہ الرحمہ نے بھی شیخ ضیاء الدین ابو النجیب سہر وردی کی مذکورہ کتاب "آداب المریدین" کی گراں قدر شرح فارسی زبان میں "شرحِ آداب المریدین" کے نام سے لکھی ہے اور راقم الحروف کے مطالعے میں آچکی ہے۔ الحمد للہ!

(۱۰) شرحِ آداب المریدین (فارسی):

یہ حضرت بندہ نواز گیسو دراز علیہ الرحمہ کی تحریر کردہ "آداب المریدین" کی فارسی شرح ہے، جس کو مولانا سید حافظ عطا حسین مرحوم نے مرتب کر کے حیدر آباد سے شائع کیا ہے۔

(۱۱) شرحِ فصوص الحِکم :

یہ کتاب حضرت شیخ محیی الدین ابن عربی علیہ الرحمہ کی مشہور زمانہ تصنیف "فصوص الحِکم" کی شرح ہے اور اپنے موضوع پر ایک شاہکار تصنیف مانی جاتی ہے۔

(۱۲) شرحِ تمہیدات عین القضاۃ ہمدانی :

یہ کتاب حضرت ابو المعانی عبد اللہ المعروف بہ عین القضاۃ ہمدانی کی مشہور صوفیانہ تصنیف "تمہیدات" کی محققانہ توضیح و تشریح پر مشتمل ہے۔

(۱۳) ترجمہ رسالہ قشیریہ :

امام التصوف حضرت شیخ ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن القشیری کے "رسالہ قشیریہ" کا فارسی ترجمہ۔

(۱۴) حظائر القدس :

اس کتاب کو "عشق نامہ" بھی کہتے ہیں۔ اس کا ایک قدیم نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔

(۱۵) رسالہ استقامۃ الشریعت بطریقۃ الحقیقت:

اس میں شریعت، طریقت اور حقیقت کے دقیق علمی مباحث بیان کیے ہیں۔ انڈیا آفس کے فارسی مخطوطات کی فہرست میں اس کتاب کا ذکر ہے۔

(۱۶) ترجمہ رسالہ شیخ محی الدین ابن عربی:

(۱۷) رسالہ سیر النبی ﷺ:

(۱۸) شرحِ فقہِ اکبر (عربی و فارسی)

یہ علمِ توحید و کلام کے موضوع پر امام الائمہ، سراج الامۃ، حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کی کتاب "فقہِ اکبر" کی شرح ہے۔

(۱۹) حواشی قُوتُ القلوب:

حضرت امام طالب بن محمد بن ابی الحسن بن علی کی مشہور کتاب "قوت القلوب" پر مفید اور گراں قدر حواشی

(۲۰) اسماء الاسرار:

اس کتاب کو جناب مولانا سید عطا حسین مرحوم نے حیدر آباد سے شائع کیا ہے۔ یہ اپنے موضوع پر ایک لاجواب تصنیف ہے۔ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز علیہ الرحمہ خود اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: "میری کتاب اسماء الاسرار میں باطل کو نہ آگے سے آنے کا موقع ہے اور نہ پیچھے سے۔ کوئی اس سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ اس میں توحید کی تجرید اور تفرید کے افراد کے سوا کچھ نہیں"۔

مولانا سید عطا حسین صاحب مرحوم، جو اس کتاب کے مرتب و محقق ہیں، لکھتے ہیں۔

اس کتاب کے متعلق بعض بزرگوں کا خیال بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ فنِ تصوف و سلوک و معارف میں ہندوستان میں اس سے بہتر اور اعلیٰ تر کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔ یہ کتاب مبتدی، متوسط اور منتہی سب کے لیے مفید ہے۔ اس میں ذکر ہے، شغل ہے، مراقبہ ہے، مراتبِ سلوک کا بیان ہے۔ عشق ہے، توحید ہے، حقائق و معارف ہیں۔ غرض کہ سب کچھ ہے۔

(۲۱) حدائق الانس:

اس میں حقیقت و معرفت کے کچھ رموز و اسرار بیان کیے گئے ہیں۔

علاوہ ازیں آپ کے حسبِ ذیل کتب و رسائل ہیں، جن کے موضوعات ان کے نام سے ظاہر ہیں:

(۲۲) ضرب الامثال (۲۳) شرحِ قصیدۂ امالی (۲۴) شرحِ عقیدۂ حافظیہ

(۲۵) عقیدۂ چند ورق (۲۶) رسالہ دربیانِ آدابِ سلوک (۲۷) رسالہ دربیانِ اشاراتِ محبان

(۲۸) رسالہ دربیانِ ذکر (۲۹) رسالہ دربیانِ "رأیت ربی فی احسنِ صورۃ"

(۳۰) رسالہ در بیانِ معرفت　　　(۳۱) رسالہ در بیانِ بود و ہست و باشد۔

"سیر محمدی" کے مؤلف نے ان خلافت ناموں کو بھی آپ کی تصانیف میں شمار کرایا ہے، جو حضرت بندہ نواز گیسو دراز علیہ الرحمہ نے اپنے خلفا کو لکھ کر دیے تھے۔ ان تحریری خلافت ناموں کی تعداد چار ہے۔ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے فارسی مخطوطات کے مطابق حضرت گیسو دراز کے مزید کچھ رسائل کے نام یہ ہیں۔

رسالہ در تصوف۔　　شرح بیت امیر خسرو دہلوی۔　　رسالہ اذکارِ خانوادۂ چشتیہ۔

وجود العاشقین۔

بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے فارسی مخطوطات میں آپ کی ایک تصنیف "خاتمہ" کا بھی ذکر ہے۔ یہ بظاہر تو شرحِ آداب المریدین کا تکملہ یا ضمیمہ ہے، لیکن بجائے خود ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس رسالے میں آپ نے اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق ایک سالک کے لیے عبادات و معاملات کا لائحۂ عمل پیش کیا ہے، جو آج بھی ذوق و شوق کے ساتھ پڑھی جاسکتی ہے۔

(بزمِ صوفیہ، ص:۵۰۹ تا ۵۱۲، مطبوعہ: دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ)

بابائے اردو مولوی عبد الحق نے اپنی کتاب "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں "معراج العاشقین" کا نمونۂ نثر پیش کرنے کے بعد آخر میں ص:۲۳ / ۲۴ پر لکھا ہے کہ "علاوہ اس رسالے کے میرے پاس آپ کے اور متعدد رسالے اس زبان (دکنی / قدیم اردو) میں ہیں۔ "تلاوت الوجود"، "در الاسرار"، "شکار نامہ"، "تمثیل نامہ"، "ہشت مسائل" وغیرہ۔

اگر چہ زبان ان کی قدیم ہے۔ لیکن یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انھیں کی تصنیف ہیں یا ان سے منسوب ہیں"۔ ماہنامہ "شہباز" گلبرگہ میں شائع سید مبارز الدین رفعت کے تحقیقی مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے "معراج العاشقین" کے علاوہ مزید چھ کتابیں اردو زبان میں تحریر فرمائی ہیں، جو حسبِ ذیل ہیں:

(۱) شکار نامہ　　(۲) رسالہ سہ بارہ　　(۳) ہدایت نامہ　　(۴) تلاوت الوجود

(۵) ہشت مسائل　　(۶) تمثیل نامہ۔

(ماہنامہ شہباز، گلبرگہ شریف، جنوری و فروری ۱۹۶۲، ص:۱۰)

مولانا حافظ سید عطا حسین صاحب کی تحقیق و تصحیح کے ساتھ حضرت خواجہ بندہ نواز کے گیارہ فارسی کتب و رسائل کا جو مجموعہ "مجموعۂ یازدہ رسائل" کے نام سے انتظامی پریس، حیدر آباد، دکن سے شائع ہوا ہے، اس میں مندرجہ ذیل کتب و رسائل موجود ہیں:

(۱) تفسیر سورۂ فاتحہ شریف　　(۲) استقامت الشریعت بطریق الحقیقت

(۳) رسالہ در مسئلۂ رویتِ باری تعالیٰ و کراماتِ اولیا　　(۴) حدائق الانس

(۵) رسالہ توحیدِ خواص　　(۶) رسالہ منظوم در اذکار

(۷)رسالہ مراقبہ (۸)رسالہ اذکارِ چشتیہ

(۹)شرح بیت حضرت امیر خسرو دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

(۱۰)برھان العاشقین معروف بہ قصہ چہار برادر و مشہور بہ "شکار نامہ"

(۱۱)وجود العاشقین۔ "برھان العاشقین "معروف بہ قصہ چہار برادر و مشہور بہ " شکار نامہ " ۔

یہ محض ایک صفحہ کا مختصر مضمون ہے، جس میں خواجہ بندہ نواز نے حقیقتِ انسانی کا ابتدائے آفرینش سے انتہائے کارِ دنیاوی(موت)تک کا خاکہ بے حد لطیف اور اچھوتے پیرائے میں کھینچا ہے۔ صوفیا حضرات میں آپ کا یہ مختصر رسالہ اس قدر مقبول ہوا کہ متعدد اکابرِ طریقت نے اس کی مختصر اور مطوّل شرحیں لکھی ہیں۔ اس کے شارحین میں میر سید عبد الواحد بلگرامی، میر سید محمد کالپوی اور شاہ رفیع الدین محدث دہلوی جیسے اکابرین شامل ہیں، جس سے رسالے کی اہمیت و افادیت ظاہر ہوتی ہے۔

مکتوبات وملفوظات

مذکورہ کتب و رسائل کے علاوہ خواجہ بندہ نواز کے چھیاسٹھ مکتوبات (۶۶) پر مشتمل ایک مجموعہ بھی ہے، جسے آپ کے خلیفہ شیخ ابو الفتح علاء الدین نے مرتب کیا ہے۔ جناب سید عطا حسین صاحب کے بقول: اس مجموعہ میں حضرت خواجہ بندہ نواز کے چھیاسٹھ(۶۶)مکتوبات ہیں۔ ان میں ایک مکتوب (مکتوب نمبر:۳۹)سلطان فیروز بہمنی بادشاہ گلبرگہ کے نام اور ایک مکتوب(مکتوب نمبر:۶۶)حضرت مسعود بہک چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے نام ہے۔ بقیہ سب مکاتیب مریدوں اور خلفا کو لکھے گئے ہیں۔

(مقدمہ مکتوبات خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، ص:۲، مطبوعہ: آفرین برقی پریس، حیدر آباد، سنِ اشاعت:۱۳۶۲ہجری)

نمونے کے طور پر حضرت خواجہ بندہ نواز کا صرف ایک مکتوب یہاں نقل کیا جاتا ہے، جسے آپ نے سلطان فیروز بہمنی بادشاہ گلبرگہ کو ارسال فرمایا تھا۔

مکتوب سی و نہم(مکتوب نمبر:۳۹)

"بجانب سلطان فیروز شاہ گلبرگہ"

اللھم پادشاہ ما را و شاہزدگان ما را در حفظ و عصمت خود دار و ملکت و مکنت و دستگہ پادشاہ را بہ قدر ہمت و وسعتِ دل را بخش آں بلند ہمت ما را، ہر جا کہ خصمے دشمنے است پست باد ارجو بل اتیقن کہ تقدیرِ ازلی موافقِ دعائے ماست۔ الحمد للہ علی ذالک والسلام۔

(مکتوبات خواجہ بندہ نواز گیسو دراز فارسی، ص:۸۶، مطبوعہ: آفرین برقی پریس، حیدر آباد، سنِ آشاعت:۱۳۶۲ھ)

تذکرہ و سوانح کی کتابوں میں آپ کے گراں قدر ملفوظات کے چار مجموعوں کا ذکر ملتا ہے، جن میں "جوامع الکلم" کو غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ آپ کی عبقری شخصیت، تہہ دار فکر و فن، اور مختلف علوم و فنون میں آپ کی اجتہادی بصیرت کو سمجھنے کے لیے یہی ایک کتاب کافی ہے۔ کیوں کہ اس میں علوم و معارف کا خزانہ پوشیدہ ہے۔ آپ کی نورانی و عرفانی محفل میں جس موضوع پر بھی گفتگو ہوئی ہے اور مریدین و مسترشدین نے جس قسم کے سوالات کیے ہیں، آپ نے ان کے مدلل اور تحقیقی جوابات دیے ہیں۔

قرآن، حدیث، فقہ و تفسیر اور فلسفہ و کلام کے سینکڑوں اہم اور ادق مسائل و مباحث نے اس کتاب کو اسم با مسمیٰ بنا دیا ہے۔ شائقین تصوف و سلوک کے لیے یہ مجموعۂ ملفوظات کسی نعمتِ مترقبہ سے کم نہیں ہے۔ آپ کے علمی آثار میں اس کتاب کو غیر معمولی مقام حاصل ہے

خواجہ بندہ نواز کی شاعرانہ حیثیت

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی فکر و شخصیت بڑی تہہ دار تھی۔ آپ نہ صرف محدث و مفسر، فقیہ و مفتی، صوفی، ولیِ کامل، صوفیِ مرتاض، محقق، ادیب، مصنف، نثر نگار تھے بلکہ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ آپ کے علمی و ادبی آثار کا ایک نمایاں پہلو اور قابلِ ذکر حصہ آپ کے فارسی و دکنی کلام پر مشتمل ہے۔ اس لیے اس جہت (شاعرانہ حیثیت) سے گفتگو بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔

ایک سو سے زائد نثری کتب کے مصنف ہونے کے علاوہ آپ فارسی کے ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ آپ کو اردو کے پہلے مصنف اور پہلے نثر نگار ہونے کے علاوہ دکن کے پہلے شاعر ہونے کا بھی شرف و اعزاز حاصل ہے۔ مشہور محقق اور ماہر دکنیات نصیر الدین ہاشمی نے اپنی تحقیقی کتاب "دکن میں اردو" میں حضرت خواجہ بندہ نواز کو دکن کا پہلا شاعر تسلیم کیا ہے اور لکھا ہے کہ موجودہ تحقیقات کے لحاظ سے خواجہ بندہ نواز سید محمد حسینی گیسو دراز علیہ الرحمہ متوفیٰ: ۸۲۵ھ دکن کے پہلے شاعر قرار پاتے ہیں۔

(دکن میں اردو، ص: ۴۲، مطبوعہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی)

پروفیسر خلیق انجم صاحب آپ کی شاعرانہ حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

حضرت خواجہ بندہ نواز فارسی کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ ان کا فارسی دیوان گلبرگہ سے شائع ہو چکا ہے۔ دکنی میں بھی شعر کہا کرتے تھے۔ ان کی ایک نظم "چکی نامہ" ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے، جس کی نقل میرے کرم فرما جناب محیی الدین صاحب قادری زور نے میری درخواست پر ارسال فرمائی ہے۔ اس نظم کے علاوہ بھی کچھ کلام ملتا ہے۔ میں نے تمام دکنی کلام کو یکجا کر دیا ہے۔ حضرت کا فارسی میں کوئی خاص تخلص نہیں تھا........ القاب اور کنیت کے ساتھ ان کا پورا نام "صدر الدین ابو الفتح سید محمد حسینی گیسو دراز" تھا۔ ان میں جو مناسب سمجھا، مقطع میں استعمال کر لیا اور ایک غزل کے مقطع میں یہ سب الفاظ (اسما) جمع کر دیے ہیں، چناں چہ فرماتے ہیں :

اے ابو الفتح محمد صدرِ دیں گیسو دراز مختصر کن چند نالے قصۂ خود گرد آر

لیکن اس کے برعکس دکنی شاعری میں ان کا تخلص "شہباز" تھا۔ آپ کا دکنی کلام یا تو بیماریوں کے علاج کے مختلف طریقوں پر مشتمل ہے یا پھر صوفیانہ ہے۔

(مقدمہ معراج العاشقین، مرتبہ: خلیق انجم، ص: ۸۴، ناشر: مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی)

حضرت خواجہ بندہ نواز چوں کہ "ہر فن مولیٰ" واقع ہوئے تھے، اس لیے آپ کے اندر شعر و سخن کا ملکہ بھی موجود تھا، لیکن اس فن سے آپ کو زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ ہاں! جب کبھی شاعری کی طرف طبیعت کا میلان ہوتا اور جذبۂ عشقِ صادق سے مغلوب الحال ہو جاتے تو غزلیہ اشعار زبان پر مچلنے لگتے اور نہایت قادر الکلامی کے ساتھ اشعار موزوں فرماتے۔ آپ کے فارسی مجموعۂ غزلیات "انیس العشاق" کے نام سے موسوم ہے، جس میں کُل ۳۲۷/ غزلیات، ۲۶/ اشعار کی ایک مثنوی اور ۹/ رباعیات ہیں۔ آپ کی فارسی و دکنی شاعری زبان و ادب کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔ آپ کی شاعرانہ حیثیت، ادبی مہارت اور آپ کے فارسی و دکنی کلام کے ادبی و فنی محاسن پر پی. ایچ. ڈی. کی جاسکتی ہے۔ اللہ کرے کوئی نیک بندہ سامنے آئے اور اس مرحلۂ شوق کی تکمیل فرمائے۔

"اس مرحلۂ شوق کی تکمیل ہو یارب"

دیوان کا آغاز حمدِ الٰہی سے ہوتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے عربی زبان میں ایک کلام ہے، جو حمد و نعت اور منقبتِ خلفائے راشدین پر مشتمل ہے۔ بعد ازاں آپ کے پیر و مرشد حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کی منقبت ہے۔ اس کے بعد حروفِ تہجی کے اعتبار سے غزلیہ کلام کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ راقم الحروف کا مقصد آپ کے کلام کا تجزیہ پیش کرنا نہیں، بلکہ بحیثیتِ شاعر آپ کا تعارف کرانا اور نمونۂ کلام پیش کرنا ہے۔ کلام ملاحظہ ہو۔

تعالیٰ اللہ عن قیل و قال
و عن حد و رسم والمثال
قریب ذاتہ من کل شیٔ
ولٰکن لیس یوصف باتصال
بعید ذاتہ ایضاً و لٰکن
بلا وصف التفرق و انفصال
تنزہ عن مکان حال منہ
و لا یوجد مکان عنہ خال
صلوٰۃ والسلام علی رسول
حمید احمد حسن الخصال
کریم ، راحم ، برّ ، رؤف
شریف ، شافع اہل الضلال

علیٰ اصحابِ تسلیم عبد
ذلیل خاضع ذی الابتذال

(انیس العشاق، ص:۵، مطبوعہ: گلبرگہ)

اے خداوندے کہ از جودش جہانے را وجود
اے خداوندے کہ از بودش ہمہ عالم بہ بود
اے خداوندے کہ او ذرّاتِ عالم را محیط
عالم و آدم ہم از وے یافتہ یک یک شہود
اے خداوندے کہ عینِ مابعین العین است عیاں
اے ابو الفتح! او بیامد عین ما را در ربود

(انیس العشاق، ص:۶، مطبوعہ: گلبرگہ شریف)

خواجہ بندہ نواز کو حضرت شیخ سعدی شیرازی علیہ الرحمہ سے بے پناہ عقیدت تھی۔ ان کی ایک مقبول ترین غزل کا مطلع ہے:

منزلِ عشق از جہانِ دیگر است
مردِ معنیٰ را نشانِ دیگر است

اسی غزل کی طرز پر اسی بحر اور ردیف و قافیہ میں خواجہ بندہ نواز کی بھی ایک غزل "انیس العشاق" میں موجود ہے۔ ضیافتِ طبع کے لیے دو اشعار نذرِ قارئین ہیں:

مردِ معنی از جہانِ دیگر است
گوہر لعلش ز کانِ دیگر است
کُشتگانِ غمزۂ عشاق را
ہر زماں از لطف جانِ دیگر است

علاوہ ازیں مندرجہ ذیل اشعار سلاست و روانی، نفاست و برجستگی اور وارفتگی و شیفتگی کا بے مثل نمونہ ہیں:

صباحے ، دلربائے ، مرحبائے
مبارک مطلع میموں لقائے
لبِ میگوں او یارب چہ لعل است
کہ ہر دم می چکد از وے صفائے
اگر تو پند گوئی نیک خواہی
مزیدِ درد ما را کن صفائے
بخواں الحمد و بر دل زنِ بہ فرما
مبادا دردِ ایں دل را دوائے
ہمیشہ بودہ ام معشوقِ خوباں
کنوں عاشق شدم دیدم بلائے
نمی خواہد خداوندا محمدؐ
کہ بیند عشقِ خود را انتہائے

آپ کی دکنی شاعری میں "چکی نامہ" خاصی مشہور نظم ہے، نمونے کے طور اس کے بھی چند اشعار ملاحظہ فرمائیں :

دیکھو واجب تن کی چکی
پیو چا تر ہو کے سکی
سوکن ابلیس کھنچ کھنچ تھکی
کے یا بسم اللہ ہو ھو ھو اللہ
الف اللہ اس کا دستا
میانے محمد ہو کو بستا
پہنچی طلب یوں کو دستا
کے یا بسم اللہ ھو ھو اللہ

(دیباچہ معراج العاشقین، مرتبہ: خلیق انجم، ص:۸۶)

"

معراج العاشقین "اردو کی پہلی تصنیف

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے اکثر کتب و رسائل فارسی زبان میں ہیں اور بعض عربی میں۔ لیکن "معراج العاشقین" آپ کا تحریر کردہ وہ واحد رسالہ ہے، جسے آپ نے اردو زبان میں تحریر فرمایا ہے اور یہ اُردو زبان کی سب سے پہلی کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ خواجہ بندہ نواز کی طرف اس کے انتساب کو اگر چہ بعض محققین شبہات کی نظر سے دیکھتے ہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہ آپ کی تصنیف ہے اور اردو زبان کی پہلی باضابطہ تصنیف ہے اور چوں کہ یہ اردو زبان میں لکھی گئی پہلی تصنیف ہے، اس لیے اردو کے بڑے بڑے محققین و ناقدین نے اپنی عنانِ تحقیق و تنقید اس کی جانب مبذول کی ہے۔ بابائے اردو مولوی عبد الحق، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر خلیق انجم کی تصحیح و تصویب اور تحقیق و ترتیب کے ساتھ یہ متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔

بابائے اردو مولوی عبد الحق لکھتے ہیں :

حضرت گیسو دراز صاحب تصانیفِ کثیرہ تھے۔ آپ کی کتابیں زیادہ تر فارسی میں ہیں اور بعض عربی میں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ انھوں نے عام لوگوں کی تلقین (اصلاح و ہدایت) کے لیے بعض رسالے اپنی زبان (دکنی) میں بھی لکھے۔ ان کا ایک رسالہ "معراج العاشقین" میں مرتب کر کے شائع کر چکا ہوں۔ اس کا سنِ کتابت ۹۰۶ھ ہے۔ (اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص: ۲۳، مطبوعہ: انجمن ترقی اردو، کراچی، پاکستان)

اردو زبان کے قدیم کتب و رسائل ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ لیکن خواجہ بندہ نواز کی "معراج العاشقین" کو اس لیے اہمیت و فوقیت حاصل ہے کہ یہ اردو کے پہلے مصنف اور پہلے نثر نگار کی پہلی اردو تصنیف ہے۔ اس کی نثر اردو نثر کا اولین نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب کے بعد ہی سے اردو نثر نگاری اور اردو کتب نویسی کا باضابطہ آغاز ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سید مبارز الدین رفعت اپنے تحقیقی مضمون "شکار نامہ" میں لکھتے ہیں :

گلبر گہ کو تنہا یہی شرف حاصل نہیں کہ وہ ایک قدیم تاریخی مقام ہے اور دکن کی پہلی اسلامی ریاست کا صدر مقام رہا ہے، اس کی خاک میں مختلف مذاہب کے بڑے بڑے پیشوا آسودۂ خاک ہیں۔ بلکہ اس سر زمین کو یہ بھی افتخار حاصل ہے کہ اسی سر زمین پر اردو نے پہلی بار عام بول چال کی زبان سے بڑھ کر ادبی روپ اختیار کیا اور اسی کی گود میں اردو کا اولین نثر نگار (خواجہ بندہ نواز گیسو دراز) آسودۂ خاک ہے۔ حضرت مخدوم ابو الفتح صدر الدین سید محمد حسینی خواجہ گیسو دراز بندہ نواز کو ہم سب ایک ولیِ کامل اور ایک ہادیِ اعظم کی حیثیت سے جانتے اور مانتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ وہ بہت بڑے عالمِ دین اور عربی و فارسی زبانوں کئی بلند پایہ کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ لیکن کم ہی لوگوں کو یہ بات معلوم ہو گی کہ آپ نے اردو زبان میں بھی کئی رسالے تصنیف فرمائے ہیں اور آپ کے لکھے ہوئے یہی رسالے اردو نثر کے اولین نمونے سمجھے جاتے ہیں۔ اردو زبان کے لیے یہ بڑی فالِ نیک رہی کہ آج سے تقریباً چھ سو سال پہلے اس کی ادبی نثر کی ابتدا خواجۂ دکن جیسی مطہر اور مقدس ہستی کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی۔ یہ آپ ہی جیسے ولیِ کامل کے

پاس انفاس کی برکت کا نتیجہ رہا کہ یہ زبان آگے چل کر خوب پھلی پھولی اور ہندوستان کی زبانوں میں اسے ایک اونچا اور باعزت مقام حاصل ہوا۔(ماہنامہ شہباز، گلبرگہ شریف، جنوری و فروری ۱۹۶۲ء، ص:۹)

اردو کی پہلی کتاب اور اردو نثر کا ابتدائی نمونہ ہونے کی وجہ سے " معراج العاشقین " کو لسانی حیثیت سے اردو کی اہم ترین کتاب مانی گئی ہے۔ اسی اہمیت و قدامت کے سبب یہ کتاب عرصۂ دراز سے دہلی یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کتاب کا موضوع تصوف ہے اور اس میں تصوف کا بنیادی نظریہ پانچ تن یعنی واجب الوجود، ممکن الوجود، عارف الوجود، ذکرِ جلی اور ذکرِ الٰہی پر خصوصیت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ جناب مشتاق فاروق (ریسرچ اسکالر یونیورسٹی آف حیدر آباد، تلنگانہ) اپنے مضمون میں لکھتے ہیں :

اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ہنوز " معراج العاشقین " اردو کی قدیم ترین نثری تصنیف مانی جاتی ہے۔ اس کتاب کے مصنف دکن کے مشہور و معروف اور بلند پایہ صوفی بزرگ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ہیں۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کو عربی، فارسی اور دکنی زبان پر کافی دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے کئی رسائل اور کئی کتابیں تخلیق کی ہیں۔ ان کے جملہ رسائل و کتب کی تعداد مختلف محققین نے مختلف بتائی ہے۔ لیکن ان تمام تصانیف کا موضوع تصوف، مذہب اور احکام شریعت ہے۔ لیکن ان کی تمام تصانیف میں سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت " معراج العاشقین " کو حاصل ہوئی ہے۔ یہ ایک رسالہ ہے اور تصوف اس کا بنیادی محور و مرکز ہے۔ یہ کتاب دلیؔ یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں بہت عرصے سے شامل ہے، جس سے اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس رسالے میں قرآن واحادیث کے ذریعے مسلکِ تصوف کو بہتر طور پر سمجھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ تصوف کے ایک مخصوص نظریہ پانچ تن یعنی واجب الوجود، ممکن الوجود، عارف الوجود، ذکر جلی اور ذکر حق کے ذریعے ایک انسان کس طرح واجب الوجود تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔

" معراج العاشقین " اردو کی پہلی نثری کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ اسے سب سے پہلے مولوی عبد الحق نے مرتب کر کے مع مقدمہ ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۹۲۷ء میں دو قلمی نسخوں کی مدد سے شائع کیا ہے.

بہ ہر کیف ! اس مختصر سے مقالے میں " معراج العاشقین " پر تفصیلی روشنی ڈالنا ممکن نہیں، مقصد صرف تعارف پیش کرنا ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر کتاب کے آغاز و اختتام کی عبارت پیش کی جاتی ہے، تاکہ کتاب میں موجود اردو کے اولین نثری نمونے کا اندازہ ہو سکے۔

نمونہ نثر

(الف) قال نبی علیہ السلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) : کہے انسان کے بوجنے کوں پانچہ تن۔ ہر ایک تن کوں پانچ دروازے ہیں۔ ہور پانچ دروازے ہیں۔ پیلا تن : واجب الوجود، مقام اس کا شیطانی۔ نفس اس کا امارہ یعنی واجب کے آنک سوں غیر نہ دیکھنا سو۔ حرص کے

کان سوں غیر نہ سناسو۔ حسد تک سوں بد بوئی نہ لیناسو۔ بغض کے زبان سوں بد بوئی نہ لیناسو۔ کینا کے شہوت کوں غیر جاکا خرچناسو۔ پیر طبیب کامل ہونا نبض پچھان کو دوادینا۔

طبیبِ عشق راد کاں کدام است علاج جاں کند اُو را چہ نام است

پیر منع کئے سو پرہیز کرنا۔ مراقبہ کی گولی مشاہدے کے کانسے میں میکائیل کے مدد کے پانی سوں۔ جلی کا کاڑا کر کو پیلانا۔ سگن کا کاڑا دپنا۔ نرگن ہوا تو شفا پاوے گا۔ طبیب فرمائے، تیوں پرہیز کرے۔

(ب) قال نبی علیہ السلام: علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔ اومعنا میری امت کے بوجنے سولوں گا ان کے پیغمبر اس اسے اچھیگے۔

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید کہ ہر گز بمنزل نہ خواہد رسید

اس کا معنی نبی جیوں بوجے بغیر ناانپڑے وطن کوں۔ اے عزیز، مریدِ صادق! اچھے پیر کے ہوا کون امر خدا ہور رسول پیدا کیا ہے۔ اپنے بوج کوں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو۔ یہی ہے نصیحت کرنے کوں۔

(معراج العاشقین، ص:۶۱ / ۸۱، مطبوعہ: شاہراہ، اردو بازار، دہلی)

علماو مشائخ و مصنفین کے تاثرات واعترافات

صاحبِ مرآۃ الاسرار شیخ عبد الرحمٰن چشتی قدس سرہ (متوفیٰ: ۱۰۹۴ھ) لکھتے ہیں:

آں معدنِ عشق و ہمدمِ وصال، آں کلیدِ مخزنِ ذوالجلال، آں مستِ الست، نغماتِ بے ساز، محبوبِ حق حضرت سید محمد گیسو دراز قدس سرہ بن سید یوسف الحسینی دہلوی۔ آپ حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کے بزرگ ترین خلفا میں سے تھے۔ سید ہونے کے علاوہ آپ علم اور ولایت میں بھی ممتاز تھے۔ آپ شانِ رفیع، مشربِ وسیع، احوالِ قوی، ہمتِ بلند اور کلماتِ عالی کے مالک ہیں۔ مشائخ چشت کے درمیان آپ ایک خاص مشرب رکھتے ہیں۔ اسرارِ حقیقت میں آپ کا طریق مخصوص ہے۔

(مرآۃ الاسرار مترجم، ص:۹۷۵، مطبوعہ: لاہور)

مشہور محقق و مصنف مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں:

از عظمائے اولیائے حق بین و کبرائے مشائخ متقدمین و خلیفہ راستین شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی است۔ جامع درمیانِ سیادت و نجابت و کرامت و ولایت، شانِ رفیع و مراتبِ منیع و کلامِ عالی داشت۔ اُو را در مشائخ چشت اہلِ بہشت مشرب است خاص در بیانِ اسرارِ حقیقت و طریقے است مخصوص در بیانِ معرفت۔

(خزینۃ الاصفیاء، جلد اول، ص:۳۸۱، مطبوعہ: منشی نولکشور، کان پور)

"خزینۃ الاصفیاء" کی مذکورہ بالا عبارت "اخبار الاخیار" سے لی گئی ہے۔ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے بعینہٖ یہی بات لکھی ہے اور خواجہ بندہ نواز کے فضل و کمال کا شایانِ شان تذکرہ کرتے ہوئے ان کی علمی جلالت اور روحانی فضل و کمال کا اعتراف کیا ہے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز بلا مبالغہ بحرِ شریعت و طریقت کے غواص تھے۔ دینی علوم کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو جو آپ کی دسترس

سے باہر ہو۔ قرآن وحدیث اور تفسیر وفقہ میں مہارتِ تامہ حاصل تھی اور جہاں تک علمِ سلوک وتصوف کی بات ہے تو اس میں آپ کو درجۂ اختصاص بلکہ اجتہادی مقام حاصل تھا۔ "جوامع الکلم" میں مختلف علوم وفنون سے متعلق آپ نے ایسے ایسے دقیق مباحث اور نکات وغوامض بیان کیے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور آپ کی علمی مہارت کے آستانے پر جبینِ فکر وقلم سجدہ ریز ہوتی نظر آتی ہے۔"

نزہۃ الخواطر" کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں اور خواجہ بندہ نواز کی عظمت ورفعت اور بلند وبالا مقامِ علمیت کا اندازہ لگائیں۔

آپ ایک بہت بڑے عالم، صوفی، عارف، قوی النفس، عظیم الہیئت اور جلیل الوقار تھے۔ شریعت وطریقت کے جامع تھے۔ بڑے متقی، پرہیز گار، عابد وزاہد اور حقائق ومعارف کے سمندر میں غوطہ لگانے والے بزرگ تھے۔ فقہ، تصوف، تفسیر اور دیگر علوم وفنون کی ترویج واشاعت میں آپ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

(نزہۃ الخواطر)

سید صباح الدین عبد الرحمٰن لکھتے ہیں :

آپ صوفیائے کرام میں قطب الاقطاب، قامع بیخ کفر وبدعت، مقصودِ خلقتِ عالم، معدنِ عشق، ہمدمِ وصال، کلیدِ مخازنِ حضرت ذوالجلال، مستِ الست، نغماتِ بے ساز، محبوبِ حق وغیرہ جیسے بھاری بھرکم القاب وآداب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ حضرت سید گیسو دراز کے عظیم المرتبت ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی علیہ الرحمہ جیسے جلیل القدر بزرگ بھی ان کی خدمت میں روحانی استفادہ کے لیے تشریف لائے۔

(بزمِ صوفیہ، ص:۵۰۷ / ۵۰۸، مطبوعہ: دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ)

وفاتِ حسرت آیات

افسوس کہ نصف صدی سے زائد عرصے تک دعوت وتبلیغ، رشد وہدایت اور تصنیف وتالیف کی گراں خدمات انجام دینے والے اس بزرگ کا ایک سو چار سال کی عمر میں ۸۲۵ھ میں وصال ہو گیا اور سلسلۂ چشتیہ کے آسمان کا یہ چمکتا دمکتا سورج پورے جاہ وجلال کے ساتھ اپنی شعائیں بکھیرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ "مخدومِ دین ودنیا" سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے، جو حقیقت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے علمی وروحانی فیوض وبرکات سے ہم سب کو مالا مال فرمائے۔ آمین!!

تعلیمات وارشادات

بزرگانِ دین کی تعلیمات وارشادات اور اقوال وملفوظات، مادی وروحانی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہوا کرتے ہیں۔ ان نفوسِ قدسیہ کی زبانِ فیض ترجمان سے ادا ہونے والے مبارک جملے، حیات بخش فقرات، نصیحت آمیز کلمات اور انقلاب آفریں الفاظ وحروف بڑے مؤثر اور دل پذیر ہوا کرتے ہیں۔ لہٰذا حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز علیہ الرحمہ کے مختصر احوال وآثار کے ذکر کے بعد آپ کے کچھ اقوال وارشادات نذرِ قارئین کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱) ایک بندہ حقیقت و طریقت کو شریعت کی ضد نہ سمجھے۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کا خلاصہ تصور کرے۔ جس طرح اخروٹ کا مغز اخروٹ کے چھلکے سے بظاہر مختلف معلوم ہوتا ہے، پھر بھی مغز کا جز چھلکے میں اس طرح ملا ہوتا ہے کہ اس سے بھی تیل نکالا جاتا ہے۔ اسی طرح حقیقت و طریقت اور شریعت تینوں ایک ہی ہیں۔

۲) رات کے وقت بستر پر انسان کو سوچنا چاہیے کہ اس نے دن میں کون کون سا کام کیا اور دن میں سوچنا چاہیے کہ رات کو کیا کیا۔ اپنے کاموں کا محاسبہ کرو۔ اگر دینی کام اور اچھے کام زیادہ کیے ہیں تو خدا کا شکر ادا کرو اور اس پر استقلال برتو، اور اگر دین کے کاموں میں کچھ غفلت برتی ہے تو توبہ کرو اور جہاں تک ممکن ہو ان کی تلافی کرو۔

۳) اگر پیر، مرید کو نامشروع کاموں کی دعوت دیتا ہو تو مرید ایسے پیر کو چھوڑ دے، لیکن اس طرح کہ پیر کو معلوم نہ ہو کہ اس نے بداعتقادی کی وجہ سے علاحدگی اختیار کی ہے۔

۴) جب تک ایک شخص تمام دنیاوی چیزوں سے فارغ نہ ہو جائے، راہِ سلوک میں قدم نہ رکھے۔

۵) روزہ ارکانِ تصوف میں سے ہے۔ اس لیے صوفی کے لیے روزہ رکھنا ضروری ہے۔ روزے سے نفس مغلوب رہتا ہے اور اس میں عجب اور غرور پیدا نہیں ہوتا۔

۶) اگر ایک سالک کمالات کے اعلیٰ درجہ پر بھی فائز ہو جائے تو بھی وہ اپنے اوراد و وظائف کے معمولات کو ترک نہ کرے۔

۷) زوال کے وقت قیلولہ کریں، تا کہ شب بیداری میں آسانی ہو۔

۸) سالکوں کو ہمیشہ باوضو رہنا چاہیے۔ ہر فرض نماز کے لیے تازہ وضو کرنا بہتر ہے۔ وضو کے بعد تحیۃ الوضو ادا کریں۔

۹) دل سے ہوس کو دور کریں اور اگر دور نہ ہو تو اس کے لیے مجاہدہ و ریاضت کرتے رہیں۔

۱۰) کسی بھی حال میں اپنے نام کو شہرت نہ دیں۔ بازار صرف شدید ضرورت کے وقت جائیں۔

۱۱) گرسنگی و تشنگی (بھوک پیاس) اور شب بیداری کو دوست رکھیں۔

۱۲) اپنے پاس لوگوں کی زیادہ آمد و رفت نہ ہونے دیں۔

۱۳) نفس کی شکستگی کے لیے فاقہ ضروری ہے۔

۱۴) امیروں کی صحبت سے دور و نفور رہیں۔

۱۵) مصیبت کے وقت مضطر اور مضطرب نہ ہوں۔ کسی بھی حال میں نہ روئیں اور روئیں بھی تو اس لیے کہ کہیں منزلِ مقصود تک پہنچنے سے پہلے اس کو موت نہ آجائے۔

☆☆☆

قطب الاقطاب حضرت شاہ عبد اللطیف چشتی علیہ الرحمہ احوال و آثار

حافظ محمد دلشاد خاں چشتی لطیفی ☆

بر صغیر میں دینِ اسلام کی ترویج و اشاعت میں بزرگانِ دین، صوفیائے کرام اور مشائخ عظام کا بڑا اہم رول رہا ہے ہر دور میں کچھ ایسی عظیم ہستیاں جلوہ گر ہوتی رہی ہیں، جنھوں نے شریعت و طریقت کی بیش بہا اور نمایاں خدمات انجام دیں۔ انھیں اللہ کے برگزیدہ بندوں میں ایک نام تاج الاولیاء، سراج الاصفیا، قطب الاقطاب، قدوۃ السالکین، زبدۃ العارفین، خواجہ نور محمد المعروف حضرت شاہ عبد اللطیف چشتی ستھنوی علیہ الرحمہ کا ہے جن سے ایک عالم نے فیض حاصل کیا اور آج بھی ان سے فیض جاری ساری ہے ۔

نسب و وطن

آپ دہلی کے شاہی خاندان مغلیہ سلطنت کے آخری چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر کے شہزادے تھے۔ لیکن آپ نے کبھی اپنے حسب و نسب کو کھلے لفظوں میں ظاہر نہ فرمایا کیوں کہ آپ جس منزلِ عشق کے مسافر تھے اس میں ان باتوں کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے دین کی خدمات کے خاطر تخت و تاج اور عالیشان زندگی کو تبلیغ اسلام کے خاطر ترک کر دیا۔ اور پوری زندگی فقر و درویشی میں گزار دی۔

غوثِ زماں حضرت خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسوی علیہ الرحمہ کے خلفا حضرت شاہ محمد بلال اور حضرت شاہ عبد الکریم کے فیضِ صحبت سے صاحبِ عرفان و مقام ہوئے۔

(حدوث الفتن وجہاد اعیان السنن، ص ۱۷۴، تصنیف: خیر الاذکیاء استاد العلماء حضرت علامہ و مولانا محمد احمد مصباحی قدس سرہ العزیز)

آپ ہندوستان کے مختلف خطوں میں دین و سنیت کی بے لوث خدمات انجام دیتے ہوئے، " اَوَدھ " کے علاقے میں تشریف لے آئے۔ ضلع بارہ بنکی کے مواضعات سے ہوتے ہوئے " ستھن شریف " تشریف لے آئے ۔

آپ کی آمد سے پہلے ستھن کے قرب و جوار کا دینی ماحول بہت ہی تاریک اور بڑا وحشت ناک تھا، مسلمانوں کو صحیح طور سے کلمہ پڑھنے کا شعور تک نہ تھا۔ ہندوں کی طرح چوٹی رکھتے، جینیوں پہنتے اور یاترا کرتے تھے۔ البتہ گاؤں میں ایک تکیہ داران کی مذہبی ضروریات کو انجام دیتا۔ مسلمانوں کی یہ جہالت سے بھری ہوئی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر آپ نے ان میں تبلیغ دین کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کو کلمہ سکھایا، مشرکانہ رسموں سے نفرت دلائی، وضو و غسل کا صحیح طریقہ بتایا اور نماز، روزہ وغیرہ کے احکام و مسائل بتائے۔ اپنی قیام گاہ پر اکثر میلاد شریف کی محفلیں منعقد کر کے حاضرین کو بہترین انداز میں وعظ و نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت شاہ عبد اللطیف علیہ الرحمہ اپنے فطری حُسنِ اخلاق کے پیشِ نظر مریضوں کو دوا بتاتے جس کو ایک دو بار استعمال کرنے سے مکمل فائدہ ہو جاتا

☆ خانقاہ عالیہ لطیفیہ، ستھن شریف، ضلع امیٹھی یو۔پی، بھارت

اس کے ساتھ دعاؤں کا سلسلہ بھی جاری تھا غرض کہ آپ نے بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح وتربیت کے لیے دُوا اور دُعا وغیرہ کا ہر وہ طریقہ اختیار فرمایا جو موجودہ حالات کے تحت نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا تھا، اس سلسلے میں آپ نے حسبِ ضرورت سخت تنبیہ اور زجر و توبیخ سے بھی کام لیا۔

استقامت علی الدین

یہ وہ کٹھن منزل ہے جو ہاتھوں میں چنگاری پکڑنے کے مانند ہے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں استقامت کرامت سے بڑھ کر ہے۔ استقامت تصلب فی الدین میں

حضرت شاہ عبد اللطیف چشتی ستھنوی علیہ الرحمہ ممتاز نظر آتے ہیں۔

آپ نے ہندوستان کے کئی علاقوں میں دینِ اسلام کی بہت خدمتیں انجام دیں ہیں بالخصوص ستھن کے علاقے گمراہیت و بے دینی کے گڑھے میں تقریباً غرقاب ہونے والے تھے۔ اللہ کے عطا کردہ فضائل و کمالات سے اس مردِ حق آگاہ نے تنہا صرف اپنی روحانیت سے اس علاقے میں وہ کمال پیدا کیا کہ آج ہر چہار جانب اس کا اثر مدرسوں اور مسجدوں کی شکل میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ شاہ صاحب نے خود کئی مساجد اور مدارس کی تعمیر کرائی اور اپنے مریدوں کو بھی اس کی طرف مائل کیا یہی وجہ ہے کہ آپ کے مریدوں نے بھی کئی مدارس تعمیر کیے اور اس کی نسبت شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی طرف کی، جن میں دنیائے اہلِ سنت کی عظیم درس گاہ "الجامعۃ الاشرفیہ" مبارک پور، اعظم گڑھ بھی شامل ہے جیسا کہ رئیس القلم علامہ یاسین اختر مصباحی دام ظلہ العالی جامعہ اشرفیہ کے تعارف میں لکھتے ہیں ۔

۱۳۲۹/۳۰ھ / ۱۹۱۱ء میں اہلِ سنت وجماعت نے مدرسہ مصباح العلوم کی نشاۃ ثانیہ کی 'تو بہادر شاہ ظفر کی اولاد میں ایک تارک الدنیا بزرگ حضرت شاہ عبد اللطیف چشتی (ستھن شریف ضلع سلطان پور، موجودہ ضلع امیٹھی یوپی) کے ایک مرید مولانا محمد عمر لطیفی مبارک پوری، اور شیخ المشائخ حضرت سید شاہ علی حسین اشرفی کچھوچھوی (م ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء) کے مریدین کی خواہش کے مطابق اس کا نام "مدرسہ لطیفیہ اشرفیہ مصباح العلوم" تجویز کیا۔ یہ مدرسہ محدود پیمانے پر روایتی انداز سے موجودہ نگر پالیکا کے قریب ایک چھوٹی سی دو منزلہ عمارت میں کام کرتا رہا۔ اس کے بعد مدرسہ لطیفیہ اشرفیہ اپنی خانہ بدوشانہ زندگی گزارتے ہوئے ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۲ء میں پرانی بستی میں اس جگہ قائم ہوا جسے عام طور پر لوگ پرانا مدرسہ کے نام سے جانتے ہیں۔ پھر خدا جانے کب اور کن وجوہ کے پیش نظر "لطیفیہ" کی نسبت کو خارج کر دیا اور مدرسہ کا نام "مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم" باقی رہ گیا۔

(انوار صمدیہ: صفحہ نمبر ۱۳-از: عثمان رضا شفیق تاجی مصباحی، ناشر: آستانہ عالیہ صمدیہ بھیکی پور شریف، امیٹھی، یوپی، ہند)

اور براؤں شریف کا مرکزی ادارہ فیض الرسول کا اس کی بنیاد کا واقعہ پڑھو تو بڑا دلچسپ ہے۔ ہوا یوں کہ حضور شعیب الاولیاء نے اپنے پیر و مرشد قطب الاقطاب حضرت شاہ عبد اللطیف ستھنوی اور حضور اعلیٰ حضرت الشاہ امام احمد رضا خان فاضل بریلوی علیہما الرحمہ کو خواب میں دیکھا کہ وہ دونوں حضرات تشریف فرما ہیں۔ کچھ طلبہ پڑھنے کے لیے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ دونوں بزرگ ایک

دوسرے کو اشارہ فرمارہے ہیں کہ آپ ان بچوں کو پڑھائیں" بیدار ہونے کے بعد حضرت نے اسے ان مقدس روحوں کی جانب سے اپنے لیے براؤں شریف میں ایک دینی مدرسہ کے قیام کا حکم سمجھا اور خواب کی جزئیات سمیٹ کر جب تعبیر بنیں تو براؤں شریف کی اس آبادی میں جہاں مشکل سے چند آدمی قرآن شریف پڑھنے والے تھے، حیرت سے لوگ ایک ابتدائی دینی مدرسہ دیکھ رہے تھے جس کا نام حضرت نے فیض الرسول رکھا۔ ابتدا میں مکتب کی شکل میں قائم ہونے والا یہ مدرسہ دیکھتے ہی دیکھتے چند برسوں میں دارالعلوم بن گیا۔ دور دراز سے طلبہ پہنچنے لگے اور آج اس کی مرکزیت کا یہ عالم ہے کہ درجنوں دارالعلوم اس کی شاخ کی حیثیت سے بھارت کے مختلف حصوں میں دینی و علمی خدمت انجام دے رہے ہیں اور یہاں کے علما ملک و بیرون ملک دینِ حنیف کی مخلصانہ گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ (فتاوٰی فیض الرسول، جلد اوّل، ص ۱۰ ، اکبر بک سیلرز، لاہور)

بلاشبہ یہ قطب الاقطاب حضرت شاہ عبداللطیف علیہ الرحمہ کا روحانی فیض ہی ہے کہ خواب میں تشریف لا کر اس عظیم الشان دارالعلوم کے قیام کا اشارہ فرمایا۔

اتباعِ شریعت

قطب الاقطاب حضرت شاہ عبداللطیف چشتی علیہ الرحمہ کی حیاتِ مبارکہ پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہی یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ آپ نے پوری زندگی شریعت پر سختی سے عمل کیا، ہر فرض و واجب کی محافظت اور اتباعِ سنت و شریعت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ ہونے دیا۔

شیخ المشائخ حضور شعیب الاولیاء حضرت شاہ یار علی علیہ الرحمہ بانی دارالعلوم اہلِ سنت فیض الرسول، براؤں شریف اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ہند و پاک کا سفر کیا، تین بار حج و زیارت سے مشرف ہوا، ہزاروں علما و صوفیا کی صحبت حاصل ہوئی مگر

حضرت شاہ عبداللطیف چشتی ستھنوی علیہ الرحمہ جیسا متبع سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور پابندِ شریعت میں نے بہت ہی کم پایا ایک سو تیس سال (۱۳۰) کی عمر میں جب کہ حضرت مرض الموت میں مبتلا تھے۔ ضعیف و نقاہت اس درجہ تک پہنچ چکی تھی کی دوسرے کے سہارے پر بھی دو قدم چلنے سے معذور تھے مگر اس حالت میں بھی نماز باجماعت کے اس قدر پابند تھے کہ کبھی تکبیرِ اولی فوت نہ ہوئی۔

شاہ صاحب علیہ الرحمۃ اتباعِ سنت احیاءِ ملّت کی وجہ سے اپنے معاصر بزرگانِ دین میں امتیازی شان کے حامل تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ شاہ صاحب علیہ الرحمۃ والرضوان سے (سفر بریلی شریف کے موقع پر) اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان بہ وقت ملاقات نہایت ہی اعزاز و اکرام سے پیش آتے اور پہلو بہ پہلو بیٹھ کر گھنٹوں شریعت و طریقت کے رموز و اسرار پر گفتگو فرماتے تھے۔

(فتاوٰی فیض الرسول، جلد ۲، ص ۲۱ ، اکبر بک سیلرز، لاہور)

آپ ۳۳بار حج وزیارت سے مشرف ہوئے(تذکرہ علماءِ اہلِ سنت) مختلف ممالک کا آپ نے دورہ کیا اور خوب خدمت خلق فرمائی۔ ہزاروں لوگ آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے۔ کئی لوگوں کو خلافت سے بھی نوازا ہے۔

کرامات

اولیاء اللہ کی کرامات حق ہیں۔ قرآن و حدیث سے ثابت ہیں، حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر اور ان کی امت کے ولی حضرت آصف بن برخیا کی کرامت کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے کہ سینکڑوں میل دور سے بڑاوزنی تخت پلک جھپکنے سے پہلے لاکر پیش کر دیا اور اسی طرح حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس بے موسم پھلوں کا پایا جانے کا ذکر قرآنِ پاک میں موجود ہے۔

عقائد کی کتاب " شرح العقائد" جو ہر دینی مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس میں ہے؛ کرامات الاولیاء حق؛ اولیاء اللہ کی کرامات حق ہے۔ ولی کے ہاتھ پر کرامت اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے اذن سے ظاہر ہوتی ہے۔

علما فرماتے ہیں امت کے اولیا کی کرامات در حقیقت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے معجزات ہیں، اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کی اتباع کے طفیل اولیا اللہ کو کمالات و تصرفات عطا فرماتا ہے۔

ہم یہاں حضرت شاہ عبد اللطیف چشتی ستھنوی علیہ الرحمہ کی ایک کرامت کا ذکر کرتے ہے۔ حضرت شاہ عبد اللطیف چشتی ستھنوی علیہ الرحمہ با کرامت بزرگ تھے۔

آپ سے سینکڑوں کرامتوں کا ظہور ہوا آپ کی بے شمار کرامتوں میں سے ایک عظیم کرامت یہ ہے کہ

شیخ المشائخ حضور شعیب لاولیاء حضرت شاہ یار علی علیہ الرحمہ

جب ایک بار آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو رخصت ہوتے وقت حضرت شاہ یار علی صاحب قبلہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس طرح ارشاد فرمایا۔

میاں نماز تو نماز، جماعت تو جماعت تکبیرِ اولیٰ فوت نہ ہو اور یہی نماز اللہ تعالیٰ سے ملا دے گی۔

حضرت شاہ عبد اللطیف چشتی ستھنوی علیہ الرحمہ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے یہ چند جملے حضرت شاہ یار علی صاحب قبلہ رحمت اللہ تعالیٰ علیہ کے لیے پتھر کی لکیر بن گئے کہ اس واقعہ کو کم و بیش پینتالیس ۴۵ سال گزر گئے تھے لیکن سفر و حضر اور سخت سے سخت بیماری کی حالت میں بھی آپ کی نماز تو نماز جماعت تو جماعت کبھی تکبیر اولیٰ فوت نہ ہوئی۔

(فتاوٰی فیض الرسول، جلد ۲، ص ۱۴ ،اکبر بک سیلرز، لاہور)

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

سفر آخرت

ایک دن ردولی شریف ضلع فیض آباد یوپی میں ملک محمد نظام الدین کے یہاں تشریف لے گئے اور سلام ودعا کے بعد فرمایا کہ میں تیرے یہاں مرنے کے لیے آیا ہوں چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ ۹ جمادی الاولیٰ ہجری ۱۳۳۹ مطابق ۱۹۲۰ء کو بارہ بج کر پچپن منٹ پر ردولی شریف میں ہی یہ آفتابِ علم وفضل جس کی نورانی کرنوں سے عالم اسلام برسوں منور ہوتا رہا، ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔ "اناللہ وانا الیہ راجعون" دوسرے دن ڈھائی بجے دن میں بہ مقام ستھن شریف ضلع امیٹھی یوپی میں تدفین عمل میں آئی۔ آپ کی نمازِ جنازہ میں تقریباً تیس ہزار آدمی شریک تھے۔ ستھن شریف میں آپ کا مزار پاک مرجع خلائق اور منبع فیض وبرکات ہے۔

آپ کے مرید مرحوم محمد عمر لطیفی نے قطعہ تاریخ کہا۔

مرشدِ کامل سراج العارفین
مظہر شانِ خُدا عبداللطیف
بدھ کا دن تھا نو جمادی الاول آہ
جب چھپی نظروں سے وہ ذاتِ شریف
یاد رکھنے کے لیے سالِ وفات
اے عمر لکھ دو تاریخ لطیف

۸،۹،۱۰ جمادی الاول کو ہر سال آپ کا عرس نہایت تزک و احتشام کے ساتھ آستانہ عالیہ سے متصل خانقاہ عالیہ لطیفیہ میں خادم و جانشین مولانا صوفی شفیق احمد خان چشتی لطیفی صاحب قبلہ خانقاہ عالیہ لطیفیہ کی جانب سے ۱۰ جمادی الاول کو دن میں ۱۰ بجے سے لے کر ظہر تک محفلِ میلاد کا پروگرام ہوتا ہے اور بعد نماز ظہور زیارت موئے مبارک (صلی اللہ علیہ وسلم) کرائی جاتی ہے جس میں ہندوستان کے مشہور و معروف علمائے کرام وشعرائے اسلام تشریف لاتے ہیں۔ لہٰذا آپ تمامی احباب اہلِ سنت سے گزارش ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں شرکت فرماکر محفل کو کامیاب بنائیں اور صاحبِ عرس کے فیضان سے مالامال ہوں اللہ تعالیٰ ہم سب کو سنتِ مصطفی پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اولیائے کرام سے محبت کرنے کی توفیق عطا فرمائے

آمین بجاہ النبی الکریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مصادر ومراجع

(۱) حدوث الفتن وجہاد اعیان السنن، ص ۱۷۴
از: خیر الاذکیاء استاد العلماء حضرت علامہ ومولانا محمد احمد مصباحی قدس سرہ العزیز۔
ناشر: المجمع الاسلامی ملت نگر، مبارک پور، اعظم گڑھ ہند۔

(۲)فتاوی فیض الرسول، جلد ۲، ص ۲۱، اکبر بک سیلرز، لاہور

(۳)انوارِ صمدیہ، ص ۱۳، از: عثمان رضا شفیق تاجی مصباحی، آستانہ عالیہ صمدیہ بھیکی پور شریف، امیٹھی، یوپی، ہند

(۴) تذکرۂ علمائے اہلِ سنت از: علامہ محمود احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ، سنی دار الاشاعت، فیصل آباد، ص ۱۶۹

(۵) تجلیاتِ لطیف از: حافظ محمد دلشاد خان لطیفی خانقاہ عالیہ لطیفیہ ستھن شریف امیٹھی یوپی، ہند، رضوی پریس، لکھنؤ، ہند

☆☆☆

محمد تاج الدین تاجؔ چشتی رحمۃ اللہ علیہ احوال و آثار

احمد سہروری☆

صوبہ پنجاب کے شمال مغرب میں واقع ضلع اٹک اپنی زرخیزی اور مردم خیزی کی وجہ سے معروف ہے۔ ضلع اٹک کے معروف کالا چٹا پہاڑی سلسلہ کے اُس پار کا علاقہ تحصیل جنڈ کہلاتا ہے۔ تحصیل جنڈ قدیم روحانی درگاہوں کی وجہ سے دُور نزدیک میں مشہور ہے۔ ان چند درگاہوں میں سے مکھڈ شریف، میرا شریف، چورا شریف، بسال شریف، ناڑہ شریف اور زیارت بیلہ کے نام بہت معروف ہیں۔ جنڈ طول البلد ۷۲.۰۱۷۱۸۶ سے "۷۲°۰۱'۱.۸۷ جنوب، طول بلد ۳۳.۴۳۶۴۶۵ سے "۳۳°۲۶'۱۱.۲۷ مشرق اور سطح سمندر سے ۳۵۶.۱۵ میٹر (۱۱۶۸.۴۸ فٹ) کی بلندی پر واقع ہے۔ جنڈ شہر تحصیل ہیڈ کوارٹر ہے۔ جنڈ کی وجہ تسمیہ کے حوالے سے سدرہ نازؔ اپنے مضمون "جنڈ کی تاریخ" میں رقم طراز ہیں:

"قدیم روایات کے مطابق قبل ازیں شہر اور گردو نواح میں درختوں کے جھنڈ پائے جاتے تھے، اور اس وجہ سے علاقہ جھنڈ کے نام سے شناخت کیا جاتا تھا جو بعد میں جنڈ کہلانے لگا"۔ (۱)

جب کہ ضلع اٹک میں محکمہ مال کے دفتر محافظ خانہ میں موجود برٹش دور کے مرتب کردہ بندوبست دوم میں جنڈ کی وجہ تسمیہ کی بابت تحریر کیا گیا ہے کہ:

"دفعہ دوم ذکر آبادی موضع معہ وجہہ [وجہ] تسمیہ:
پانچ سو سال سے مورث نے یہہ [یہ] گاؤ [گاؤں] آباد کیا۔ اور کثرتِ درختان جنڈ [جھنڈ] کی، گاؤ [گاؤں] کا نام جنڈ مشہور ہوا"۔ (۲)

اس دورِ جدید میں بھی ضلع اٹک کی یہ تحصیل پس ماندگی کا شکار ہے۔ دورِ قدیم و جدید پر ایک نِگہ ڈالیں تو معلوم پڑتا ہے اس علاقہ میں بہت سے صاحبِ علم گزرے ہیں جنھوں نے ایک ایسی تاریخ رقم کی جو سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس علاقہ سے تعلق رکھنے والی کئی قابلِ فخر شخصیات کے نام نمایاں ہیں۔ جہادِ کشمیر میں اس علاقہ سے تعلق رکھنے والے شہداء میں سے عبدالحق شہید، مشرنگ خان شہید کے نام یادگار ہیں۔ ۱۹۶۵ء پاک و بھارت جنگ میں کرنل شاہ بہرام خٹک ستارہ جرأت، صوبیدار گل امیر خان، خاکی جان تمغہ جرأت اور صوبیدار غازی خان کے نام آج بھی تاریخ کا حصہ ہیں۔ جب کہ علم و ادب کے میدان میں گراں قدر خدمات سرانجام دینے والوں میں سے حضرت مولوی محکم الدین مکھڈی (زندہ: ۱۷۷۰ء)، مولانا محمد علی بٹالوی ثم مکھڈی (۱۷۵۰ء-

---

☆ محقق و تنقید نگار، اٹک

۱۸۳ا ء)، مولانا قاضی عبد الرحمن سرہالوی (م:۱۹۵۳ء) مولانا احمد الدین گھڑی (۱۸۸۹ء-۱۹۶۹ء)، پروفیسر محمد نورالحق علوی (۱۸۸۸ء-۱۹۵۱ء)، صابر مٹھیالوی (۱۹۱۱ء- ۱۹۸۳ء)، پروفیسر غلام ربانی عزیز (۱۸۹۸ء-۲۰۰۲ء)، حکیم محمد یٰسین شوق (۱۹۰۱ ء-۱۹۸۳ء)، ڈاکٹر پرمانند اخگر (زندہ: ۱۹۳۴ء)، لالہ بشن داس بیکس (زندہ: ۱۹۳۲ء)، حکیم یٰسین فوق (م: ۱۹۹۰ء)، ڈاکٹر غلام جیلانی برق (۱۹۰۱ء - ۱۹۸۵ء) کے نام شامل ہیں. ان ہی صاحبِ علم و فراست میں سے ایک گوہر نایاب حکیم محمد تاج الدین تاجؔ چشتی کا نام نامی بھی شامل ہے۔ ذیل میں پہلی بار ان کے احوال اور علمی آثار کو صفحہ قرطاس پر لانے کی ایک ناتمام سی کوشش کی گئی ہے۔

خاندانی پس منظر:

قصبہ زیارت نزد جنڈ میں مولوی عبد الحکیم جن کا تعلق قبیلہ اعوان سے تھا۔ مسجد میں امامت کے فرائض سر انجام دیا کرتے تھے۔ حضرت خواجہ مولانا احمد الدین گھڑی رحمتہ اللہ علیہ (۳) کے مریدین میں سے تھے۔ ۱۹۵۷ء میں قصبہ زیارت میں ہی وصال فرمایا اور وہیں سپردِ خاک ہوئے۔ مولوی عبد الحکیم صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹی اور تین بیٹوں سے نوازا۔

۱۔ محکم الدین (۱۹۰۸ء- ۱۹۸۰ء) مدفن قصبہ زیارت، تحصیل جنڈ، ضلع اٹک

۲۔ سراج الدین (۱۹۱۱ء - ۱۹۹۵ء) مدفن جنڈ شہر، ضلع اٹک

۳۔ محمد تاج الدین (۱۹۱۴ء- ۱۹۸۹ء) مدفن جنڈ شہر، ضلع اٹک (صاحبِ تذکرہ)

پیدائش:

آپ کی پیدائش ۱۹۱۴ء مطابق ۱۳۳۲ھ کو مولوی عبد الحکیم بن عبد الرحمان کے گھر قصبہ زیارت، جنڈ میں ہوئی۔ آپ کا اسمِ گرامی محمد تاج الدین رکھا گیا۔ آپ بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔

تعلیم / فن:

ابتدائی تعلیم والدِ گرامی سے حاصل کی رسمی تعلیم پانچویں جماعت تک ہی حاصل کر سکے۔ ۱۹۲۹ء میں مزید حصولِ تعلیم کے لیے درس گاہ محمد علی گھڑی میں اپنے والدِ گرامی کے ساتھ حاضر ہوئے۔ آپ کے صاحب زادے نعیم الدین کامل (پ:۱۹۵۵ء) کے بہ قول داداجان چوں کہ امام مسجد تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ میری اولاد میں سے کوئی میرے طریق پر چلے اس سلسلہ میں آپ اپنے تینوں بچوں کو لے کر گھڑ شریف روانہ ہوئے. نعیم الدین کامل اس سفر کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ والدِ گرامی نے ایک دفعہ ہمیں بتایا تھا کہ:

”ہمارے والدِ گرامی [مولوی عبد الحکیم] ہم تینوں بھائیوں کو اپنے ساتھ آستانہ عالیہ گھڑ شریف لے گئے۔ وہاں پہنچے تو حضرت خواجہ احمد الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا“ میاں جی تینوں بیٹوں کو کیسے لائے ہیں ”حبِ والدِ

گرامی نے عرض کی حضور زیارت گاؤں سے پیدل لے کر آیا ہوں، آج ان کے امتحان کا دن ہے۔ حضور آپ بتائیں کہ ان تینوں میں سے کوئی میرا نام بھی روشن کرے گا کہ نہیں؟ حضرت خواجہ احمد الدین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا مولوی صاحب کیا یہ پوچھنا لازمی ہے۔ والدِ گرامی نے کہا جی ہاں لازمی ہے، پھر حضرت خواجہ احمد الدین رحمۃ اللہ علیہ نے محکم الدین کو دیکھ کر فرمایا یہ حکیم بنے گا اور حکمت ہی کے پیشے سے وابستہ رہے گا۔ سراج الدین کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ لڑکا شکار کا شوقین ہو گا، اور جب تاج الدین پہ نِگہ ڈالی تو فرمایا کہ یہ تمھارا نام روشن کرے گا اور عالم دین بنے گا"۔ (۴)

محمد تاج الدین تاجؔ نے اپنی ابتدائی تعلیم کا سلسلہ کھڈ شریف کی معروف درس گاہ مولوی محمد علی کھڈی سے کیا اور کافی عرصہ تک کھڈ شریف کی درس گاہ میں ہی حضرت خواجہ احمد الدین رحمۃ اللہ علیہ سے کسب فیض کرتے رہے بعد ازاں آپ جامعہ نعمانیہ لاہور تشریف لے گئے۔ "تذکرہ علمائے اہلسنت ضلع اٹک" میں حافظ محمد اسلم رضوی رقم طراز ہیں:

"ہم تینوں ہم سبق ساتھی، مولانا فضل الدین [۱۹۲۱ء - ۲۰۰۸ء]، مولوی تاج منکوری [صاحبِ تذکرہ] اور مَیں [غلام محی الدین] حضرت مولانا احمد الدین کے پاس "قصیدہ امالیہ" پڑھتے۔ انھیں ایام میں مولوی تاج الدین منکوری بہ وجوہ کھڈ شریف سے سلسلہ تعلیم منقطع کر کے جامعہ نعمانیہ لاہور چلے گئے۔ جب وہاں سالانہ امتحان شروع ہوا تو مولوی صاحب [صاحبِ تذکرہ] بہت پریشان ہوئے کہ مَیں جامعہ میں سال کے آخر میں داخل ہوا ہوں۔ موجودہ طلبا نے ممکن ہے جو کتب پڑھی ہیں وہ مَیں نے نہ پڑھی ہوں اور کہیں ممتحن مجھے فیل نہ کر دے۔ خدا کے فضل و کرم سے رات خواب میں مولانا احمد الدین تشریف لائے اور حکم فرمایا کہ "قصیدہ امالیہ" کے فلاں فلاں اشعار اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ امتحان لیتے وقت اتفاقاً ممتحن نے بھی وہی اشعار پوچھے۔ صحیح جواب دینے پر مولوی صاحب مذکور اُس سال جامعہ نعمانیہ میں اول پوزیشن پر آئے تھے"۔ (۵)

محمد تاج الدین تاجؔ، حضرت خواجہ احمد الدین کھڈی رحمۃ اللہ علیہ کے قابلِ فخر شاگردوں میں سے تھے، اور حضرت خواجہ احمد الدین کو بھی اپنے اس شاگرد پر بہت ناز اور فخر تھا، چوں کہ تاج الدین کافی عرصہ حضرت خواجہ کے زیرِ تربیت رہے، اور ان ہی سے کسب فیض کیا، خود حضرت خواجہ نے بھی آپ پر بہت ہی زیادہ محنت کی۔ حضرت مولانا تاج الدینؒ ایک بلند پایہ خطیب تھے، جس جگہ بھی خطاب فرماتے سامعین پر سحر طاری ہو جاتا۔ آستانہ عالیہ میرا شریف [درگاہِ حضرت خواجہ احمد میرویؒ] کا ایسا ہی ایک واقعہ جو کہ محترم نعیم الدین کامل کو خود مولانا تاج الدین تاجؔ نے سنایا تھا، جو صاحبزادہ ساجد نظامی (۶) کھڈ شریف کی زبانی راقم کو معلوم ہوا:

"ایک دفعہ آستانہ عالیہ میرا شریف[تحصیل پنڈی گھیب، ضلع اٹک]میں کسی عرس کے موقع پر حضرت خواجہ احمد الدین رحمۃ اللہ علیہ اورآستانہ عالیہ تونسہ مقدسہ کے سجادہ نشین تشریف فرماتھے۔حضرت خواجہ موصوف نے دورانِ گفت گو تونسہ مقدسہ کے سجادہ نشین سے فرمایا کہ میرا ایک بہت ہی اچھاشاگرد ہے،جو کہ بہترین خطیب بھی ہے۔تب پھر تونسہ مقدسہ سے آئے ہوئے سجادہ نشین کہنے لگے کہ پھر بلوائیں اپنے اُس شاگرد کو جس کی آپ اتنی تعریف فرمارہے ہیں،ہم بھی دیکھنا چاہتے ہیں اس شاگرد کو جس کو آپ نے خود تیار کیاہے۔اس وقت جو بھی خطبات یا سماع جاری تھاروک دیا گیااور مولانا تاج الدین کو دعوتِ خطاب دی گئی۔چوں کہ رات کی محفل تھی جب آپ نے خطاب شروع کیاتو تمام مجمع آپ کے سحر انگیز خطاب میں اس قدر گرفتار ہوا کہ معلوم ہی نہ پڑا کہ سحری کاوقت ہوگیااور پھر وہیں پر محفل برخاست کر دی گئی"۔(۷)

حکیم محمد تاج الدین تاج علومِ اسلامیہ کی تحصیل کے بعد حکمت کے پیشے سے وابستہ ہوگئے،چوں کہ حکمت کا پیشہ آپ کا پسندیدہ تھااور شروع سے آپ کو بھی حکمت کے پیشے سے رغبت تھی۔ آپ کے بڑے بھائی محکم الدین زیارتوی بھی اسی پیشے سے وابستہ رہے۔مولانا تاج الدین نے مکھڈ شریف میں دورانِ قیام حضرت خواجہ احمد الدین مکھڈیؒ سے "میزان الطب" پڑھی اور بعد ازاں نبض شناسی کے لیے آپ نے حضرت مولانا حکیم خطاب الدین غور غشتویؒ(۸) سے اکتسابِ فیض کیا۔مولانا حکیم خطاب الدین غور غشتویؒ نے آپ کے ذوق و شوق کو دیکھتے ہوئے اپنی خصوصی توجہ سے نبض کے اسرار رموز بھی سکھائے اور "قانونچہ فی الطب"زبانی یاد کرایا۔مولانا تاج الدینؒ نے ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۹۴۳ء میں " دارالعلوم جامعہ نعمانیہ ہند،لاہور" سے دورہ حدیث کی تکمیل کرنے کے بعد ۱۹۴۶ء میں ارزانی جامعہ طبیہ پنجاب،لاہور سے استاذ الطبا کی سند حاصل کی۔مزید علمِ طب کے حصول کے لیے حکیم شہزادہ غلام محمد پشاوری ثم لاہوری(۹)، حکیم مولوی محمد یوسف سہروردی(۱۰) اور حکیم مرزا محمد شفیع(۱۱)سے کسبِ فیض کیا۔بعد ازاں ۱۹۶۵ء میں بورڈ آف یونانی اینڈ ایورویدک سسٹم آف میڈیسن،پاکستان سے یونانی ایورویدک اینڈ ہومیو پیتھک کی سند حاصل کی۔اس وقت حکیم نیرواسطی (۱۲) بورڈ آف یونانی اینڈ ایورویدک سسٹم آف میڈیسن کے صدر تھے۔

تاج دواخانہ:

جامعہ نعمانیہ سے علومِ متداولہ کی تحصیل کے بعد"ارزانی جامعہ طبیہ پنجاب لاہور"سے استاذ الطباء کی سندِ فضیلت حاصل کرنے کے اور بعد ازاں اپنے وطن واپس لوٹ آئے اور ۱۹۴۹ء میں باقاعدہ طور پر قصبہ کنجور (لکڑمار،جنڈ) میں "تاج دواخانہ" کے نام سے مطب شروع کیا۔موصوف کے ذخیرۂ کتب میں سے ایک تراشہ دستیاب ہوا جس میں تحریر تھا کہ:

"حکیم صاحب کواس فن سے اتنی دلچسپی ہے کہ اب ان کی تمنا ہے کہ تادمِ زیست خدمتِ خلق کرتے ہوئے ان کا دَم نکلے"۔ (۱۳)

حکیم محمد تاج الدین تاجؔ دردِ دل رکھنے والے انسان تھے اور نہایت ہی شفقت فرمانے والے افراد میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ آپ نے تمام زندگی خدمتِ خلق کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ اکثر اوقات خود فرمایا کرتے تھے کہ:

"غربا کے ہاں جانے سے جو لطف آتا ہے وہ امراء کی مجالس میں نہیں آتا"۔ (۱۴)

بیعت / ادبِ مرشد:

آپ کی بیعت کے حوالے سے صحیح طور پر کچھ علم نہ ہو سکا کہ کس سال بیعت ہوئے۔ نعیم الدین کامل کے بہ قول والدِ گرامی جب کھڈ شریف میں زیرِ تعلیم تھے تو اُن دنوں حضرت خواجہ احمد الدین رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ حق پر سلسلہ چشتیہ میں بیعت ہوئے۔ محمد تاج الدین تاجؔ اپنے پیر و مرشد کے نہایت ہی فرماں بردار مرید تھے۔ بعد از وصال بھی مرشدِ کریم سے پہلی جیسی عقیدت رکھتے تھے۔ حضرت خواجہ احمد الدین رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد کا ایک واقعہ جو کہ مولانا محی الدین کھڈی (۱۵) نے بیان فرمایا:

"ایک دفعہ میں کھڈ میں مقیم تھا تو مولانا تاج الدین میرے پاس دوڑتے دوڑتے آئے اور کہنے لگے کہ گھڑا کہاں ہے؟ میں نے پوچھا کیوں خیر تو ہے؟ تب مولانا نے فرمایا کہ میرے خواب میں مرشدِ کریم تشریف لائے اور مجھے سخت الفاظ میں حکم دیا کہ دریا سے ٹھنڈا پانی لے کر آؤ۔ (یاد رہے کہ دورانِ طالب علمی آپ اپنے استادِ محترم و پیر و مرشد کے لیے دریا کا پانی لایا کرتے تھے) پھر آپ موصوف نے پانی کا گھڑا بھر کر حضرت خواجہ کے مرقد کے ساتھ رکھ دیا، پھر مجھ سے کہا کہ حضرت صاحب سے کہیے گا کہ تاج الدین نے پانی کا گھڑا بھر کر رکھ دیا ہے"۔ (۱۶)

شادی / اولاد:

محمد تاج الدین کا نکاح ۱۹۴۸ء میں جناب حاجی محمد اسماعیل (۱۷) کی دختر نیک اختر سے ہوا۔ جن کی وفات ۱۹۸۵ء میں ہوئی اور جنھیں جنڈ شہر کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک بیٹی اور دو بیٹے عطا فرمائے۔ بیٹی کی پیدائش ۱۹۴۹ء میں ہوئی، جو کہ اس وقت حیات ہیں۔ محمد شیر علی حلیم جن کی پیدائش ۱۹۵۲ء میں ہوئی، واہ فیکٹری میں ملازمت سے ریٹائر ہوئے اور ۲۰۱۱ء میں وفات پائی اور واہ میں ہی سپردِ خاک ہوئے۔ محمد نعیم الدین کامل ۱۹۵۵ء میں پیدا ہوئے اور واہ فیکٹری میں ملازمت کرتے رہے اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ تادمِ تحریر حیات ہیں اور آج کل جنڈ شہر میں مقیم ہیں۔

سفر حجاز مقدس:

محمد تاج الدین اپنے اشعار میں اکثر سرکارِ مدینہ کے دربار میں حاضری اور وہاں جا کر حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو اپنا حالِ دِل سنانے کی آرزو کرتے ہوئے دیکھائی دیکھتے ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں:

مَیں زندگی میں مدینے ضرور جاؤں گا
پکڑ کر جالی اُنھیں حالِ دل سناؤں گا

جب حضرت مولانا فضل الدین کھڈی عمرہ شریف ادا کرنے کے لیے حجازِ مقدس تشریف لے گئے تو محمد تاج الدین نے حضرت مولانا فضل الدین کے نام ایک مکتوب لکھا جو ذیل میں:

[پس نوشت] "حضرت قبلہ مولانا فضل الدین (۱۸) صاحب
جنڈ [ضلع اٹک]
۲/ اگست ۸۴ [۱۹ء]

سیدی و مولائی لازالت شموس فیوضکم

السلام علیکم!

سنا تھا آنجناب عمرہ شریف کے لیے گئے تھے۔ آپ کی تشریف آوری کا منتظر تھا لیکن پھر سنا کہ حضور سعادتِ حج بھی حاصل کر کے آنے کے متمنی تھے اور وہ بھی پوری ہو گئی الحمد اللہ الکریم۔ کیا آپ میرے لئے بھی خصوصی دعا اور دربارِ سید الکونین کے حضور جا کر اتنا عرض کر دیں:

ہر آں کسے کہ رساند مرا بہ کوئے حبیب
اگرچہ جاں طلبید ہم بہ روئے حبیب

حیاتِ چیست بہانہ برائے دیدنِ اُو
ممات چیست رجوع ایست ہم بہ سوئے حبیب

مپرسی از منِ مسکین چہ آرزو دارم
کہ نیست در دلِ عاشق جز آرزوئے حبیب

به حالتِ نزعم گو وَلے نگر شوقم
ولم نمی طلبید جذبه گفتگوئے حبیب

من آمدم جہاں تا جمالِ او بینم
فقیر تاؔج برد نیز جستجوئے حبیب

مولا کریم آپ کو بہ خیریت تمام واپس لائے اور عاصی کی زیارت کی تمنا پوری ہو(۱۹) طلب گارِ دعائے خواہاں محبوبِ دوجہاں۔

تاؔج چشتی از جنڈ
(تاج دواخانہ جنڈ ضلع اٹک، پاکستان)
میرا پتہ"۔ (۲۰)

محمد تاج الدین اور نذرؔ صابری:

ضلع اٹک کی معروف علمی وادبی شخصیت حضرت نذرؔ صابری جالندھری ثم اٹکی(۲۱) سے محمد تاج الدین کی خط و کتابت بھی رہی ہے۔ حضرت نذرؔ صابری کی محمد تاج الدین کے ساتھ پہلی ملاقات گورنمنٹ کالج اٹک کے کتب خانہ میں ہوئی۔ حضرت صابری اس ملاقات کا ذکر اپنے روزنامچہ میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کنجور نزد چھب کے ایک محمد تاج الدین تاجؔ آج مولانا شمس الرحمن(۲۲) کے ساتھ وارِدِ کتب خانہ ہوئے۔ وہ مولانا احمد الدین مرحوم کے شاگرد مرید ہیں اور ۱۲سال تک ان کی کھڈ میں خدمت کی۔ کتب خانہ کے بھی کلید بردار رہے۔ مولانا احمد الدین مرحوم کے بارے میں ان کی معلومات بہت وسیع ہیں۔ اور وہ ان پر لکھنا چاہتے ہیں۔" آئین " کا وہ شمارہ دیکھنے آئے تھے جس میں مولانا مرحوم پر ایک مضمون چھپا ہے۔ اس ملاقات میں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ فارسی کے شاعر بھی ہیں اور ان کا کلام "گلِ خنداں "لاہور میں شائع ہوتا رہا ہے"۔ (۲۳)

وصال / مدفن:

محمد تاج الدین چشتی کا وصال مبارک ۲۸ / اگست ۱۹۸۹ء مطابق ۲۶ / محرم الحرام ۱۴۱۰ھ بروز سوموار بوقتِ اذانِ فجر ہوا۔ حضرت مولانا فضل الدین کھڈیؒ نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ:

"میرے[فضل الدین]اور تاج الدین کے مابین یہ معاہدہ طے ہوا تھا کہ ہم دونوں میں سے
جو پہلے وصال کر جائے، دوسرا اس کی نمازِ جنازہ پڑھائے گا"۔ (۲۴)

اس معاہدہ کی رُو سے یہ سعادت محمد تاج الدین کے حصہ میں آئی کہ ان کے مرشد زادے حضرت مولانا فضل الدین چشتی کھڈی نے موصوف کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ آپ کی تدفین جنڈ شہر میں تحصیل لنک روڈ پر واقع "نیا قبرستان" میں کی گئی۔ آپ کی مرقد مبارک پر لگے کتبہ کی عبارت ذیل میں نقل کی جاتی ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مولانا محمد تاج الدین تاجؔ

ولد

عبدالحکیم

وفات ۲۸/اگست ۱۹۸۹ء بروز سوموار

تا حشر تیری دید کو ترستی رہیں گی میری آنکھیں

اس دل کو وہم وگماں بھی نہ تھا تیری جدائی کا

علمی آثار:

محمد تاج الدین نے امامت وخطاب، شعر وادب اور حکمت کے پیشے سے وابستہ رہنے کے باوجود تصنیف و تالیف کی طرف بھی توجہ دی۔ اب تک آپ کی دو تصانیف کے نام ملتے ہیں۔ آپ جب حجازِ مقدس شریف لے گئے تو مدینہ شریف کا سفر نامہ قلم بند کیا اور یہ منظوم سفر نامہ "سفر مدینہ" کے نام سے مرتب کیا۔ مگر تلاشِ بسیار کے باوجود بھی اس سفر نامہ کا کوئی نسخہ ابھی تک دستیاب نہ ہو سکا۔ اس منظوم سفر نامہ کے حوالے سے محترم ساجد نظامی بتاتے ہیں کہ:

"مولانا غلام محی الدین صاحب نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ مولانا تاج الدین صاحب نے اپنا منظوم سفر نامہ "سفر مدینہ" عنایت فرمایا تھا جس کا ایک نسخہ میرے پاس موجود ہے، جو سر دست دستیاب نہیں"۔ (۲۵)

محمد تاج الدین کی دوسری تصنیف "کتاب التعویزات" کے نام سے ہے جس کی اشاعت تا حال نہ ہو سکی۔ یہ کتاب آپ نے عربی زبان میں تحریر فرمائی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف کو عربی زبان پر کامل عبور حاصل تھا۔ آپ کے صاحبزادہ نعیم الدین کامل کے پاس اس کا اصل مسودہ محفوظ ہے۔ جس کی ایک عکسی نقل راقم الحروف کے ذاتی ذخیرہ کتب میں محفوظ ہے۔

حضرت صابریؒ "ضلع اٹک کے پارسی گویاں" کے نام سے ایک مبسوط تذکرہ لکھ رہے تھے۔ اور اس سلسلہ میں حضرت محمد تاج الدین تاجؔ رحمۃ اللہ علیہ کے احوال و آثار اور کلام کی دستیابی کے لیے ایک خط ساجد نظامی کو لکھا، جس میں وہ رقم طراز ہیں:

"مولانا تاج الدین کنجوریؒ کے حالات اور کلام کو خاص کر فارسی شاعری کو فراہم کرنے کی کوشش کریں، وہ مولانا احمد الدین کھڈیؒ کے شاگرد اور مرید رہے ہیں، کتب خانہ کے کلید بردار بھی۔ اُن کے بیٹے زندہ ہوں گے۔ جماعتِ اسلامی کے رسائل مثلاً "آئین" میں چھپتے رہے ہیں"۔ (۲۶)

محترم ساجد نظامی نے بڑی تلاش بسیار کے بعد حضرت مولانا تاج الدین تاجؔ کے بیٹوں کا پتہ لگایا اور پھر ان سے مولانا مرحوم کا کلام حاصل کیا۔ ساجد نظامی، حضرت صابریؒ کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"تاج الدین تاجؔ کا کلام دس سال کی تگ و دو کے بعد ہاتھ آگیا۔ جب سے آپ نے حکم دیا تھا، کھوج میں لگا رہا۔ جنڈ اور زیارت بیلے کا جو بھی دوست ملتا یا کسی شخص کے بارے میں کچھ ایسی بات سامنے آتی کہ وہ مجھے تاج الدین صاحب کا پتہ دے گا تو اس سے ضرور ملتا، پوچھ گچھ کرتا لیکن اب کی بار آپ کی دعائیں رنگ لائیں۔ تاج الدین صاحب کے بڑے بیٹے کا فون نمبر ہاتھ لگ گیا۔ بات ہوئی تو انھوں نے خبر دی کہ وہ "واہ کینٹ" میں ہوتے ہیں۔ واہ کینٹ جا نکلا، جو جمع پونجی تھی اس شرط پر عطا کر دی کہ فوٹو کاپی کے بعد اصل واپس۔ میں نے گزارش بھی یہی کی تھی سو بات بن گئی اور میں اُس رات بڑا مسرور تھا۔ جس کاغذ پر یہ لکیریں کھینچتا ہوں اس کی دوسری طرف تاجؔ صاحب کے فارسی کلام کا نمونہ موجود ہے۔ اُردو، پنجابی اور پشتو میں لکھتے ہیں۔ میں نے نعیم الدین کامل سے کیا ہوا وعدہ بھی وفا کر دیا۔ پرسوں اسے وہ سب کچھ واپس کر دیا، عکس محفوظ ہیں"۔ (۲۷)

محمد تاج الدین کے بارے میں تاحال یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آپ نے باقاعدہ کب شاعری کی ابتدا کی اور کن کن اساتذہِ فن سے اصلاح سخن لیتے رہے۔ آپ کے اساتذہ میں ایک معروف نام حضرت طالبؔ گورگانی (۲۸) کا ملتا ہے۔ محمد تاج الدین صاحب کو عربی، فارسی، اُردو، پنجابی اور پشتو پر مکمل عبور تھا۔ محمد تاج الدین اُردو، فارسی، عربی، پشتو اور پنجابی کے پُر گو شاعر تھے۔ ابتدا میں آپ نے اپنا قلمی نام "فریحؔ" رکھا اور اسی نام سے چند ایک منظومات بھی شائع ہوئیں۔ آپ اپنے قلمی نام "فریحؔ" کے حوالے سے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"پہلی غزل میری جسے طالبؔ گورگانی صاحب نے تصحیح کے بعد کھڈ شریف بوساطت صابرؔ صاحب مٹھیالوی (۲۹) عنایت فرمائی۔ مارچ/۱۹۳۹ء (۳۰) میں، اس وقت تخلص میرا فریحؔ تھا"۔ (۳۱)

بعد ازاں آپ نے اپنا قلمی نام تبدیل کر کے "تاج" رکھا اور پھر اسی نام سے ہمیشہ لکھتے رہے۔ بعض رسالہ میں موصوف کا مکمل نام درج نہیں ہوتا تھا۔ صرف قلمی نام ہی لکھا جاتا، پاک و ہند میں "تاج" کے قلمی نام سے لکھنے والے دیگر شعرا بھی تھے۔ اسی بنا پر

آپ نے اپنے قلمی نام کے ساتھ اپنی جائے سکونت کا اضافہ کیا۔ مختلف رسائل میں آپ کا کلام محمد تاج الدین تاجؔ، محمد تاج الدین مکھڈی، محمد تاج الدین چشتی، محمد تاج الدین احمد، تاج الدین کنجوری، تاج الدین زیارتوی اور بعض رسائل میں تاج الدین منکوری کے نام سے شائع ہوتا رہا ہے. کنجوری (۳۲)، زیارتوی (۳۳) اور منکوری (۳۴) یہ سب نسبتیں ہیں جو کہ مختلف علاقوں کے ناموں کی ہیں۔ چوں کہ آپ مختلف ادوار میں قصبہ زیارت [آبائی قصبہ] قصبہ کنجور، علاقہ لکڑمار، چھب تحصیل جنڈ میں رہائش پذیر رہے۔ آپ کا کلام پاک و ہند کے مشہور و معروف رسائل و جرائد میں شائع ہوتا رہا ہے۔ جن میں چند ایک کے نام یہ ہے:

۱۔ ہفتہ روزہ "شمس الاسلام" بھیرہ
۲۔ ماہنامہ "روحانی عالم" رام پور، یوپی
۳۔ ماہنامہ "محشرِ خیال" دہلی
۴۔ ماہنامہ "سالک" راولپنڈی
۵۔ ماہنامہ "سوادِ اعظم" لاہور
۶۔ ماہنامہ "گلِ خنداں" لاہور
۷۔ ہفتہ روزہ "ایشیاء" لاہور
۸۔ ہفتہ روزہ "آئین" لاہور

محمد تاج الدین تاج چشتی کا کلام اُردو، فارسی، پنجابی و پشتو منظومات بہ طور نمونہ نظر قارئین:

اُردو کلام:

مجھے میری وفاؤں کا صلہ اچھا دیا تُو نے
سراسر بے نیازِ ہر دو عالم کر دیا تُو نے

کسی کو وعدۂ فردا پہ کیسے اعتبار آئے
کیا وعدہ وفا بھی کیا، کبھی او بے وفا تُو نے

تری بندہ نوازی کا ادا ہو شکریہ کیوں کر
کہ بخشا ہے مجھے غم بھی میرے حق سے سوا تُو نے

پلا کر ایک ساغر بادۂ عرفاں کا مجھ کو
کیا ہے بے نیازِ ہر دو عالم ساقیا تُو نے

دوائی ہوش کی لو اور آنکھیں کھول کر دیکھو
سمجھ رکھا ہے شاید تاجؔ اس بت کو خدا تُو نے(۳۵)

☆☆☆

میں ہوں شبِ فراق میں اور خیالِ یار ہے
دردِ جگر سا مہرباں مونس و غم گسار ہے

قصہ مرگ و زیست ہے ، آنے پہ تیرے منحصر
اب میری ہست و نیست کا تجھ کو ہی اختیار ہے

چھپنے کی چیز ہی نہیں ، کیسے چھپائیں دردِ دل
لب پہ ہے مہر خامشی آنکھوں سے آشکار ہے

تاجؔ مریضِ عشق کو اچھا نہ کر سکا کوئی
اس کی دوا ہے دار یا برقِ نگاہ یار ہے(۳۶)

☆☆☆

فارسی کلام:

مسیحا سوئے بیماراں گزر کُن
بہ حالِ زار ایشاں یک نظر کُن

مریضِ عشق تو در انتظار است
نسیما شاہِ بطحا را خبر کُن

فلک از کجرویِ خود بہ پرہیز
زِ دودِ قلبِ مہجوراں حذر کُن

اگر خواہی بہ محشر رُستگاری
بہ اشکِ عشقِ احمد چشم تر کُن

بہ کوئے شاہِ خوباں مرقدم باد
خداوندا! اُمیدم باثمر کُن

کشم جاروب مژگاں در مدینہ
خداوندا بہ فریادم اثر کُن

مزن دم جُز ثنائے مصطفیٰ تاجؔ
دریں سودائے عمرِ خود بسر کُن (۳۷)

☆☆☆

پنجابی کلام:

مَنُ گھِنُ آکھا میرا بَنْدیا ، من گھن آکھا میرا
کِی بَھروسا اس دَم دا ، نہ میرا ناں تیرا

دُنیا ایہہ مسافر خانہ ، رَہن نہ دِیندا کوئی
توں نادان مسافر بُھل کے ، کیوں لَا بیٹھاں ڈیرا

ایہہ دُنیا دو چار دِہاڑے ، جان غنیمت جینا
پھر کِس نہیں آون دیناں ، ایہو ہِکا پھیرا

خوشی غمی سب رَب دِیٔ طرفوں ، دِل نُوں ناں گھبراویں
سَدا نہ رِہندی رات اَندھیری ، کَدے تا ہوگا سویرا

اپنی قسمت آپ بَنا لے ، عِلم دَا زیور گل وِچ پا لَے
سب مخلوق وِچوں رَب کیتا ، تیرا شان اُچیرا

تاجؔ بُرائیاں تو پچھتا کے ، اَکھیاں وِچو نِیر وَہا کے
جے رَبّ رَاضِیٔ کرنا چاہویں ، لَا مسجد وِچ ڈیرا(۳۸)

☆☆☆

پشتو کلام:

پوڑ تہ شا نادانا ورورا! ماکوا خوبونہ
تیر ساعت بو بیانہ موے ، کئے بو ارمانونہ

دائے دُنیا بازار دے سودو وکا ما ورورا
بیا دے رتلل نشتہ کہ ڈیرو کے وسونا

دائے نرم گرم بستر ہو پاتے شی لہ تا، نا
خاورو بوندے پروت بووے، اور نا نشتہ بلاشتونہ

واخلا چار لاسو و پسو تا راشہ عبادت تا
کئی بوتا باندے شودی ، صباتا انداموںا

یو ساعت بہاروی ، خزاں راشی بیا فنا شی
اے غافلا ! تا تہ دائے سبق در کئی گلونہ

مور و پلا رنا ڈیر مَیَن موڑ باندے نبی دے
پاک نبیﷺ سرور بوندے اوس ویُا سلاموںہ

تاجؔ کوا کوشش بہ سامے لیارے قدم کیگدا
تکیہ پہ اللہ ، چہ کوم ورائی بارانونہ(۳۹)

اردو منظوم ترجمہ : پروفیسر شوکت محمود شوکت

اٹھو میرے ناداں بھائی! نیند سے کیا تم پاؤ گے
گزرا وقت پھر ہاتھ نہ آئے، ارماں لے کر جاؤ گے

دُنیا ہے بازار کی صورت ، لے لو بھائی جو لینا ہو
چاہے جتنا زور لگا لو ، پھر نہ دُنیا آؤ گے

نرم و گرم یہ بستر تم سے ، دُنیا میں رہ جائے گا
تکیہ بھی نہ پاؤ گے جب مٹی میں مل جاؤ گے

کام میں لاؤ ، ہاتھ اور پاؤں، سوئے مسجد بھی اَب جاؤ
شاہد ہوں جب تم پر اعضا ، اس وقت تم پچھتاؤ گے

اِک ساعت ہو فصلِ گل تو جس کا موسم دو جے لمحے
"کھل کے پھر مرجھا جانا ہے"، پھول سے درس یہ پاؤ گے

ماں اور باپ سے بڑھ کر الفت نبی کو ہے ہم تم سے
تم بھی اپنے پاک نبی پر صلے علی پڑھ پاؤ گے ؟

راہِ راست پہ جم کے قدم اب تاجؔ تمھیں بھی رکھنے ہیں
بارش جیسی رحمت والے پر ایمان نہ لاؤ گے؟

☆☆☆

حوالہ جات و حواشی:

(۱) سدرہ نازؔ، جنڈ کی تاریخ، مجلہ افق گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین، تحصیل جنڈ، ۲۰۱۰ء، ص ۸۴.

(۲) ریکارڈ محکمہ مال، بندوبست دوم (عکس) صدر دفتر قانو گو، اٹک.

(۳) حضرت خواجہ احمد الدین چشتی کھڈی ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸۸۹ء کو حضرت خواجہ غلام محی الدین کھڈیؒ (م: ۱۹۲۰ء) کے ہاں کھڈ شریف میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والدِ گرامی حضرت غلام محی الدینؒ اور اپنے چچا حضرت شمس الدین کھڈیؒ (م: ۱۹۱۲ء) اور مولانا غلام محمود پپلانویؒ (م: ۱۹۴۸ء) سے حاصل کی۔ ۱۹۱۵ء کو مولانا عبید اللہ سندھیؒ (۱۰/ مارچ ۱۸۷۲ء - ۲۱/ اگست ۱۹۴۴ء) نے آپ کی رہنمائی میں افغانستان کا سفر کیا۔ تحریکِ خلافت میں بھی شریک رہے۔ اس مقصد کے لیے آپ نے ترکی کا سفر بھی اختیار فرمایا۔ آپؒ کا وصال مبارک ۳/ جمادی الاوّل ۱۳۸۹ھ مطابق ۲/ جولائی ۱۹۶۹ء کو کھڈ شریف میں ہوا. آپ کی لوحِ مزار پر قطعہ تاریخِ وصال یوں درج ہے:

اسمِ پاکش بود احمد دین بود او شیخ وقت
گفت ہاتف حامدی بے گماں بہشت رفت

۱۳۸۹ھ

(۴) نعیم الدین کامل (پ: ۱۹۵۵ء)؛ ٹیلی فونک مکالمہ از راقم؛ جنڈ شہر، ۳ جولائی، ۲۰۲۲ء.

(۵) حافظ محمد اسلم رضوی، تذکرہ علماء اہلِ سنت ضلع اٹک، اسلامک میڈیا سنٹر، لاہور، مارچ ۲۰۱۹ء، ص ۲۱۳-۲۱۴.

(۶) محمد ساجد نظامی، جناب مولانا فتح الدین کھڈیؒ کے ہاں ۲۱جولائی۱۹۷۷ء کو پیدا ہوئے۔ حفظِ قرآن آپ نے درس گاہ محمد علی کھڈی سے کیا۔۱۹۹۴ء میں گورنمنٹ ہائی سکول کھڈ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔۱۹۹۸ء میں بورڈ آف انٹر میڈیئیٹ، راولپنڈی سے ایف اے کیا، ۲۰۰۱ء میں علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے بی اے اور ۲۰۰۵ء میں اے ایم کی سند حاصل کی۔ نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد سے "پاکستانی اسفار پر مبنی اُردو سفر نامے: تحقیقی و تنقیدی جائزہ" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ جامعہ عالیہ دینیہ حضرت مولانا محمد علی کھڈیؒ، کھڈ(اٹک)، گورنمنٹ ڈگری کالج (بوائز) جنڈ، اٹک۔ سپیریئر کالج، راولپنڈی کیمپس، الخیر یونی ورسٹی، بھمبر آزاد کشمیر میں بھی لیکچرر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ بعد ازاں اسسٹنٹ پروفیسر اسلامک انٹر نیشنل یونی ورسٹی، اسلام آباد کے شعبہ اُردو سے وابستہ ہوئے۔۱۹۹۵ء سے تا حال کتب خانہ مولانا محمد علی کھڈی اور جامعہ عالیہ دینیہ حضرت مولانا محمد علی کھڈی میں اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ خانقاہِ معلیٰ حضرت مولانا محمد علی کھڈ شریف سے جاری ہونے والا سشماہی رسالہ " قندیل سلیمان" کے مدیر بھی ہیں۔ آپ کی تصانیف میں محرابِ دُعا (فارسی، پنجابی کلام حضرت محمد علی کھڈی)، راحت العاشقین (ترتیب) ملفوظات و احوال حضرت شاہ محمد سلیمان تونسویؒ کے نام نمایاں ہیں۔

(۷) صاحب زادہ ساجد نظامی (پ:۱۹۷۷)، ٹیلی فونک مکالمہ از راقم، کھڈ شریف: ۲۳جون ۲۰۲۲ء

(۸) مجتہد الطب مولانا حکیم خطاب الدین غور غشتوی، علاقہ چھچھ کے قصبہ غور غشتی کے ایک عظیم علمی خانوادے اور غور غشتی کے معروف قبیلہ کاکڑ سے تعلق رکھتے ہیں۔ خطاب الدین بن گل الدین معروف گل بابا بن بہاؤ الدین بن سعد الدین بن محمد موسیٰ بن اخوند بشارت الدین۔ آپ غوث الزمان حضرت علامہ مولانا قطب الدین (م:۱۹۵۰ء) بن مولانا شہاب الدین غور غشتوی رحمۃ اللہ علیہ کے چچازاد بھائی تھے۔ غور غشتی میں ہی اپنی تعمیر کردہ مسجد "حکیم صاحب" میں درس دیا کرتے تھے۔ "موجز القانون"، "قانونچہ فی الطب" اور "حمیات الشیخ" کے درس کے لیے بہت معروف تھے۔ آپ مسجد ہی میں مریضوں کو دیکھا کرتے تھے۔ فخر الاطبا حکیم حاجی عبد العزیز (بانی: تکمیل الطب کالج، لکھنؤ) سے بھی کسبِ فیض کرتے رہے۔ حکیم خطاب الدین، حضرت مولانا حکیم سید برکات احمد ٹونکی لکھنوی (۱۸۶۳ء- ۱۹۲۸ء) کے شاگردِ رشید تھے۔۱۹۷۷ء میں قصبہ نرٹوپہ (اٹک) میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ آپ کا بیٹا منہاج الدین جوانی میں ہی فوت ہو گیا تھا۔

(۹) حکیم مولانا شہزادہ غلام محمد کی پیدائش پشاور میں ہوئی۔ آپ کے والدِ گرامی حکیم شہزادہ سلطان محمود پشاور کے جاگیر دار تھے۔ طب کی تعلیم آپ نے اپنے والدِ گرامی اور حکیم عبد المجید دہلوی مرحوم سے حاصل کی۔ جے پور، ڈیرہ غازی خان اور پشاور میں مطب کرتے رہے۔ مہاراجہ کشمیر بھی آپ کی حذاقت سے مستفید ہوتے رہے۔۱۹۵۳ء میں لاہور تشریف لائے اور یہاں مصری شاہ میں مطب جاری کیا۔ قیامِ پاکستان کے وقت آپ کشمیر میں مقیم تھے، بعد ازاں پشاور چلے گئے اور وہیں ۱۹۵۰ء میں وفات پائی اور حضرت شاہ محمد غوث پشاوری ثم [۱۶۷۴ء - ۱۷۴۰ء] لاہوری کے والد حضرت سید حسن بادشاہ پشاوریؒ [م:۱۱۱۵ھ] کے جوار میں سپردِ خاک ہوئے۔

(۱۰) حکیم مولوی محمد یوسف سہروردی کا شمار لاہور کے مشہور و معروف اطبا میں ہوتا ہے۔ لاہور ہی میں مطب کرتے رہے۔ آپ کے مولانا تاج الدین تاجؔ کے ساتھ بہت گہرے دوستانہ مراسم تھے، کئی کئی روز موصوف کے ہاں قیام کرتے تھے۔

(۱۱) حکیم حاذق مرزا محمد شفیع عمدۃ الحکما، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور کے انعام یافتہ تھے۔ لاہور ہی میں چھتہ بازار میں مطب کیا کرتے تھے۔ چھتہ بازار لاہور سے شائع ہونے والے ماہنامہ "حامی الصحت" لاہور کے مدیر کے طور پر بھی اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے۔

(۱۲) حکیم سید علی احمد نیر واسطی نے ۱۹۰۰ء میں ضلع بجنور کے سید مظفر حسین کے گھر جنم لیا۔ عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم مولانا امتیاز حسین اور مولانا حامد حسین گنگوہی سے حاصل کی۔ علوم اسلامیہ کی تکمیل دہلی سے کی۔۱۹۲۵ء میں "تکمیل الطب کالج، لکھنؤ" میں فراغت حاصل کی۔ آپ

فارسی، عربی، ترکی، فرنچ، انگریزی، جرمن اور یونانی لسانیات پر کامل عبور رکھتے تھے۔ تحریکِ خلافت کے اہم رکن رہے۔ تقسیم ہند کے بعد لاہور منتقل ہوئے اور وہاں اپنا مطب شروع کیا۔ ۱۹۶۵ء میں پاکستان طبی بورڈ کے رکن اور بعد میں اس کے صدر مقرر ہوئے۔ آپ کی چند تصانیف میں سے "طب العرب" ، "تاریخ روابط"، "پر بتگی ایران و پاکستان" ، " ترکی نظام مطب کی تاریخ"، "المساہمۃ الاسلامیۃ فی الطب" ، " شیخ جمال الدین اقسرائی" "یونانی طب یادگار ہیں۔ آپ کا وصال ۲۶ مئی ۱۹۸۲ء میں ہوا اور حضرت شاہ ولی کے مزار کے قرب وجوار میں سپردِ خاک ہوئے۔

(۱۳) حکیم محمد تاج الدین چشتی، [معلوم نہ ہو سکا کہ کون سا رسالہ تھا، تراشہ ہی دست یاب ہوا ہے]، سن نادارد۔

(۱۴) حکیم محمد تاج الدین چشتی، [معلوم نہ ہو سکا کہ کون سا رسالہ تھا، تراشہ ہی دست یاب ہوا ہے]، سن نادارد۔

(۱۵) مولانا غلام محی الدین، بُھرے والے مولوی کے نام سے معروف تھے۔ ۱۹۱۴ء میں مولانا حافظ محمد سلطان کے ہاں موضع "جر گر" نزد ملھووالی، تحصیل پنڈی گھیب میں پیدا ہوئے۔ مولانا حافظ محمد سلطان درس گاہ محمد علی کھڈی میں حفظ کی کلاس لیا کرتے تھے۔ والد گرامی سے قرآن مجید حفظ کیا، بعد ازاں ۱۹۲۹ء میں درس گاہ محمد علی کھڈی میں درسی کتب حضرت مولانا احمد الدین کھڈی سے پڑھیں، بقیہ علوم وفنون کی تکمیل بھی درس گاہ محمد علی کھڈی سے حاصل کی۔ حضرت مولانا احمد الدین کھڈی سے بیعت تھے، پیر و مرشد کے کی حکم پر خانقاہ خواجہ محمد علی کھڈی کے لنگر خانہ اور کتب خانہ کے معمولات آپ کے سپرد کیے گئے۔ تمام عمر درگاہِ حضرت مولانا محمد علی کھڈی میں قیام رہا۔ ۱۰۴ سال کی عمر میں ۱۱، ربیع الاوّل ۱۴۴۰ھ مطابق ۲۰ نومبر ۲۰۱۸ء بروز منگل وصال فرمایا۔ آستانہ عالیہ کھڈ شریف کی جامع مسجد سے ملحقہ قبرستان میں مدفون ہیں۔

(۱۶) صاحب زادہ ساجد نظامی (پ:۱۹۷۷)، ٹیلی فونک مکالمہ از راقم، کھڈ شریف، ۲۳ جون ۲۰۲۲ء

(۱۷) حاجی محمد اسماعیل ۱۸۸۹ء کو ڈھوک مرزا، نزد جنڈ شہر میں پیدا ہوئے۔ درس گاہ محمد علی کھڈی میں حضرت خواجہ احمد الدینؒ کے ہم درس بھی رہے۔ ۱۹۶۴ء میں ہجرت کر کے گوٹھ اسماعیل آباد، ضلع دادو، سندھ چلے گئے اور ۱۹۸۹ء میں وفات پائی۔ آپ مولانا تاج الدین تاجؔ کے سسر تھے۔

(۱۸) حضرت فضل الدین چشتیؒ ۱۹۲۱ء میں خواجہ احمد الدینؒ چشتی کے ہاں کھڈ شریف میں پیدا ہوئے۔ حضرت حافظ میاں محمد سے قرآن مجید حفظ کیا، ابتدائی کتب اپنے والدِ گرامی سے پڑھیں۔ دیگر اساتذہ میں مولانا محمد الدین کھڈیؒ، مولانا محب النبیؒ، مولانا امام غزالیؒ، مولانا غلام فریدؒ شامل ہیں۔ دورہ حدیث شریف حضرت مولانا الشیخ الجامع غلام محمد گھوٹویؒ [۱۸۸۵ء - ۱۹۴۸ء] سے جامعہ عباسیہ، بہاول پور سے مکمل کیا۔ کچھ عرصہ ریاست رام پور میں بھی رہے۔ بعد ازاں کھڈ شریف تشریف لائے تو باقاعدہ درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ خواجہ محمد محمود تونسویؒ [۱۸۶۵ء- ۱۹۲۹ء] سے بیعت تھے۔ آپؒ کا وصال ۸، اگست ۲۰۰۸ء میں ہوا، کھڈ شریف میں اپنے والدِ مکرم کے پہلو میں مدفون ہیں۔

(۱۹) ۱۹۸۶ء میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی خواہش پوری فرمائی۔ آپ حجازِ مقدس گئے اور حج بیت اللہ ادا فرمایا۔

(۲۰) مکتوب محمد تاج الدین بہ نام خواجہ فضل الدین کھڈی، مرقومہ ۲، اگست ۱۹۸۴ء، مملوکہ کتب خانہ مولانا محمد علی کھڈیؒ۔

(۲۱) ضلع اٹک کے معروف نعت گو شاعر، محقق، مخطوطہ شناس، کتاب دار چوہدری غلام محمد المعروف نذر صابری۔ یکم نومبر ۱۹۲۳ء میں مولوی علی بخش [م: اگست ۱۹۴۷ء] کے ہاں ملتان میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن جالندھر ہے۔ ۱۹۴۱ء میں گورنمنٹ ہائی سکول جالندھر سے میٹرک کیا۔ دیانند اینگلو ورنیکلر کالج جالندھر سے ایف اے کیا۔ ۱۹۴۵ء میں اسلامیہ کالج جالندھر سے بی۔ اے اور ۱۹۵۳ء میں پنجاب یونی ورسٹی، لاہور سے ایم۔ اے فارسی کی ڈگری حاصل کی۔ حضرت مولانا صوفی نواب الدین رحمۃ اللہ علیہ رمداسی [م: ۱۳۳۲ھ] سے سلسلہ چشتیہ صابریہ میں بیعت ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں پنجاب پبلک لائبریری، لاہور میں اسسٹنٹ کیٹلاگر کی ملازمت اختیار کی۔ جنوری ۱۹۴۸ء کو کتاب دار کی حیثیت سے گورنمنٹ

کالج، اٹک آ گئے اور تمام عمر اٹک میں ہی مقیم رہے۔ آپ کی کئی تصانیف یاد گار ہیں جن میں "رومی و تبریزی" ، "دیوانِ شاکر اٹکی" ، "قصۃالمشائخ" ، "المرآۃ فی شرح اسماء" ، "ظواہر" ، "غایۃ الامکان فی معرفۃ الزمان والمکان (مرتبہ)"، "منہج الرشاد(مرتبہ)" ودیگر شامل ہیں۔ ۲۰۱۳ء میں وفات پائی اور اٹک میں مدفون ہوئے۔

(۲۲) آپ کا تعلق دیر کے علاقہ سے تھا۔ مولانا شمس الرحمن ضلع اٹک میں جماعت اسلامی کے امیر بھی رہے، دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد تھے، مولانا سید سجاد حسین (شارح مثنوی) کے حلقہ درس میں بھی شامل رہے۔ آپ بہت اچھے خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ مصنف بھی تھے۔ آپ نے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی شرح ترمذی شریف پر اُردو تقریر کو عربی میں قلم بند کیا اور" كوكبُ المضىٰ" کا نام دیا۔ علمِ عروض پر بھی ایک کتاب تحریر فرمائی۔ حال ہی میں مولانا مرحوم کے نام پر مولانا شمس الرحمن پبلک لائبریری، ڈھوک فتح، نزد کیمبل پور فلور ملز، اٹک شہر کا قیام میں عمل لایا گیا ہے۔ آپ نے ۲۰۰۸ء میں وصال فرمایا۔

(۲۳) حضرت نذر صابری، روزنامچہ، ۱۹۶۹ء، اٹک، مملوکہ خالد رضا، ۷ا دسمبر کی یادداشت

(۲۴) نعیم الدین کامل (پ: ۱۹۵۵ء)؛ ٹیلی فونک مکالمہ ازراقم، جنڈ شہر، ۳جولائی ۲۰۲۲ء

(۲۵) صاحب زادہ ساجد نظامی (پ:۱۹۷۷)؛ ٹیلی فونک مکالمہ ازراقم، کھڈ شریف، ۲۳جون ۲۰۲۲ء

(۲۶) مکتوب نذر صابری بہ نام ساجد نظامی، مرقومہ ۳۱جنوری ۲۰۰۷ء، مملوکہ کتب خانہ مولانا محمد علی کھڈیؒ

(۲۷) مکتوب ساجد نظامی بہ نام نذر صابری، مرقومہ ۱۸ نومبر ۲۰۱۳ء، مملوکہ راقم الحروف

(۲۸) طالبؔ گورگانی یاد گار مرزا ارشدؔ گورگانی دہلوی[پ: ۱۸۵۰ء - م:۱۹۰۶ء]۔ آپ کی پیدائش ۱۸۹۳ء میں ہوئی، بعد ازاں جہلم میں مقیم رہے۔ مرزا محمد یعقوب آپ کا اسم گرامی تھا۔ طالبؔ گورگانی کے قلمی سے نام سے لکھتے تھے۔ آپ کا شمار ضلع جہلم کے ممتاز اُردو شعرا میں ہوتا ہے۔ ۱۹۳۴ء کے بعد کافی عرصہ ضلع اٹک کی تحصیل پنڈی گھیب میں بہ سلسلہ ملازمت مقیم رہے۔ آپ کے متعلق صابرؔ مٹھیالوی لکھتے ہیں کہ:

"مرزا طالب گورگانی کو اگر ضلع اٹک میں شعر و شاعری کا ولی تصور کیا جائے تو بجا ہے۔"

آپ کی تصنیفِ لطیف میں سے "تین درویش" یاد گار ہے۔ آپ نے ۱۵جون ۱۹۶۶ء کو وفات پائی اور جہلم میں "بڑا قبرستان" کے نام سے منسوب قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔

(۲۹) ضلع کے معروف ادیب و شاعر صابرؔ مٹھیالوی، اصل نام مرزا غلام مہدی تھا۔ ۲۹جون ۱۹۱۱ء کو چنیوٹ میں جناب میاں عبد اللہ کے گھر پیدا ہوئے۔ ضلع اٹک کی تحصیل جنڈ کے قصبہ مٹھیال میں رہائش پذیر رہے۔ ۱۹۲۴ء میں مڈل ورنکلر فائنل کا امتحان پاس کیا اور محکمہ تعلیم سے وابستہ رہے۔ ۱۹۲۷ء میں شاعری کا آغاز کیا۔ اساتذۂ سخن میں حضرت ریاض خیر آبادی[۱۸۵۳ء - ۱۹۳۴ء]، جلیل مانک پوری[۱۸۶۶ء - ۱۹۴۶ء] سیماب اکبر آبادی[۱۸۸۰ء -۱۹۵۱ء] کے نام شامل ہیں مگر مستقل طور پر دِل شاہ جہاں پوری[۱۸۷۵ء - ۱۹۵۹ء] کی شاگردی اختیار کی۔ پاک و ہند کے مختلف ادبی جرائد میں آپ کا کلام اور مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ۱۰۰، اشعار پر مشتمل مجموعہ کلام "گلِ صد برگ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ گیسوئے اُردو اور دیوانِ صابرؔ غیر مطبوعہ تصانیف ہیں. آپ نے ۶نومبر ۱۹۸۳ء میں قصبہ مٹھیال (تحصیل جنڈ، ضلع اٹک) میں وفات پائی اور وہیں سپردِ خاک ہیں۔

(۱۳) محمد تاج الدین تاجؔ ۱۹۳۹ء میں کھڈ شریف میں مقیم تھے۔ صاحبِ تذکرہ کی ایک غزل ماہنامہ محشرِ خیال، دہلی میں مارچ ۱۹۳۹ء کو شائع ہوئی۔ مولانا موصوف کی یہ غزل تاج الدین فریحؔ کے قلمی نام سے شائع ہوئی تھی۔ اس غزل کی تصحیح استاذ الشعراء حضرت طالبؔ گورگانی نے کی تھی، مکمل غزل ملاحظہ ہو:

غزل

قیامت ہے ادائے دِلستاں کا جانستاں ہونا
غضب ہے مہرباں ہو کر تیرا نامہرباں ہونا

خزاں کی نذر ہو جائے گا حسنِ عارضی اِک دن
بہارِ گلستاں کو کب میسر جاوداں ہونا

اَزل سے فطرتِ غم دوست اپنے ساتھ لایا ہوں
نوشتے میں میرے لکھا نہیں ہے شاداں ہونا

میری روداد کیوں محتاجِ اسلوبِ نگارش ہو
کہ ممکن ہی نہیں تحریر میں زورِ بیاں ہونا

میرے نالوں سے دنیائے محبت ہے تہہ و بالا
وبالِ دو جہاں ہے ایک میرا سرگراں ہونا

میرے اَرماں بھرے جذباتِ غم کی ترجمانی کو
نگاہِ شوق کو لازم ہے دِل کا ترجماں ہونا

نگاہِ دوربین سے چھپنے والے لاکھ پردوں میں
قیامت ہے خدائی بھر کی نظروں سے نہاں ہونا

فریحؔ ہر شعر تیرا رازدارِ صوت ملہم ہے
مبارک ہو تجھے روح الامیں کا ہم زباں ہونا

(۳۱) محمد تاج الدین تاجؔ، قلمی بیاض، مملوکہ نعیم الدین کامل، جنڈ، (اٹک)، ص ۹۴۔
(۳۲) کنجور، چھپ ریلوے اسٹیشن سے ۶ کلومیٹر اور جنڈ شہر سے ۳۵ کلومیٹر کی مسافت پر واقع ہے۔ مولانا موصوف کنجور میں قریباً ۳۵ سال تک مقیم رہے۔ یہاں کی جامع مسجد کنجور، میں امامت وخطابت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ مسجد کے ساتھ ملحقہ اپنے مطب "تاج دواخانہ" کی ابتدا بھی یہیں سے کی۔
(۳۳) قصبہ زیارت، عُرفِ عام میں زیارت بیلے کے نام سے معروف ہے۔ ضلع اٹک کے تحصیل ہیڈ کوارٹر جنڈ شہر سے ۱۲ کلومیٹر کی مسافت پر واقع ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ قصبہ کی وجہ تسمیہ کے حوالے سے بتایا جاتا ہے کہ یہاں خانقاہیں کافی تعداد میں ہی۔ قصبہ زیارت موصوف کا آبائی قصبہ ہے۔ مولانا کے والدِ گرامی اور برادرِ اکبر اسی قصبہ میں مدفون ہیں۔
(۳۴) منکور، خوش حال گڑھ ریلوے پل کی دائیں اور بائیں سمت کا تمام علاقہ منکور کے نام سے جانا جاتا ہے۔ منکور ایک قدیمی گاؤں کا نام ہے جس کے بارے میں تاحال وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یہ گاؤں کب آباد ہوا۔ اس سے ملحقہ بے شمار چھوٹی بڑی آبادیاں ہیں جن کے مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ مگر اس سارے علاقے کو منکور ہی کہا جاتا ہے۔ وجہ تسمیہ کے حوالے سے یہاں کی مقامی زبان میں ایک شنیدہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ: تُسی تے من نے کوڑے او (یعنی آپ من کے جھوٹے ہیں) بعد ازاں یہ لفظ "من کور" لکھا اور بولا جانے لگا۔
(۳۵) محمد تاج الدین تاجؔ، قلمی بیاض، مملوکہ نعیم الدین کامل، جنڈ (اٹک)، ص ۹۵-۹۶
(۳۶) واجد علی رام پوری، مدیر: ماہنامہ "روحانی عالم"، مراد آباد، یوپی، جنوری ۱۹۴۴ء
(۳۷) الحاج الشاہ محمد عارف اللہ قادری، مدیر: "ماہنامہ سالک"، راولپنڈی، اگست ۱۹۵۴ء، ص ۱۸
(۳۸) محمد تاج الدین تاجؔ، قلمی بیاض، مملوکہ نعیم الدین کامل، جنڈ (اٹک)، ص ۴۰
(۳۹) محمد تاج الدین تاجؔ، قلمی بیاض: مملوکہ نعیم الدین کامل، جنڈ (اٹک)، ص ۹۷- ۹۸

مصادر و منابع:

☆ حکیم مرزا محمد شفیع، مدیر: ماہنامہ "حامی الصحت"، چھتہ بازار، لاہور، شمارہ جون ۱۹۲۲ء، دسمبر ۱۹۲۸ء
☆ ارشد سیماب ملک: تذکرہ [شعرائے اٹک ۱۷۰۰ء- ۲۰۱۶ء]، قندیلِ ادب، اٹک، جلد اوّل، ۲۰۱۶ء
☆ حکیم مرزا محمد شفیع، مدیر: ماہنامہ "حامی الصحت"، چھتہ بازار، لاہور، شمارہ نومبر ۱۹۲۸ء
☆ حکیم وسیم احمد اعظمی، تکمیل الطب کالج، لکھنؤ کی علمی خدمات، نعمانی پرنٹنگ پریس، گولہ گنج لکھنؤ، ۲۰۲۰ء

☆ حافظ محمد اسلم رضوی، تذکرہ علماء اہل سنت ضلع اٹک، اسلامک میڈیا سنٹر، لاہور، مارچ ۲۰۱۹ء
☆ ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ، "وفیاتِ اہلِ قلم"، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء
☆ ملک عبداللہ صحرائی، "لالۂ صحرا"، ملٹری پرنٹنگ پریس، اٹک صدر، س ن
☆ حکیم مرزا محمد شفیع، مدیر: ماہنامہ "حامی الصحت" چھتہ بازار، لاہور، شمارہ دسمبر ۱۹۲۸ء
☆ محمد تاج الدین تاجؔ، قلمی بیاض، مملوکہ عکس کتب خانہ مولانا محمد علی کھڈیؒ
☆ واجد علی رام پوری، مدیر: ماہنامہ "روحانی عالم"، مراد آباد، یوپی، جنوری ۱۹۴۴ء
☆ عبداللہ فاروقی، مدیر: ماہنامہ "محشرِ خیال" دہلی، مارچ ۱۹۳۹ء
☆ الحاج الشاہ محمد عارف اللہ قادری، مدیر: ماہنامہ "سالک"، راولپنڈی، اگست ۱۹۵۴ء
☆ محمد طفیل، "نقوش"، لاہور نمبر، ادارہ فروغِ اُردو، لاہور، فروری ۱۹۶۲ء
☆ مولانا تاج الدین تاجؔ، "قلمی بیاض"، مملوکہ نعیم الدین کامل

☆☆☆

ملفوظاتی ادب

قسط۔۔۔دوم

بشارت الابرار (اُردو ملخص)

نذر صابری

{جناب نذر صابری مرحوم محقق، شاعر اور مخطوطہ شناس تھے۔ عمر بھر کتاب کی جستجو میں رہے۔ تحقیق و تنقید، شاعری، اہم متون کی اشاعت، اٹک کے مختلف نجی کتب خانوں کی فہرست سازی کے ساتھ ساتھ وہ ایک پختہ کار مترجم بھی تھے۔ اُن کا ذوق، کمال کا تھا۔ ملفوظاتی ادب کے ساتھ اُن کا لگاؤ بھی لاجواب تھا۔ وہ جہاں بڑے اہتمام کے ساتھ اپنا روزنامچہ لکھتے، جس کی رنگا رنگی سے وہی واقف ہے جس نے کبھی اُن کی ڈائری کا ایک آدھ صفحہ پڑھ رکھا ہو۔ علاوہ ازیں وہ اپنے مطالعہ میں رہنے والے ملفوظاتی مجموعوں کا اور بعض اوقات اپنی پسند کی کسی بھی مثنوی یا کسی بھی موضوع پر فارسی میں لکھی گئی نظم و نثر کی کتاب کا اُردو ملخص تیار کر لیا کرتے۔ جو بڑے خاصے کی چیز ہوتی۔ "بشارت الابرار"۔ "تذکرۃ المحبوب"۔ "فوائد الفواد"۔ اور "جنگ نامہ منسوب بہ قاسم نامہ" کے اُردو ملخص میری نظر سے گذر چکے ہیں۔ اُن کی تحریر میں گو اختصار ہے لیکن جامعیت اور ایک خاص کیفیت سے بھرپور نثر پڑھنے کو ملتی ہے۔ زیرِ نظر تحریر بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ جس میں صابری صاحب نے کتب خانہ مولانا محمد علی مکھڈیؒ کے ایک مطبوعہ ملفوظاتی مجموعہ "بشارت الابرار" کا اُردو ترجمہ اپنے ذوق سے کیا ہے۔ جس کی دوسری قسط شائع کی جارہی ہے۔ صابری صاحب کی یہ غیر مطبوعہ تحریر ہدیۂ قارئین ہے۔}

(ص۔۲۷)

پیر احمد شاہ سید ساکن فتح جنگ مقیم بر آستان میر اشریف نے فرمایا کہ آپ حضرت شاہ صاحب کے ہم راہ علاقہ کشمیر کی سیر کے لیے گئے۔ موضع "مریداں" علاقہ کوہستان میں رات آگئی۔ اس گاؤں کے ارد گرد ایک شیر ژمان مست آدم خور رہتا تھا جو قریباً ستر جانوں کو نقصان پہنچا چکا تھا۔ آپ کو خانہ آہنگر میں ٹھہرایا۔ نمازِ تہجد کے لیے اُٹھے اور دروازہ کھول کر باہر چلے گئے (جو رات کو باہر نکلتا تھا اُس سے مشکل ہی بچتا تھا) اور صحن میں وضو کرنے لگے۔ آہنگر کو خبر ہوئی، پریشان ہوا۔ دیار کی لکڑی کو آگ لگا کر باہر نکلا۔ دیکھا کہ وہ شیر دوزانو آپ کے آگے بیٹھا ہے (جیسے کہ وضو کرنا سیکھ رہا ہو۔ نذر)۔ حیران ہو کر نزدیک آیا' تو شیر بڑے ادب سے جنگل کو روانہ ہو گیا اور پھر وہاں اس نے کسی کو دُکھ نہیں دیا۔ (پھر ۱۳ شعروں کی نظم ہے۔ آخر میں دیکھو۔)

باب چہارم

سکونت در میر اشریف و متعلق آں

(ص ۳۲۔۷۰)

میرا' ایک ڈھوک تھی۔ اس کی ابتدا میاں محمد نے ایک گھر سے کی، جو مویشی چرانے کے (چَرایا کرتا) تھا۔ میاں محمد مولوی صاحب مکھڈی کا مرید تھا۔ ایک روز حضرت مولانا اخلاص کو جاتے ہوئے یہاں سے گزرے تو اس جگہ ریت کے ڈھیروں ٹیلوں سے ذکر کی آواز آرہی تھی۔ پھر شاہ صاحب کا یہاں سے گزر ہوا تو لوگوں نے استدعا کی کہ اس جگہ کو پانی مل جائے یہ میرا سیراب ہو جائے۔ فرمایا "ایں جا یک اولیاء اللہ مقیم شود کہ خشک میرا را خوب سیر اب گرداند و بریں گریوہ بنگلہ می سازد" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میاں محمد نے

ایک بار حضرت تونسویؒ سے گزارش کی کہ اس غلام کی ایک ڈھوک ہے جس کا نام میرا'ر کھا ہے۔ ارد گرد غارت گر پٹھان ہیں۔ اکثر ہمارا مال مویشی لوٹ لے جاتے ہیں۔ آپ جوش میں آگئے فرمایا کہ "ایں میرا نہیں "مِیرا" ہے قیامت تک تاراج نہ ہو گا۔"

حضرت شاہ صاحب کا ابھی کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ عام طور پر علاقہ کوہستان ضلع ہزارہ میں چند روز قیام کرتے تھے اور یوں ہزارہ اور تونسہ مقدمہ کے درمیان آمد ورفت کا ایک سلسلہ تھا۔ اکثر دو تین رات میرا شریف کی مسجد میں ٹھہرتے تھے۔ صحنِ مسجد بہت صاف اور خوشنما تھا۔ ارد گرد درختوں کا ہجوم تھا۔ یہ جگہ آپ کو بہت پسند تھی۔ لوگ بھی پابندِ نماز باجماعت تھے۔ خواجہ صاحب نمازِ فجر کے بعد باہر چلے جاتے اور ذکرِ خدا میں مصروف رہتے اور پھر مسجد میں آکر طلباء کو سبق پڑھاتے۔ تعداد سات آٹھ تھی۔ "کریما" پڑھاتے تھے اور ایک نسخہ پر اکتفا تھا۔ کھانا جو شہر سے آتا تھا طلبا کے ساتھ مل کر کھاتے۔ خواجۂ عالَم کا پہلا میرا شریف میں عرس گاجروں پر تھا۔ پھر رفتہ رفتہ ترقی ہوئی کہ آپ کے وصال کے بعد عرس آیا تو "چھل من آرو گندم نان یک وقت کفائت نمود"

(ص۔۳۳)

خلافت۔

فرمایا: ایک روز مولانا کھڈیؒ کے عرس پر حاضر ہوا۔ شاہ صاحب (حضرت فاضل شاہ رحمۃ اللہ علیہ۔ گڑھی افغانہ۔ ٹیکسلا) رونق افروز تھے۔ ایک روز آپ کی صحبت میں بیٹھا تھا۔ اتفاقاً لنگر خانہ میں جھگڑا ہو گیا۔ سب ادھر چلے گئے۔ ہم تنہا رہ گئے۔ فرمایا: "وقتِ اخیر است باید کہ شما بیعتِ عوام و خواص را بکنید کہ درزمان خطرۂ ایمان مردان است از من اجازت است و ایں اجازت از خواجۂ قبلہ عالم و عالمیاں حضرت خواجہ محمد سلیمان و پیران عظام است رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ میں نے قبول کیا اور بیعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن بہت کم۔ خاص کر تونسہ مقدسہ میں ادباً کسی کو مرید نہیں کرتا تھا۔ جب تک حضرت ثانی تاکید نہیں فرماتے تھے۔ آخر ش بیعت کو عام کر دیا تھا' جو بھی آتا بیعت کر کے پیرانِ عظام کے حوالے کر دیتا تھا۔

(ص۔۳۴)

ایک روز مؤلف اور دیگر محفل میں بیٹھے تھے (میاں مہجی) چھٹی رَساں آیا۔ خطوط پیشِ خدمت کیے۔ ایک خط مدینہ منورہ سے تھا۔ کسی احمد خان لاہوری کا لکھا ہوا۔ لکھا تھا کہ مجھ پر مصیبت وارد ہو گئی۔ مدینہ بھاگا۔ سات سال کسمپرسی میں گزارے۔ کچھ ارشاد نہ ہوا۔ اس کے بعد ایک رات حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ فرمایا تم میرا شریف جاؤ۔ متحیر ہوا۔ پتہ ملنے پر اولاً بذریعہ عریضہ التماس گذار ہوں۔ اجازت ہو تو حاضرِ خدمت ہو جاؤں۔ "حضرت خواجہ بعدِ دُعا فرمودند کہ آنچہ در خواب دیدی ہمہ شفقت و رحمتِ خواجہ ہر دو سرا است، ورنہ ایں درویش چہ و تو بلکہ جملہ عالم کون و مکاں محتاج و سائل آں درِ فیض اثر ہست۔ ترا ایں لازم است کہ آں در رانہ گزاری۔ ما نیز برائے تو طفیل شفیع المذنبین خواستگارِ دُعائیم بوقتِ رسید خط ازیں خاکسار ہزاراں تعظیمات و تسلیمات بر روضۂ مقدسہ معروض باید کرد۔ (ص۳۵۔۳۴)

صفحہ ۳۵

حسن خان افغان راوی ساکنِ نکہ افغاناں نے شاہ صاحب سے خواجہ میروی (کی) امامتِ مسجد کے لیے کہا۔ فرمایا: تو اس کی تاب نہیں رکھتا۔ وہ اچھا خاصہ زمیندار تھا اس کو یہ بات بُری لگی۔ ایک روز کالا باغ شاہ صاحب کی زیارت کے لیے گیا۔ خواجہ میروی بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ۶۰-۷۰ خادم تھے۔ میری آنکھیں کھل گئیں اور پشیمان ہوا۔

صفحہ ۳۶

میراشریف میں پانی کی قلت۔ کھڈ کے پراچوں اور ہندوؤں نے کئی کنوئیں کھودنے کی بڑی سعی کی مگر مایوس ہوئے۔ خواجہؒ نے توکل بر خدا خواجۂ خواجگاںؒ کے نام پر کنواں کھودنا شروع کیا۔ ایک سو گز پر پانی آگیا۔ اس سے لنگر کا کام چلتا ہے اور حوض پُر آب ہو کر کام کرتا ہے۔

صفحہ ۳۶

مولوی فتح دین ساکنِ نکہ کلاں مرید خواجہ سیالویؒ فرماتے ہیں کہ حضرتِ سیالویؒ کی زندگی میں خواب دیکھا کہ سیال شریفؒ میں حضرتِ شیخ کی مجلس میں ہوں۔ ایک شخص باہر سے آکر مجھے اچانک حج پر جانے کی ترغیب دیتا ہے۔ میں نے کہا پیر و مرشد سے اجازت لے لوں۔ آپ سے بات کی تو غضب ناک ہوئے۔ فرمایا: ایک حج کے لیے اتنی مشقت اُٹھاتے ہو اور ہر جمعہ پر خواجہ میرویؒ کے دیدار سے تازہ بہ تازہ بشارتِ حج کو نظر انداز کرتے ہو۔ جمعہ کے روز دیدارِ پُر انوار بزرگانِ عظام حج مسکیناں کے برابر ہے۔ وہ پد آموز غائب ہو گیا۔ میں نے عہد کیا کہ زندگی بھر حج کے ثواب کو ہاتھ سے نہیں (جانے) دوں گا۔ جب تک نابینائی اس نعمت سے مجھے محروم نہ کر دے۔

(ص۔۳۷)

(ص۔۴۲)

چند لوگ امرت سر سے آئے۔ ان کے پاس نقشِ قدم مبارک تھا۔ گھومتے پھرتے یہاں وارد ہوئے۔ انھوں نے نقشِ قدم مع اسناد نامہ روبرو رکھیں۔ مضمونِ سند یہ تھا کہ اسے امیر تیمور ہندوستان میں لایا تھا۔ مسلمانوں کے زوال پر سکھوں کے ہاتھ لگا۔ اُن سے محبانِ نبی نے صلہ خدمات میں حاصل کر لیا۔ حاضرین میں اس کی اصلیت پر نزاع ہوا۔ آپ نے فرمایا:

"حق تعظیم و تکریم ایں است کہ چوں بشنود کہ ایں قدم شریف سید الانبیا علیہ التحیۃ الصلوت و تسلیمات است بہ دِل و جاں فدا شود۔ مثلِ صحابہ کرام کہ بغیر فداکِ اُمّی و ابی نمی گفتند۔ ہم چنیں سادات را تعظیم و تکریم بر ماست گرچہ افعالِ شاں چگونہ باشند"۔

(ص۔۴۳)

(ص۔۴۷)

ایک روز بنگلہ پر سبقِ طلباء کے بعد معجزاتِ رسول ﷺ کا ذکر آیا۔ فرمایا: کہ اس غلام رسول لانگری کا والد حاجی غلام محمد حضرت تونسوی کا مرید تھا۔ ایک روز اس نے بتایا کہ مناسکِ حج ادا کرکے سوئے مدینہ منورہ قافلہ کے ساتھ روانہ ہوا۔ مجھے قافلہ سے جدا پاکر میر اسارا مال و متاع لوٹ لیا۔ حتیٰ کہ جسم پر ایک کپڑا بھی نہ چھوڑا۔ قافلہ کے پیچھے عریاں رواں شدم، اور شرم سے قافلہ کے نزدیک نہ جارہا تھا۔ انتہائے منزل پر جا پہنچا اور رات قافلہ سے دور سویا، تو سوچ رہا تھا کہ صبح اس حالت میں کیسے حاضر ہو سکوں گا۔ اسی فکر میں نیند آگئی۔ صبح جاگا تو سر کے نیچے دو تھیلیاں پائیں۔ ایک میں قیمتی لباس اور دوسری میں کھجوریں۔ کپڑے پہن کر قافلہ میں پہنچا اور کھجوریں دوستوں کے ساتھ کھائیں اور حضور ﷺ کی مہمان نوازی کا ذکر کیا۔

(ص۔۴۸)

مقام نکہ کلاں۔ اکوال سے شخص آیا کہ مولوی محمد سلطان مقدمہ نکاح میں گرفتار ہے دُعا چاہتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ ہمیشہ جھوٹے مقدمات میں مبتلا رہتا ہے۔ میں اس کے لیے دُعا نہیں کرتا۔ مولوی محمد سلطان یہ سُن کر بر آشفتہ ہوا کہ میں سیال شریف سے ارادت رکھتا ہوں۔ آئندہ میرہ (میرا) شریف کا نام نہ لوں گا۔ سید لعل شاہ خلیفہ حضرت میروی دو روز بعد رخصت طلب ہوا تو فرمایا کہ اکوال پہنچتے ہی مولوی سلطان کو اِدھر بھیج دینا۔ آیا تو فرمایا خدا دشمنوں کو شرمسار کرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

(ص۔۴۹)

(ص۔۵۰)

ہوتی مردان کے ایک شخص کا بیٹا لاپتہ ہو گیا۔ کسی نے کہا کہ میرا شریف جاؤ۔ کوہِ سفید (تھٹہ، بسال) میں سے گذر رہا تھا۔ غروبِ آفتاب کا وقت تھا کہ راستہ بھول گیا۔ غریب الوطن دست بہ دست نہادہ بنشست۔ کچھ وقت کے بعد اچانک ایک شخص آیا اور سلام دیا۔ اور پیار سے پوچھا کہ مغموم کیوں ہو۔ بات کیا ہے۔ حال سُن کر تسلی دی کہ شہر نزدیک ہی ہے۔ تم اندھیرے کی وجہ سے معلوم نہیں کر رہے ہو۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر مسجدِ شہر میں لے گیا اور خاطر داری کی۔ صبح وہاں سے میرا شریف کو روانہ ہوا۔ آپ سے ملاقات ہوئی تو جان گیا کہ وہی ہیں جو کوہِ سفید میں دستگیر ہوئے تھے۔ آپ نے تمام ماجرا سن کر تونسہ مقدسہ کی جانب منہ کرکے دُعا کی اور اس کو تسلی دی کہ تمہارے پہنچنے سے پہلے وہ گھر پہنچ جائے گا۔ فوراً اس کو رُخصت کر دیا۔ گھر پہنچا تو بیٹا آیا ہوا تھا۔ خدا کا شکر بجالایا۔ پھر چند روز کے بعد دونو باپ بیٹا آپ کی خدمت میں آکر بیعت ہوئے۔

(ص۔۵۲)

پھر دو شعر لکھے ہیں۔ نہیں معلوم کن کے ہیں۔

(ص۔۵۴)

حضرت خواجہؒ با فرمودند کہ حضرت خواجہ مولانا فخر الدین پیر و مرشد حضرت خواجہ مہاروی رضی اللہ تعالیٰ فرمودند کہ پیر و مرشد راچنداں قوت وہمت باشد کہ اگر مثلاً یک صد مرید بہ یک وقت مبتلا بہ سکراتِ موت باشند، گرچہ فاصلہ میاں ہر یک دوصد کوہ بود۔ شیخ کامل بسر ہر یک رسیدہ سلامتی ایمان ایں بارانگہہ دارد کہ مراد از بیعت کردن است۔ چوں ایں خبر مشتہر شدہ نزدیک بادشاہِ اسلام دہلی رسیدہ' بادشاہ متعجب شدہ ازوزیر تدبیر امتحان پرسید، وزیر عرض داشت کہ چند مرداں کہ خانۂ ہر یک از دیگر جدا باشد، ضیافت در یک وقت فقیر را کردہ بہ طلبند۔ اگر بہ خانۂ ہر یک رفتہ دعوتِ مسنونہ را اِجابت نمودہ تناول کند در دعوئ خود راست گوئی است ورنہ کذاب و مفتری۔ الغرض جملہ مرداں رفتہ ساعتی بعد ساعت استدعاد عوت قبول نمودہ خورسند شدند۔ علی الصبح حضرت مولانا فخر الدین صاحب اندروں حجرہ نشستہ خادم را حکم دادند، کہ ہر کس بہ دعوت طلبد را از بیرون در آوازدہ وقتی کہ بیروں شوم فی الحال در را بند بہ کن۔

حسب الحکم خادم تعمیل نمود۔ حضرت مولانا بہ خانہ ہر یک تناول نمودند و در حجرہ ہم مقیم بودند۔ روزِ دیگر حلیہ پیشینہ را تصدیق نمودند۔ ہر یک گفتند کہ از خانۂ ما طعام خوردند۔ بعد تصدیق ایں کیفیت نادم شدہ۔ فرمود کہ بہ ہیچ زک و شبہ نیست کہ مردانِ خدا ہمہ اوقات باہمہ مریدانِ خویش می باشند و مشکل کشائے می نمایند۔ از فضلِ رب العٰلمین قوت و توفیق دارند۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔

(ص۔۵۵)

(ص۔۵۵)

ایک بار پچرنڈ (پچند) کے فتح خان نے ایک شیعہ کو جو سید ہونے کا مدعی تھا۔ موضع توت میں بلایا اور مشہور کیا کہ یہ مردِ کامل ہے۔ اکثر لوگ شیعہ ہوگئے۔ حضرت خواجہ تک اطلاع پہنچی۔ سرفراز خان خادم خاص کے ساتھ تشریف لائے۔ دونوں گروہوں کو بلا کر فرمایا: کہ خواجہ معین الدین چشتی، سید جلال شاہ اوچ وسید عیسیٰ شاہ بلوٹ نے ہندوستان میں دین پھیلایا۔ ان کی کتابوں سے ان کا شیعہ ہونا ثابت کرو۔ ورنہ لوگوں کو گمراہ نہ کرو۔ سب سر بہ زانو ہوگئے۔ ایک بدبخت بولا۔ ہم خواجہ معین الدین چشتیؒ اور سید شاہ عیسیٰ کی کتابیں کہاں سے لائیں۔ ہمارے یہی سید راہبر ہیں۔ ہم کسی اور مذہب کے طلب گار نہیں۔ آپ رنجیدہ ہو کر چلے گئے۔ وہ بدکردار اسی روز قولنج سے مر گیا۔ گاؤں پر ژالہ باری سے زراعت برباد ہوگئی اور توت میں بیماری پھوٹ گئی۔ لوگ خدمت میں حاضر ہو کر تائب ہوئے۔ (ص۔۵۶)

تذکرۃ المحبوب

مولانا عبدالنبیؒ بھوئی گاڑوی

شرق ششم در بیانِ عاداتِ شریفہ کہ بہ موسے اختصاص ندارند

(۱) عادت شریفہ بود کہ اگر کَسے از خادمانِ دور یا نزدیک برائے حصولِ قدم بوسی آمدی تا عزت وے بہ حسبِ رُتبہ او کردندی، مثلاً اگر کَسے اَز عالم بودی تا از مسند برخاستہ اُورا با معانقہ مشرف میفرمودند و بہ وقتِ تناولِ طعام اُورا با خود شریک ساختندی و ہم چنیں اگر کَسے از رؤسا بودی عزت وے بہ مناسب او نیز فرمودندی۔

(۲) عادتِ شریفہ بود کہ از بعض مہمان کہ واقف باشد استفسار احوال بعض اہلِ خانہ وے ہم کردندی واز بعض توارد تفشیش نسب و مکان نیز میفرمودندی۔

(۳) عادتِ شریفہ بود کہ حصولِ علوم ظاہریہ ضروریہ را اَز شغل و ظائف مقدم میدانشتند و طلباء را تحریص بر حصولِ علوم ظاہر یہ می دادندو، و ظائفِ ایشاں را اندک میفرمودند و بعد از حصولِ علوم ظاہریہ شغل بہ وظائف را پسندمی نمودند۔ چنانچہ راقم آثم را نیز اجازۃ بعض وظائف موقوف بر تحصیلِ علمِ ظاہری فرمودہ بودند و عوام الناس را وظائف موافق وسعت و فرصتِ ایشاں میفرمودند۔

(۴) عادتِ شریفہ بود کہ اکثر مسترشداں را در مجلسِ عام بہ بیعت مشرف فرمودندی و بعض کساں را در خلوتِ خاص بہ ایں نعمتِ عظمیٰ نیز معزز ساختندی۔

(۵) عادتِ شریفہ بود کہ بہ مناسبِ حال ہر کَسے کفایتہً کلام میفرمودی و ظاہراً مخاطب غیر مخاطبِ حقیقی را کردندی۔

(۶) عادتِ شریفہ بود کہ اگر کدام مسئلہ فقہیہ ضروریہ دائر گشتے، پس اگر کَسے عالم بخدمتِ اقدس موجود بودے اَزو استفسار کردندی بالفرض اگر کَسے عالم در آں جا موجود نہ بودی تا خود بخود از کدام کتاب فقہیہ بہ طریقہ حکایت بیان کردندی نہ بہ طریقہ فتویٰ، و اگر مسئلہ تصوف واقع شدے تا از کَسے پُرسش نہ فرمودندی بلکہ خود بخود بہ طریقہ نقل از کدام کتابِ تصوف یا از کَسے صوفیائے کرام بیان فرمودندی۔

(۷) عادتِ شریفہ بود کہ در مصیبتِ شدیدہ نہایت صابر بودند و در کمال صبر ایشاں اکثر خواص مثلِ حضرت سجادہ نشین صاحب توسوئے واسرار آگاہ حضرت فقیر فاضلؒ شاہ صاحب و عوام در ورطۂ تحیر بودند، مر دایں رمزیست کہ آں زینت الاولیاء در دائرہ تسلیم ثابت قدم بودند۔

(۸) عادتِ شریفہ بود کہ گاہ گاہ کسے را بہ محاذی قدم مبارک خود جائے نشستن ندادندی وہم فرمودندی کہ حضرت صاحب بہ مقابلہ قدم مبارک خود کسے راجائے نشستن ندادندی۔

(۹) عادتِ شریفہ بود کہ جمیعتِ بعضے طلبا کہ نووارد باشند فوراً ساختندی بہ خلافِ بعضے کہ جمیعتِ ایشاں بہ دیر یا بہ سفارش بہ سر انجام آمدی و طلبا افغان یا شبینہ ایشاں کہ باشند جمیعت ایشاں از جہتہ خوفِ فساد کہ در سرشتِ ایشاں مرکوز میباشد نہ ساختندی۔

(۱۰) عادتِ شریفہ بود ہر کہ از طلباء مقیمی آستانِ عزم روانگی بہ کدام طرفِ دیگر نمودے پس بہ روانگی اُو خوش نبودندی۔

(۱۱) عادتِ شریفہ بود کہ ہر طلبائے کہ مصروف بہ خواندنِ علم و سعی اومیباشند و بہ لہو و لعب مشغول نہ گشتند خوش بودندے۔

(۱۲) عادتِ شریفہ بود کہ با طلباء و غیر ہم کہ از خادمان باشند بہ خوش طبعی ہم میفرمودندی۔

(۱۳) عادتِ شریفہ بود کہ بہ خواندنِ طلباء کتب مروّجہ مستعملہ متداولہ خوش بودندے بہ خلافِ کتبِ غیر مروجہ بلکہ از بہ خواندنِ ایں صراحۃً یا کفایۃً ہم منع فرمودندی۔

روزی راقم آثم بخدمتِ اقدس ایشاں بہ قصدِ تبرک "میر زاہد" رسالہ و "غلام یحیٰ" و "عبد العلی" در صفہ باراں دری بعد نمازِ ظہر شروع نمود، اولاً "میر زاہد" ثانیاً "غلام یحیٰ" چوں نوبت "عبد العلی" رسید، استفساء نمودند کہ ایں کدام کتاب است۔ عرض کردہ شد کہ "عبد العلی" است فرمودند کہ ایں راہیچ کس نمی خواند یعنی تعریضاً منع فرمودند۔ لکن راقم آثم چونکہ حریص بود شروع نمود و ثمرہ اش عدم تعلم یافت۔

حضرتِ مسندِ نشین صاحب میفرمانید کہ بعد از وصالِ آں زینت الاولیاء در ہموں سال چوں بہ خواندنِ میر زاہد رسالہ و غلام یحیٰ و عبد العلی شغل داشتم، پس در خواب آں زینت الاولیاء از خواندنِ "عبد العلی" مرا منع فرمودند و علیٰ ہٰذا القیاس چند بار منع فرمودن ایشاں از خواندنِ کتب غیر مروجہ بہ مشاہدہ رسید۔

(۔کذا) عادتِ شریفہ بود کہ بہ عقدِ نکاح اکثر طلباء خوش نبودندی۔

(۱۴) عادتِ شریفہ بود کہ با علمِ تصوف خصوصاً با مثنوی مولانا روم صاحب و علمِ معقول و عقائد بسیار محبت فرما بودند۔

چنانچہ راقم آثم را در سالہا اخیرہ کہ نظر مبارک ایشاں در آں سالہا ضعیف شدہ بود، بسا بار فرمودہ بودند کہ خاطرِ من می خواہد کہ "شرحِ عقائد و خیالی" ترا خود بخود تعلیم کنم لکن نظر من ضعیف شدہ است۔ انتہیٰ۔ و راقم آثم در اں زمان بہ خواندنِ "قطبی" مشغول بود۔ از ایں کلام شریف اگرچہ محبت ایشاں با علمِ عقائد ظاہر می شود لکن باراں کرم و شفقت ایشاں بر راقم پژمردہ نیز ہویدا است و قرینہ حالیہ نیز شاہد بر ایں امر بودند۔

(۱۵) عادتِ شریفہ بود کہ با کتب از ہر علم کہ باشند محبت فرماء بودند مگر با کتبِ وہابیہ و بخریدنِ کتب بہ ہر وجہ اعنی از نزدیک و دور را ارزاں و گراں سعی فرما بودن۔ حضرت مسند نشیں صاحب میفرمانید کہ بعد از خریدنِ بعض کتب ایں بیت را بر زبان مبارک ہم می راندند۔

بیت

جمادے چند بودم جاں خریدم

بہ نام ایزد عجب ارزاں خریدم

ودر جلد بندی کتب وحفاظت آں ہابس کوشش فرمودندی۔

(۱۶) عادتِ شریفہ بود کہ اگر کَسے معلم یا متعلم درایں بلدہ میمونہ اعنی کھڈ شریف طلبِ کتاب برائے استعمال کردی تا بروے عنایت فرمابودندے واگر کَسے از دیگر شہر آمدہ استعارہ کدام کتاب از حضورِ اقدس نمودی اُورا اَز خوفِ زیاں ہر گز کتاب ندادندی مگر مخدوم راقم آثم رااعنی جناب استاذیم میاں محمد خورشید صاحب ادام اللہ ضیاءہٗ لنگڑیالی راکہ از ایشاں کتب رادریغ نداشتندی چناں چہ "میر ہاشم"، "حاشیہ ہدایۃ الحکمۃ" عاریۃً ایشاں راچند بار دادہ بودند حضرت مسند نشیں صاحب می فرمانید بارے "مولوی عبد الحکیم"، "حاشیہ بیضاوی" در ایامِ عرس شریف مخدوم میاں صاحب مذکورازاں زینت الاولیاء طلبید بودند پس آں قدسی صفات مارا ای حضرت مسند نشیں وصاحب رافرمودند کہ برائے میاں صاحب لنگڑیال والا "مولوی عبد الحکیم"، "حاشیہ بیضاوی" از کتب طلبیدہ بیارند پس چوں در ذہنِ من اے حضرت مسند نشیں صاحب ایں امر رایافت کہ شاید برائے خاطر داری میاں صاحب موصوف ایں خطاب فرمودند والّا مرضی مبارک بر خلاف است۔ پس من برئے اجتہاد خود اعتماد کردہ در تعمیلِ امر تغافل ورزیدم اگرچہ در ظاہر تسلیم کردہ بودم پس از انقضائے ایّامِ عرس شریف مخدوم میاں بدوں کتاب بہ دولتِ خانہ خود راہی شدند بعد ازاں آں زینت الاولیاء مراطلبیدہ زجراًو تنبیہاً فرمودند کہ میاں صاحب را کتاب چرانہ دادہ ای از چنیں کس دریغ داشتن کتاب امر خوب نیست۔ انتہیٰ۔

سوال: میاں صاحب موصوف از استاذاں حضرت مسند نشیں صاحب اند پس چگونہ کتاب را از ایشاں دریغ فرمودند کہ ایں امر از شانِ حضرت مسند نشیں صاحب بعید تر است؟

جواب: دراں زماں علاقہ استاذیتہ میاں ایشاں نبود بلکہ ایں رشتہ بعد از وصالِ آں زینت الاولیاء بہ ظہور پیوست شاید آں زینت الاولیاء ایں زجر برائے ایں رشتہ استقبالیہ فرمودہ بودند کہ اولیاء اللہ بہ امورِ استقبالیہ علم میدارند چنانچہ بزرگی گفت

بیت:

عرش و کرسی و آسمان لوح و زمیں

می بود روشن بہ پیش شیخ دیں

(۱۷) عادتِ شریفہ بود ہر کہ بہ حضورِ اقدس کدام کتاب نذر گذاشتے اگرچہ کم قیمت بودی فی الحال آثارِ خوشنودی از چہرہ منورہ تاباں گشتندی۔

(۱۸) عادتِ شریفہ بود کہ چوں کَسے از بعض خادماں بہ حضورِ اقدس چیزے نذر گذاشتے پس بدوں گفتہ اُو ہر دو دَست را برائے دُعا نصب فرمودندی چنانچہ ایں امر در ایّامِ عرس بسا بار بہ مشاہدہ رسید بہ خلافِ بعض دیگر۔

(۱۹) عادتِ شریفہ بود ہر کہ بہ حضورِ اقدس ایشاں بہ رسمِ مراسلہ جاری دارد اُورا بہ مقابلہ ہر مرسلہ بہ جواب ممتاز فرمودی۔

(۲۰) عادتِ شریفہ بود کہ اگر کسے اَز خادماں عرض نماید التماس سفارش نامہ بہ طرف کَسے از علماء یار وساء دارد پس موجب گفتۂ او نگارش فرمودندی وہم بہ موجب اقتضاء اُو بہ مہر خود مزین ساختندی۔

(۲۱) عادتِ شریفہ بود کہ بہ وقتِ ثبت کردن مہر بر مراسلات نسبت کنندہ را فرمودندی کہ در آخرش ثبت نماید نہ بر سر نامہ۔ انتہیٰ۔

وطبع مثبت مقتضیٰ آں بودی کہ بر سر نامہ ثبت کردہ شدی تعظیماً لہ بنابراں آں قدسی صفات ثبت کنندہ را بہ وقتِ ثبت کردن تاکید فرمودندی کہ در آخر مسلہ ثبت نماید۔

بارے در بنگلہ شریفہ بہ وقتِ کہ دیگر ہیچ کس بدوں آں زینت الاولیاء وراقم آثم موجود نہ بود وراقم آثم بہ قبض جوارح مبارک کہ مشغول بود، پس دراں وقتِ عرض کردہ شد کہ " درودِ مستغاث "راقم آثم را بہ مُہر خود مزین فرمانید۔ پس از سر کمالِ شفقت کہ شیوۂ آں ذات اقدس است فرمودند کہ بہ ثبت مُہر چہ حاجت است۔ انتہیٰ۔ سبحان اللہ

دراں وقت چنداں سرور در دِل راقم آثم حاصل گردید کہ قلم از بیانش آبی است۔

بیت:

نیاید شرح آں ذوقے بہ اقلام
کجا در قول آید ذوقِ حالی

باز در جواب عرض کردہ شد کہ مارا از والدِ خود چناں ایماء رفتہ بود، لہٰذا بہ حضورِ اقدس معروض ساختہ شد الغرض شاید دوم روز بہ وقتِ چاشت استاذ قریشی صاحب مارا طلبیدہ فرمود کہ " درودِ مستغاث " مملوک خود را بیار کہ آں زینت الاولیا می فرمانید کہ عبدالنبی را بر " درودِ مستغاث "مہر خود ثبت کردہ بدہیم ،پس بہ موجب بمع اُستاذ قریشی صاحب بر بنگلہ شریفہ بہ حضورِ اقدس حاضر شدم و " درود " را نیز ہمراہ بردہ بودم۔ تاپس آں زینت الاولیاء استاذیم قریشی را فرمودند کہ در آخروے مہر ثبت بہ کند قضاءً در بنگلہ شریفہ دراں وقت سیاہی موجود نبود، پس برائے طلب سیاہی فی الحال از بنگلہ شریفہ نزول نمودہ در مسجد طلب سیاہی کردہ شد لکن از مسجد نیز دست یاب نہ شد، بس بہ کمالِ شتابی از مسجد بازار والی سیاہی آوردہ ام لکن چنداں عمدہ نبود۔ اماوجود را از عدم بہتر دانستہ بہ حضورِ اقدس حاضر کردہ شد، پس دراں وقت چوں اندرونِ بنگلہ شریفہ بمع سیاہی رسیدم، دیدم کہ آں زینت الاولیا " درودِ مستغاث " را در دست مبارک خود گرفتہ بودند و آخرش را واکردہ، استاذیم قریشی را فرمودند کہ دراں جا مُہر ثبت نماید۔

پس استاذ قریشی صاحب موجب فرمودہ عمل بجا آوردہ مہر ثبت نمود پس آں زینت الاولیاء فرمودند کہ عمدہ چسپیدہ است یا نے، شاید در جواب عرض کردہ شد کہ عمدہ چسپیدہ است مگر از یک طرف قدر نقصان دار است لکن حروفش ہمہ ظاہر اند پس از آں استاذ قریشی صاحب ارادہ ساخت کہ براول " درودِ مستغاث " بر سر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم باز کند تا کہ بہ وجہ احسن ثبت گردد، پس بدوں

اجازت آں زینت الاولیاء ارادہ قلب رابہ ظہور آورد، لکن جز چند خطوط سیاہی اثرش پدید نیامد، پس فی الحال آں خطوط رابدست محو ساخت۔

بداں کہ آں "درودِ مستغاث" کہ مزّیں بہ مُہر است تاحال نزد راقم آثم موجوداست و نقشِ مُہر آں زینت الاولیاء این بیت است۔

بیت

سلیماں محمد علی نامور

کزیشاں شد زین دین بہرہ ور

ونگین اش بہ صورتِ بیضہ گنجش دہم سرخ رنگ بود وحالاً نزد حضرت مسند نشین صاحب موجوداست

(۲۲) عادت شریفہ بود کہ مہر خود رابہ انگشتہائے خویش گاہے معلق نہ ساختہ بودند بلکہ بہ قلم دانی مدام بر شتہ بستہ بودی۔

ترجمہ:

شرقِ ششم

اُن عاداتِ شریفہ کے بیان میں جن کا کسی موسم کے ساتھ اختصاص نہیں۔

(۱) عادت شریفہ تھی کہ اگر کوئی خادمان میں دور و نزدیک سے حصولِ قدم بوسی کے لیے حاضر ہوتا تو آپ اُس کی حسبِ رُتبہ تکریم فرماتے۔ مثلاً اگر کوئی عالم ہوتا تو آپ اپنی مسند سے کھڑے ہو کر اُس سے معانقہ فرماتے اور کھانے میں اُسے اپنے ساتھ بٹھاتے۔ اگر کوئی رؤسا میں سے ہوتا تو اُس کے حسبِ مرتبہ اُسے عزت دیتے۔

(۲) عادت شریفہ تھی کہ بعض مہمانوں میں سے جو جان پہچان والے ہوتے اُن سے اہلِ خانہ کی خیریت بھی دریافت فرماتے۔ اور جو نئے آنے والے ہوتے اُن سے اُن کے نسب اور جگہ کا پوچھا کرتے۔

(۳) عادت شریفہ تھی کہ حصولِ علوم ظاہریہ ضروریہ کو شغل و ظائف پر مقدم گردانتے تھے۔ اور طلبا کو تحصیلِ علومِ ظاہریہ کے لیے شوق دلاتے اور وظائف میں کمی کا حکم دیتے۔ اور حصولِ علومِ ظاہریہ کے بعد شغل وظائف کو پسند فرماتے۔ چناں چہ راقم آثم (مولانا عبد النبی بھوئی گاڑوی) کے لیے بھی بعض وظائف کی اجازت کو تحصیل علوم ظاہریہ کے مکمل ہونے تک موقوف رکھا۔ اور عوام الناس کے لیے اُس کی وسعتِ قلبی اور فرصت کے مطابق وظائف کا حکم دیتے۔

(۴) عادت شریفہ تھی اکثر لوگوں کو محفل میں ہی بیعت فرما لیتے تھے لیکن بعض ایسے خوش نصیب تھے کہ انھیں خلوتِ خاص میں اس نعمتِ عظمیٰ سے عزت بخشتے۔

(۵) عادت شریفہ تھی کہ ہر کسی سے اُس کے حسبِ حال مختصر گفت گو فرماتے۔ اور ظاہراً مخاطبِ غیر کا ذکر کر کے مخاطبِ حقیقی تک اپنا پیغام پہنچاتے۔

(۶) عادت شریفہ تھی کہ اگر کوئی فقہی مسئلہ ضروریہ آپ کے سامنے پیش ہوتا، اگر تو کوئی عالم اُس محفل میں موجود ہوتا اُس سے پوچھتے۔ بالفرض کوئی عالم نہ ہوتا تو فقہ کی کتاب سے بہ طرزِ حکایت مسئلہ بیان فرماتے نہ بہ طریقِ فتویٰ۔ اگر مسئلہ تصوف سے متعلقہ پوچھا جاتا تو کسی سے پوچھتے نہیں تھے بلکہ خود بخود کسی تصوف کی کتاب کے حوالے سے یا کسی صوفی کے حوالے سے بیان فرما دیتے۔

(۷) عادت شریفہ تھی کہ سخت مصیبت میں بھی صابر رہتے۔ کمال اس میں یہ تھا کہ اکثر خواص جیسے حضرت فقیر فاضل شاہ صاحب سجادہ نشین (گڑھی افغانہ، ٹیکسلا) اور عوام ورطۂ حیرت میں ہوتے کہ یہ رمز کیا عجب ہے کہ وہ زینت الاولیاء دائرہ تسلیم میں کیا ثابت قدم ہیں۔

(۸) عادت شریفہ تھی کہ کبھی بھی کسی کے بیٹھنے کی جگہ کی طرف قدم مبارک نہیں رکھتے تھے۔ اور یہ فرماتے بھی تھے کہ حضرت صاحب (مراد حضرت مولانا محمد علی مکھڈیؒ) کبھی کسی کی نشست گاہ کی طرف قدم نہیں کرتے تھے۔

(۹) عادت شریفہ تھی کہ بعض طلبا کہ نووارد ہوتے فوراً داخلہ دے دیتے بہ خلاف اس کے کہ بعض نوواردان کو بہ دیر یا بہ سفارش داخلہ دیا جاتا۔ اور افغانی طلبا یا اُن سے مشابہت رکھنے والوں کو خوفِ فساد کی وجہ سے جو کہ اُن کی سرشت میں شامل ہے داخلہ نہیں دیتے تھے۔

(۱۰) عادت شریفہ تھی کہ ہر وہ طالبِ علم جو آستان پاک پر مقیم ہوتا اچانک کسی اور طرف روانگی کا اردہ کرتا تو آپ اُس کے اس عمل سے خوش نہ ہوتے۔

(۱۱) عادت شریفہ تھی کہ جو طالب علم، حصولِ وسعتِ علم میں مشغول رہتا اور لغو و لہب میں اپنے آپ کو مشغول نہ رکھتا آپ اُس سے خوش ہوتے۔

(۱۲) عادت شریفہ تھی کہ طلبا اور اُن کے غیر یعنی خادمانِ (خانقاہ و درسگاہ) سے خوش طبعی بھی فرماتے تھے۔

(۱۳) عادت شریفہ تھی کہ طلبا کا کتبِ مرّوجہ مستعملہ متداولہ پڑھنا پسند فرماتے تھے، بہ خلاف کتبِ غیر مرّوجہ کے۔ بلکہ (غیر مرّوجہ) کتب کا پڑھنا صراحتہً یا کنایتہً منع بھی فرماتے تھے۔

ایک دفعہ راقم آثم (مراد: مؤلف۔ مولانا عبد النبی بھوئی گاڑوی) نے آپ کی خدمتِ اقدس میں حصولِ برکت کے لیے رسالہ "میر زاہد"، "غلام یحیٰ" اور "عبد العلی" صفہ باراں دری میں بعد نمازِ ظہر شروع کیے۔ اولاً "میر زاہد" اور ثانیاً "غلام یحیٰ" (پڑھنا شروع کیا) جب باری "عبد العلی" کی آئی تو استفسار فرمایا کہ یہ کون سی کتاب ہے؟ عرض کی کہ "عبد العلی" ہے۔ فرمایا: یہ کوئی نہیں پڑھتا۔ یعنی تعریضاً منع فرمادیا۔ راقم آثم چوں کہ حریص تھا شروع کر دی۔ آخرِ کار آپ نے اس کی تعلیم نہ فرمائی۔

حضرت مسند نشیں (مراد: حضرت مولانا غلام محی الدین احمد۔ م۸ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء) فرماتے تھے کہ زینت الاولیاء کے وصال کے بعد اُسی سال جب رسالہ "میر زاہد"، "غلام یحیٰ"، "عبد العلی" پڑھنا شروع کیا۔ پس خواب میں آپ زینت الاولیاء نے "عبد العلی" کو پڑھنے سے منع فرمایا۔ اور اسی طرح چند بار منع فرمایا کہ کتب غیر مرّوجہ کا پڑھنا مشاہدے میں نہیں آیا۔

(۔) عادت شریفہ تھی کہ طلبا کا (دورانِ تعلیم) عقدِ نکاح کرنا پسند نہیں فرماتے تھے۔

(۱۴) عادت شریفہ تھی کہ علم تصوف خصوصاً مثنوی مولانا روم صاحب اور علم معقول و عقائد کو بہت زیادہ پسند فرماتے تھے۔ چناں چہ راقم آثم کو اخیر سالوں میں جب نظر مبارک کمزور پڑ گئی تھی فرمایا کرتے کہ میرا دل کرتا ہے کہ تجھے "شرح عقائد خیالی" پڑھاؤں لیکن میری نظر کمزور ہو گئی ہے۔ انتہیٰ۔ اور راقم آثم اُس زمانہ میں "قطبی" پڑھنے میں مشغول تھا۔ اس کلام شریف سے اگرچہ علم عقائد کے ساتھ آپ کی محبت ظاہر ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ راقم آثم کے ساتھ آپ کی کمال شفقت بھی ہویدا ہے۔ اور اب سے اس محبت و شفقت کے سایے میں ہوں۔

(۱۵) عادت شریفہ تھی کہ ہر علم کی کتب کے ساتھ محبت فرماتے تھے۔ مگر کتب وہابیہ سے منع فرماتے تھے۔ اعنی۔ دور و نزدیک سے سستی و مہنگی (ہر قسم کی کتاب) خریدنے کی کوشش فرماتے تھے۔ حضرت مسند نشین صاحب نے فرمایا کہ بعض کتب کے خریدنے کے بعد یہ شعر پڑھا کرتے۔

جمادے چند دادم جاں خریدم

بہ نام ایزد عجب ارزاں خریدم

ترجمہ:

چند سکّوں سے میں نے جان خرید لی ہے۔ بہ نامِ خدا کیا عجب ارزاں خریداری کی ہے۔

کتابوں کی جلد بندی اور حفاظت میں بہت کوشش فرمایا کرتے تھے۔

(۱۶) عادت شریفہ تھی اگر شہر میمونہ کھڈ شریف کے کسی طالب علم یا استاد نے کتاب مطالعے کے لیے مانگی تو آپ عطا فرما دیتے تھے۔ اور اگر کسی اور شہر سے آنے والے افراد کسی کتاب کے لیے استفسار کرتے تو آپ عنایت نہ فرماتے۔ عنایت نہ فرمانے کی وجہ کتاب کے ضائع ہونے کا خدشہ ہوتا۔ مگر مخدوم راقم آثم کو جناب استاذیم میاں محمد خورشید صاحب ادام اللہ ضیاءہٗ لنگڑیالی کو کتاب دینے سے دریغ نہیں فرماتے تھے۔ چناں چہ "میر ہاشم حاشیہ شرح ہدایۃ الحکمۃ" عاریۃً چند بار انھیں عطا کی۔

حضرت مسند نشیں صاحب نے فرمایا کہ ایک بار ایّام عرس مبارک مخدوم میاں صاحب (حضرت مولانا محمد علی مکھڈیؒ ۔۲۷۔۲۸۔۲۹ رمضان المبارک) کے موقع پر (استاد لنگڑیالی میاں محمد خورشیدؒ) نے "مولوی عبد الحکیم حاشیہ بیضاوی" آپ زینت الاولیاءؒ سے طلب فرمایا۔ پس آں قدسی صفات نے مجھے یعنی (غلام محی الدین احمدؒ) حضرت مسند نشیں صاحب سے فرمایا کہ برائے میاں صاحب لنگڑیالی جو کہ "مولوی عبد الحکیم حاشیہ بیضاوی" طلب کر رہے ہیں لے آؤ۔ حضرت مسند نشیں صاحب فرماتے ہیں کہ میرے ذہن میں خیال گزرا کہ شاید یہ بات میاں صاحب موصوف کی دل داری کے لیے کر رہے ہیں۔ اگرچہ آپ کی مرضی اس کے خلاف ہے۔ پس میں نے اپنے اجتہاد پر اعتماد کیا اور آپ کے تعمیلِ حکم میں تغافل برتا۔ اگرچہ ظاہراً میں نے تسلیم کیا تھا۔ پس ایّام عرس شریف مخدوم میاں صاحب گزرنے کے بعد (استاد لنگڑیالی) بغیر اس مطلوب کتاب کے گھر تشریف لے گئے۔ بعد ازاں آپ زینت الاولیاءؒ زجراً و تنبیہاً حکم فرمایا کہ میاں صاحب کو کتاب کیوں نہیں دی؟ ایسے شخص سے کتاب پوشیدہ رکھنا بہتر نہیں ہے۔ انتہیٰ۔

سوال:

میاں صاحب موصوف اساتذۂ مسند نشیں صاحب میں سے تھے۔ آپ نے انھیں کتاب دینے سے کیوں دریغ کیا؟ حالانکہ یہ بات حضرت مسند نشیں صاحب کی شان کے خلاف ہے۔

جواب:

اُس زمانہ میں استادی شاگردی کا رشتہ قائم نہیں ہوا تھا۔ یہ تعلق آپ زینت الاولیاء کے وصال کے بعد قائم ہوا۔ شاید آپ زینت الاولیاء نے یہ تنبیہ اُس رشتہ کے استقبال میں کی ہو۔ کیوں کہ اولیاء امورِ استقبالیہ کا علم رکھتے ہیں۔ چناں چہ بزرگوں نے کہا ہے۔
شعر

عرش و کرسی و آسمان لوح و زمیں
می بود روشنش بہ پیشِ شیخِ دیں

ترجمہ: عرش و کرسی اور لوحِ آسمان و زمیں، شیخِ دین کے سامنے ہر ایک روشن ہوتے ہیں۔(یعنی وہ اسرار و رموزِ الٰہیہ سے واقف ہوتے ہیں۔)

(۱۷) عادت شریفہ تھی کہ اگر کوئی جنابِ قدسی صفات کو کتاب نذر کرتا اگرچہ کم قیمت ہوتی آپ کا چہرۂ منور خوشی سے چمکنے لگ جاتا۔

(۱۸) عادت شریفہ تھی جب کوئی خادمان میں سے جنابِ اقدس کی بارگاہ میں کوئی چیز نذرانہ کے طور پر پیش کرتا آپ اُس کے لیے دونوں ہاتھ دعا کے لیے بڑھاتے اور یہ عمل ایامِ عرس پر بارہا دیکھنے میں آتا۔

(۱۹) عادت شریفہ تھی کہ جو حضورِ اقدس کے ساتھ رسم خط و کتابت شروع کرتا اُسے جواب سے ضرور ممتاز فرماتے۔

(۲۰) عادت شریفہ تھی اگر خادمان میں سے کوئی کسی عالم یا رؤساء کو کسی کام کے لیے سلسلہ میں سفارش نامہ کا عرض کرتا۔ تو اس کے کہنے کے مطابق تحریر لکھ دیا کرتے اور اپنی مہر سے اُس تحریر کو مزین بھی کرتے تھے۔

(۲۱) عادت شریفہ تھی کہ مراسلات پر مہر ثبت کرتے وقت حکم فرماتے تھے کہ آخر میں مہر ثبت کریں، نہ سرنامہ پر۔ انتہیٰ۔
اور طبعِ مثبت کی وجہ سے آپ کا مقتضٰی یہ ہو تا کہ تعظیماً سرنامہ پر مہر ثبت نہ کی جائے۔ اس بنا پر آپ قدسی صفات مہر ثبت کرنے والے کو تاکید فرماتے تھے کہ مہر مراسلہ کے آخر میں ثبت کرو۔

ایک دفعہ بنگلہ شریفہ (جامع مسجد مولانا کھڈیؒ اندرون شہر سے ملحقہ) میں عصر کے وقت جب راقم آثم کے علاوہ آپ زینت الاولیاء کے پاس اور کوئی نہ تھا۔ آپ کی خدمت میں مشغول تھا پس اُس وقت میں نے عرض کی کہ راقم آثم کے پاس موجود "درودِ مستغاث" کو اپنی مہر سے مزین فرمایے۔ پس آپ نے کمال شفقت فرماتے ہوئے جو آپ کی ذاتِ اقدس کا شیوہ تھا فرمایا کہ مہر ثبت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ انتہیٰ۔ سبحان اللہ۔ (اظہارِ شفقت سے) اُس وقت جو سرور و کیف دِلِ راقم آثم کو حاصل ہوا قلم اُس کے بیان سے عاجز ہے۔

شعر

نیاید شرح آں ذوقِ بہ اقلام
کجا در قول آید ذوقِ حالے

ترجمہ:

قلم اُس ذوق کی شرح کیسے بیان کر سکتا ہے جو قولِ یار سے طبیعت کو نصیب ہوا ہے۔

دوبارہ جو ابًا عرض کیا کہ مجھے میرے والد صاحب نے اس خواہش میں گرفتار کیا۔ لہٰذا حضورِ اقدس کی بارگاہ میں اس کے لیے عرض گزار ہوں۔ الغرض شاید دوسرے دن بہ وقتِ چاشت استاذ قریشی صاحب (مولانا ملوک علی شاہ قریشی ہاشمیؒ۔ تراپ۔ اٹک کے رہنے والے تھے۔ حضرت مولانا زین الدین کھڈیؒ کے دامن گرفتہ تھے۔ درس گاہ مولانا کھڈیؒ میں صدر مدرس رہے۔ آپ نہایت خوش نویس کاتب تھے۔ آپ کی کتابت شدہ کتب خانہ مولانا کھڈیؒ میں آج بھی محفوظ ہیں۔) مجھے طلب فرمایا کہ جو "درودِ مستغاث "تمہاری مملوکہ ہے لاؤ۔ کہ آپ زینت الاولیاء نے فرمایا ہے کہ عبد النبی (مولانا بھوئی گاڑوی) کے پاس موجود "درودِ مستغاث" پر مہر لگا دو۔ پس استاذ قریشی صاحب کے اشارے کے مطابق بنگلہ شریف پر حضورِ اقدس کے پاس حاضر ہوا۔ اور "درود شریف" بھی اپنے ہمراہ لے گیا۔ پس آپ زینت الاولیاء نے استاذ قریشی صاحب سے فرمایا کہ آخر میں مہر لگا دو۔ قضاً اُس وقت بنگلہ شریف میں سیاہی نہ تھی۔ پس اس وقت بنگلہ شریف میں سیاہی میسر نہ ہو سکی۔ مسجد میں سیاہی لینے گئے لیکن وہاں بھی موجود نہ تھی۔ بہت جلدی میں بازار والی مسجد میں سے سیاہی لے کر آیا لیکن وہ عمدہ نہ تھی۔ پھر بھی اس کے عدم وجود سے بہتر جانا اور حضورِ اقدس کی جناب میں پیش کر دی۔ اُس وقت جب میں بنگلہ شریف میں داخل ہوا میں نے دیکھا کہ آپ زینت الاولیاءؒ نے "درودِ مستغاث" کو اپنے دستِ مبارک میں پکڑا ہوا تھا۔ اور اُس کا آخری حصہ کھولا ہوا تھا۔ استاذ قریشی صاحب کو فرما رہے تھے کہ اس جگہ مہر لگاؤ۔ پس استاذ قریشی صاحب نے حکم میں بجا آوری کی لیکن مہر ثبت نہ ہوئی۔

پس آپ زینت الاولیاءؒ نے فرمایا کہ عمدہ چسپاں ہوئی یا نہ۔ شاید جواب دیا گیا کہ عمدہ لگی ہے مگر ایک طرف سے واضح نہیں البتہ حروف سب واضح تھے۔ پس آپ استاذ قریشی صاحب نے ارادہ کیا کہ اول "درودِ مستغاث" بر سر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم "والا صفحہ کھولا تا کہ دوبارہ احسن ثبت ہو۔ پس یہ بغیر اجازت آپ زینت الاولیاء دِل میں ارادہ ظاہر ہوا لیکن سوائے چند حروف کے سیاہی نے اثر نہیں کیا۔ پس فی الحال یہ خطوط ہاتھ سے محو ہو گئے ہیں۔

جاننا چاہیے کہ وہ "درودِ مستغاث" جو مہر سے مزین ہے اب تک راقم آثم کے پاس موجود ہے۔ اور نقش آپ زینت الاولیاء کی مہر کا یہ شعر ہے۔

شعر

سلیمان محمد علی نامور

کزیں شاں شدزین دین بہرہ ور

ترجمہ:

محمد علیؒ (حضرت شاہِ) سلیمان (کے وسیلہ) سے نامور ہوئے۔ اور آپ کی شان سے زین الدین بہرہ مند ہوئے۔

اور اُس کا نگینہ بہ صورتِ بیضہ خزانہ کی طرح سر خ رنگ کا تھا۔ اور ابھی تک حضرت مسند نشیں صاحب کے پاس موجود ہے۔

(۲۲) عادت شریفہ تھی کہ مہر مبارک کو کبھی اپنی انگلیوں میں نہیں پہنا۔ بلکہ ہمیشہ وہ قلم دان میں رکھی ہوتی تھی۔

سفرنامے

قسط---سیزدہم

انوارالکریمین

پروفیسر محمد انور بابر

سرور کون و مکان ﷺ منبر بننے سے پہلے موجود محراب کے غربی جانب کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرماتے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ رحمتِ کائنات ﷺ جمعہ کے روز کھجور کے خشک تنے کے پاس خطبہ ارشاد فرماتے۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا "انّا القیام قد شق علی وشکا ضعفافی رجیہ"

ترجمہ: مجھ پر قیام شاق گزرتا ہے اور میرے پاؤں میں ضعف آ گیا ہے"۔

تو حضرت تمیم دردی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ اگر اجازت فرمائیں تو میں آپ کے لیے ایک ایسا منبر تیار کردوں جیسا میں نے ملکِ شام میں بنتے دیکھا ہے۔ تاکہ آپ اس پر سکون و طمانیت سے فروکش ہوں۔ آپ نے اس تجویز کو پسند فرمایا اور بہتر بنانے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ چناں چہ آپ کے لیے دو زینوں کا منبر تیار کرلیا گیا۔(سنن ابوداؤد)

سیدنا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غلام کو * جنگل میں آٹلہ کی لکڑی جو سخت اور مضبوط ہوتی ہے، کاٹنے بھیج دیا۔ چناں چہ ان کے غلام کلاب نے لکڑی لاکر منبر بنایا۔ جس کے دو درجے اور ایک نشست گاہ تھی۔ منبر مبارک اس مقام پر جہاں آج بھی نصب ہے، حضور اقدس ﷺ جمعہ کے روز اس پر تشریف فرما ہوئے'۔(خطباتِ ابنِ سعد)

یاد رہے منبر بنوانے والے حضرات اور لکڑی لانے والے غلاموں کے بارے میں روایات میں اختلاف ہے۔ جس کی تفصیل تاریخ مدینہ منورہ مؤلفہ مولانا عبدالودود صفحہ ۲۰۰ صفحات پر دیکھی جاسکتی ہے۔

خشک تنا کی گریہ وزاری کا ایمان افروز واقعہ

حضور سیدِ عالم محبوب انس و جاں، حبیب خشک و تر ﷺ کے لیے جب منبر تیار ہو گیا تو آپ حسبِ معمول جمعہ کے دن خشک تنا کے پاس سے گزر کر منبر پر رونق افروز ہوئے ہی تھے کہ وہ خشک لکڑی فراق محبوب ﷺ میں زار و قطار رونے لگی۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ جس خشک تنا سے تکیہ لگایا کرتے تھے، منبر آجانے کے بعد ہم نے اس سے ایسی آواز سنی جیسے گابھن اونٹنی بچے کی پیدائش کے وقت نکالتی ہے چناں چہ سرورِ کائنات کون و مکاں ﷺ منبر سے اُتر کر اس کے پاس

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر (ر) لکی مروت، خیبر پختون خواہ

آئے اور اپنا دستِ مبارک اس پھیرا اور وہ خاموش ہو گیا۔ (تاریخِ مدینہ منورہ)

مذکورہ راوی نے اس رقت انگیز منظر کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

(☆) یعنی وہ لکڑی بچے کی طرح چلا اُٹھی۔ رحمتِ دوعالم ﷺ نے منبر سے اتر کر اُسے گلے لگالیا اور وہ بچے کی طرح سسکیاں بھرتی ہوئی خاموش ہو گئی۔ وہ لکڑی ذکرِ خداوندی کے سننے سے محرومی پر گریہ وزاری کر رہی تھی۔

سرورِ کون ومکاں ﷺ نے فرمایا اگر میں اس تنا کو تسلی اور تشفی دے کر خاموش نہ کرتا تو وہ اس جاں گداز صدمہ میں قیامت تک روتا رہتا۔ (ابنِ ماجہ)

علامہ ابنِ حجر عسقلانیؒ المتوفی ۸۵۲ھ / ۱۴۲۲ء سیدنا بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے سننِ دارمی کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں:۔

"سرورِ کون ومکاں، سلطانِ زمین وزماں ﷺ نے جب اس خشک تنے کو پیار اور محبت سے چپ کرا دیا تو اس سے مخاطب ہو کر فرمایا "اگر تیری چاہت ہو تو تجھے سابقہ حالت پر لوٹا دیا جائے اور سرسبز وشاداب ہو کر پُراز بہار، میوہ دار ہو جائے اور اگر تیری خواہش ہو تو تجھے بہشتِ جاوداں میں لگا دیا جائے۔ جنت کی نہروں اور چشموں سے سیر اب ہو کر خلد کی ابدی بہار سے لطف اندوز ہو اور تیرا پھل جنت میں اولیا، اتقیا وصوفیا وازکیا کھائیں"۔ خشک تنے نے جواب میں عرض کیا "اے نبی رحمت ﷺ! میں جنت میں جانا پسند کرتا ہوں"۔

پھر آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین سے مخاطب ہو کر فرمایا "اس نے جنت المخلد کو اختیار کر لیا ہے"۔ (سنن ابن داؤد جلد اول)

حضرت قاضی عیاض الاندسیؒ مذکورہ روایت کا آخری جملہ ان الفاظ میں نقل فرماتے ہیں "اختار دار البقا علی دار القضا" "اس نے جہانِ فانی پر عالم جاودانی کو ترجیح دی"۔ (شفا شریف، جلد اول، ص ۲۰۰)

علاوہ ازیں اس ایمان افروز واقعہ سے نبی احمد مختیار ﷺ کے اختیارِ اکمل اور تصرّفِ کامل کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے خشک تنے سے دینوی و آخروی خواہشات کی مرضی دریافت فرمائی اور اس کی خواہش کے مطابق فیصلہ صادر فرمایا۔ چناں چہ اسی جگہ یا منبرِ مبارک کے نیچے گڑھا کھود کر اسے دفن کر دیا گیا اور زہے نصیب اب بھی وہ جنت کی لازوال نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ (مقام دار الہجرہ ۶۶، وفاالوفا، ج ۲۷۶)

سندِ صدیق:۔

حضرت قاضی عیاض مالکیؒ "الشفاشریف" میں لکھتے ہیں کہ "کھجور کے خشک تنے کے رونے کی وجہ

جس کے شرقی طرف باب عبد العزیز اور عربی طرف بابِ سعود ہے۔ بیچ میں کھلا صحن ہے۔ جس کے درمیانی روش دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔

حجرہ شریف اور صفہ مبارک:۔ حضور ﷺ نے مسجدِ نبوی ﷺ کی تعمیر سے نو حجرے تعمیر کرائے۔ یہ حجرے پندرہ فٹ لمبے اور ساڑھے دس)۲/۱ ۱۰ افٹ چوڑے اور چھ فٹ اونچے تھے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ مبارک مسجدِ نبوی ﷺ سے بالکل متصل تھا۔ اتنا کہ حضور سرور کونین ﷺ جب مسجد میں معتکف ہوتے تھے تو ام المومنین اپنے حجرہ میں بیٹھی ہوتیں۔ آپ کے بالوں میں کنگھا فرمایا کرتیں۔ یہ حجرہ مبارکہ کچی اینٹوں کا تھا۔ بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر کے دو حصے کر دیئے تھے۔ ایک حصہ میں باہر سے آنے والے وفود سے آپ ملاقات فرماتے۔

روضہ مقدسہ:۔

حضور اکرم ﷺ کے وصال مبارک کے بعد یہی مبارک حجرہ آپ ﷺ کی آخری آرام گاہ بنا۔ اور اس کو روضہ انور کہتے ہیں۔ سر مبارک جانبِ مغرب ہے۔ قدمین شریفین جانبِ مشرق اور روئے انور بجانبِ قبلہ جنوبی سمت ہے۔

مدفن صدیق و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم

جب ۱۳ھ میں آپ ﷺ کے رفیق صادق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ وصال فرما گئے تو آپ کو حضور ﷺ کے برابر میں اس طرح دفن کیا گیا کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سر مبارک حضور ﷺ کے سینہ مبارک کی سیدھ میں ہے۔ اور جب ۲۳ھ میں حضور ﷺ کے دوسرے جان نثار حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جام شہادت نوش کیا تو ان کو ہی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اجازت خاص سے آپ کے سامنے ہی حضرت صدیق اکبر کے ساتھ دفن ہوئے۔

آپ ﷺ کا سر مبارک حضرت سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینہ مبارک کے برابر ہے۔ حجرہ مبارکہ میں ایک قبر کی جگہ ابھی خالی ہے جو از روئے فرمانِ عالی شان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت اس حجرہ شریف کی دیواریں اصل بنیادوں پر ہی کچی اینٹوں پر تیار کی گئی۔ ولید بن عبد الملک کے زمانے میں جب ازواجِ مطہرات کے دیگر حجرات کو شامل مسجد کیا گیا، تب بھی حجرہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اصل کچی

دیواریں باقی رکھی گئیں۔ اوراس کے چاروں طرف بہت ہی گہری بنیادیں کھود کر پنج گوشہ مضبوط چھتری کھڑی کی گئی۔ مگر عربی جانب جدھر سر مبارک ہے وہاں درمیان میں ذرا سی جگہ بھی نہ چھوٹ سکی۔

اس لیے پنج گوشہ عمارت نظر آرہی ہے دراصل تینوں مزارات بہ مع حجرہ مبارک کے اس کے اندر آگئے۔ یہ تعمیر حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانہ گورنری مدینہ منورہ میں تیار کروائی۔ ابتدا میں ہی روضہ مبارک پر گنبد نہ تھا۔

ستون ہائے رحمت

ریاض الجنہ میں واقع آٹھ ستون مثالی اور تاریخی نوعیت کے حامل ہیں۔ جنھیں ستون ہائے رحمت کہا جاتا ہے۔ ان میں ہر ستون نور کا مینار، فضیلت کا مرکز، سعادتوں کا مظہر، سرور کیف کا مصدر، قبولیت دُعا کا مصدن اور ابدی نجات و مغفرت کا عکاس ہے۔ ان کا مختصر احوال درج ذیل ہے۔

۱۔ استوانہ حنانہ مشہور اندلس سیاح ابن بطوطہ اپنے سفر نامے میں اسی دن شام کو ہم حرم شریف میں داخل ہوئے۔ اور مسجد کریم کو سلام کرتے ہوئے "باب الاسلام" میں ٹھہرے۔ روضہ نبوی ﷺ اور منبر نبوی کے مابین نماز ادا کی۔ او ستوانہ (حنانہ) کے باقی ماندہ حصہ کو بوسہ دیا۔ یہ ستون مابین روضہ نبوی ﷺ اور منبر ایک کھجور کا ایک خشک تنا گڑا ہوا تھا جس کا سہارا لے کر حضور ﷺ خطبہ فرمایا کرتے۔ جب آپ کے لیے منبر تیار ہوا تو آپ نے اس پر بیٹھ کر خطبہ ارشاد فرمایا تو یہ تنا آہ و بکا کرنے لگا۔ حضور ﷺ منبر سے نیچے تشریف لائے اس پر دست شفقت رکھا تو اس کا رونا بند ہوا۔ یہ تنا اس جگہ مدفون ہے۔ اس رونے ہی کی وجہ سے اسے حنانہ کہا جاتا ہے۔

۲۔ استوانہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور ﷺ نے ایک بار ارشاد فرمایا کہ اس ستون کے پاس ایک ایسا بابرکت ٹکڑا ہے کہ اگر میں اس کو ظاہر کردوں تو وہاں اتنا ہجوم ہو جائے کہ وہاں نماز پڑھنے کے لیے قرعے پڑنے لگیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو وہ جگہ معلوم تھی اور آپ نے اپنے بھانجے ابنِ زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بتائی تھی جب دیگر صحابہ کرام نے موصوف کو متعلقہ مقام پر نماز پڑھتے دیکھا تو ان کو بھی اس ستون کا علم ہو گیا۔ اس وجہ سے اسے استوانہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔

۳۔ استوانہ ابی لبابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یہ استوانہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بائیں طرف ہے اسے استوانہ توبہ بھی کہتے ہیں۔ ہوا یوں کہ ایک صحابی حضرت ابی ابابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی کسی لغزش کی بنیاد پر بطورِ سزا اپنے آپ کو اس ستون سے باندھ کر قسم کھائی تھی کہ جب تک میری توبہ قبول نہ ہو گی۔ اس طرح بندھا رہوں گا خواہ اس حالت میں موت آجائے۔ چناں چہ سات روز مکمل اسی طرح بندھے رہے۔ ان کی بیوی اور بیٹی ان کی نگہداشت کرتیں۔ انسانی ضرورت اور نماز کے وقت کھول دیتیں اور فارغ ہونے پر پھر

باندھ دیتی تھیں۔ کھانا پینا ترک کر دیا تھا یہاں تک کہ غشی طاری ہو جاتی۔ جب حضورِ اکرم کو ﷺ اس کی اطلاع ملی تو فرمایا "اگر وہ پہلے ہی بار گاہِ رسالت پناہ میں حاضر ہو جاتے تو میں ان کے لیے عفوالرحیم سے استغفار کرتا۔ لیکن اب تو خود انھوں نے اپنے آپ کو بار گاہِ ربوبیت میں باندھ رکھا ہے۔ اس کیے اذنِ ایزدی کے بغیر' میں بھی نہیں کھول سکتا۔ ان کی ندامت اور خلوص کا یہ ثمر تھا کہ قرآنِ مجید میں ان کی توبہ کی قبولیت کا مژدہ سنایا۔ جو قرآنِ مجید کا جزو بن گیا۔ چناں چہ سات روز کے بعد بہ وقتِ سحری حضرت جبرائیل امین علیہ السلام یہ آیاتِ کریمہ لے کر تشریف لائے۔

يَاأَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُولَاتَخُوْنُوْاللهَ وَالرَّسُوْل

چناں چہ حضور سرورِ کونین ﷺ جب صبح کی نماز کے لیے تشریف لائے تو اپنے دستِ اطہر سے کھول دیا۔ اس واقعہ کی بنا پر اس ستونِ مبارک کا نام، استوانہ ابی لبابہ پڑ گیا۔ (معارف القرآن)

سیدنا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ بیان فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ جب اعتکاف میں بیٹھتے تو اس ستون کے پاس آپ کا بستر یا چارپائی بچھائی جاتی اور آپ ﷺ اس ستون سے تکیہ لگاتے تھے۔ (سنن ابن ماجہ —— السننِ کبریٰ)

۴۔ استوانہ وفود۔ یہ وہ مقام ہے جہاں باہر سے آنے والے وفود بار گاہِ نبوت میں مشرف باریابی حاصل کرتے۔

۵۔ استوانہ حرس۔ یہ ستون وفود سے جنوب میں پہلا ستون ہے۔ حرس کا معنیٰ پاسبان کے ہیں۔ آیتِ حفاظت کے نزول سے پہلے اس مقام پر صحابہ کرام کھڑے ہو کر حضور ﷺ کا حفاظتی پہرا دیا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے بھی یہ خدمت انجام دی ہے۔ اس لیے اسے استوانہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ بھی کہتے ہیں۔

۶۔ استوانہ حریر۔ یہ ستون حجرہ مقدسہ مطہرہ کی جالی کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ مسجد میں اعتکاف کے ایّام میں آپ یہاں بیٹھنے، لیٹنے کے لیے چٹائی بچھایا کرتے تھے اور بعض اوقات دروازہ حجرہ مبارک کی طرف سر مبارک کر لیا کرتے تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا آپ کے سر میں تیل لگاتیں اور کنگھی کیا کرتیں۔ جب کہ آپ ﷺ کا جسدِ اطہر مسجد میں ہوتا۔ (بخاری شریف)

۷۔ استوانہ تہجّد۔ یہ ستون سیدہ فاطمہ زہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا کے حجرہ کے شمال میں واقع ہے۔ اس کے مقابل اصحابِ صُفّہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم کا چبوترہ ہے۔ اس مقام پر سید الاولین و آخرین خاتم النبیین ﷺ نمازِ تہجّد ادا فرمایا کرتے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ رات کے وقت چٹائیوں کا حجرہ بنا لیتے اور اس میں نمازِ تہجّد پڑھا کرتے اور صبح چٹائیوں کو ہٹا لیتے۔ بعد میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم بھی آپ ﷺ کے ساتھ مل کر نمازِ تہجّد پڑھنے لگے۔ مگر چند دن آپ ﷺ تہجد کے لیے گھر سے نہ نکلے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ

عنہم کے دریافت کرنے پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "مجھے اس بات کا خدشہ لاحق ہوا ہے کہ کہیں تم پر تہجّد فرض نہ ہو جائے۔ اور تم اسے پورا نہ کر سکو۔ لہٰذا نفل نماز اپنے گھروں میں پڑھو۔ (مسلم شریف۔ جلد اوّل ۲۹۶)

(۸) استوانہِ جبرائیل علیہ السلام۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت جبرائیل علیہ السلام سے ملاقات ہوتی۔ وصالِ مبارک سے پہلے کے رمضان المبارک میں حضور ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن شریف کا دور (دہرائی) فرمایا تھا۔ استوانہ تہجّد اور استوانہ جبرائیل علیہ السلام دونوں ستون روضہ مبارک کے اندر آ گئے ہیں۔ اس لیے باہر سے نظر نہیں آتے۔ گنبدِ خضریٰ انہی ستونوں پر قائم کیا گیا ہے۔

-------جاری ہے۔

☆☆☆

خاکے

عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

یاسر اقبال☆

کہا جاتا ہے کہ شخصیت فرد کے ذہنی، جسمانی، شخصی، برتاؤ، رویوں، اوصاف اور کردار کے مجموعے کا نام ہے۔بہت مشکل ہوتا ہے ایک ایسے انسان کی شخصیت کو پرکھنا اور اس کے بارے میں اپنے خیالات و محسوسات کو بیان کرنا جس کی شخصیت کے تمام پہلوؤں میں ایک خاص طرح کا تناسب پایا جائے۔آپ کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس پہلو کی بنیاد پر شخصیت کو پرکھیں اور اپنی رائے قائم کریں۔مثال کے طور پر ایک ایسی عمارت کا تصور کریں جس کی بناوٹ میں ہر چیز اپنی جگہ پر اہمیت کی حامل ہو، اس کا ڈھانچہ، اس کا رنگ، اس کے نقش و نگار، اس کی کشادگی الغرض پوری عمارت کی جمالیات میں ایک خاص طرح کا تناسب موجود ہو۔بالکل اسی طرح ہم انسانوں میں کچھ شخصیات میں قدرت نے ایک خاص طرح کا تناسب رکھا ہوتا ہے ہم اس تناسب کو نظر انداز کر کے ان کی شخصیت کا بصری تصور قائم نہیں کر پاتے۔پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کا شمار بھی ایسی شخصیات میں ہوتا ہے جن میں نہ صرف شخصی تناسب موجود ہے بلکہ ان کی شخصیت کئی منور گوشوں پر مشتمل ہے۔وہ اردو زبان و ادب کے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بیدار مغز نقاد، محقق، مدون، شاعر اور ماہر لسانیات ہیں۔ان کی شخصیت کے ان تمام پہلوؤں کو لباسِ تحریر میں لانا میرے لیے کسی طور ممکن نہیں۔میں تو صرف چند باتیں چند یادیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔۔ڈاکٹر صاحب سے میرا تعلق کم و بیش تیرہ چودہ سال پر محیط ہے۔اس تعلق کا آغاز تو اس وقت ہو گیا تھا جب ڈاکٹر صاحب کے بچے (فہد اور سرمد) میرے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔جب کہ یہ تعلق ایک مضبوط رشتے میں اُس وقت استوار ہوا جب میں ایم فل میں ڈاکٹر صاحب کے دائرۂ درس میں شامل ہوا۔اپنے اس تعلق کی بنیاد پر میں نے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔

بذلہ سنج، روشن دماغ اور من موہنی شخصیت کے حامل ڈاکٹر صاحب کے پاس گھنٹوں بیٹھنے کا موقع ملتا رہا ہے۔ادب ہو یا آرٹ، سیاست ہو یا سماج، شاعری ہو یا نثر، تنقید ہو یا تحقیق کوئی موضوع ایسا نہیں ہوتا جو زیرِ بحث نہ رہتا ہو۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ایم فل اردو کے داخلے کے لیے میں انٹرویو دینے ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں داخل ہوا تو میری پروفائل میں میرا شعبہ اردو ادب کے ساتھ ساتھ فن موسیقی بھی درج تھا۔ساتھ ہی میں ادب اور موسیقی پر ایک عرصے سے لکھ بھی رہا تھا۔ڈاکٹر صاحب کو جب میری سنگیت شناسی کا علم ہوا تو انھوں نے انٹرویو میں پہلا سوال ہی موسیقی کی مبادیات سے متعلق کر دیا۔ڈاکٹر صاحب نے اپنے سچے اور کھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا کہ آپ فن موسیقی بھی جانتے ہو تو یہ بتاؤ کہ یہ "سُرتیاں" کیا ہوتی ہیں؟سوال سن کر پہلے تو میری سی ٹی گم ہو گئی کیوں کہ ڈاکٹر صاحب سے مجھے ایسے سوال کی بالکل توقع نہیں تھی اور وہ بھی "سُرتی" سے متعلق تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔خیر

☆ لیکچرر اُردو، اسلام آباد ماڈل کالجز، اسلام آباد

جیسا تیسا کر کے میں نے ڈاکٹر صاحب کو سرتی کے بارے میں بتا دیا کہ کس طرح ہندوستانی سنگیت میں زمانہ قدیم میں بائیس سرتیوں کا نظام رائج تھا اور پھر کس طرح بائیس سے بارہ سُر متعین ہوئے۔ اس وقت مجھے اندازہ ہو گیا کہ ڈاکٹر صاحب کس قدر گہرے سنگیت شناس ہیں۔ داخلہ ہو گیا۔ کلاسسز بھی شروع ہو گئیں۔ یونی ورسٹی کے دیگر اساتذہ سے بھی رابطہ استوار ہو گیا لیکن جو تعلق میرا اور میرے دیگر ہم جماعتوں کا ارشد محمود ناشاد سے ہوا وہ سب سے منفرد تھا، اس کی ایک وجہ کہ ڈاکٹر صاحب ایک ہر دلعزیز اور انسان دوست شخصیت کے حامل تھے۔ ایک دفعہ طالبعلم ان کے کمرے میں جاتا تو پھر وہیں کا ہو کر رہ جاتا۔

ڈاکٹر صاحب وقت کی نہ صرف خود پابندی کرتے ہیں بلکہ اپنے طلبا سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں۔ بارش ہو یا بیماری وہ ہمیشہ اپنے وقت پر یونی ورسٹی پہنچتے ہیں اور ان کا دفتر پورے وقت غیر مقفل رہتا ہے۔ وقت کی پابندی کا یہ اصول اتنا سخت تھا کہ بعض دفعہ اچھے اچھوں کو اُن سے ڈانٹ کھانا پڑتی تھی۔ ایک دفعہ کچھ ایسا ہوا کہ ایم فل کی ورکشاپ کی کلاسسز جاری تھیں۔ ہم لوگ بھی کلاسوں میں باقاعدگی سے جا رہے تھے۔ ہم میں سے اکثر طلبا وقت کی پابندی نہیں کرتے تھے اور کلاس میں دیر سویر سے ہی پہنچتے تھے۔ باقی اساتذہ کے ہاں تو رعایت مل رہی تھی اور ہم بھی اس روزانہ کی دیر سویر کے عادی ہو چکے تھے۔ ایک دن میں اور چند دوسرے لڑکے جب کمرۂ جماعت کے دروازے پر پہنچے تو خلافِ معمول اندر جانے لگے تو کلاس اٹینڈڈ (غلام مصطفیٰ) نے ہمیں اندر جانے سے روک دیا اور کہا کہ ناشاد صاحب کا حکم ہے کہ دورانِ کلاس نہ کوئی کلاس میں سے باہر جا سکتا ہے اور نہ کلاس شروع ہونے کے بعد اندر آ سکتا ہے، لہٰذا آپ اندر نہیں جا سکتے۔ اب تک ہم سب لڑکے یہ بات تو اچھی طرح جان چکے تھے کہ ناشاد صاحب ایک بارعب استاد ہیں اور اپنے تدریسی اصولوں سے کبھی بھی سمجھوتا نہیں کرتے لہٰذا باہر دروازے پر کھڑے ہو کر ڈیڑھ گھنٹے کا لیکچر سنا اور رجسٹر پر نوٹ کیا۔ ڈاکٹر صاحب باہر نکلے، سگریٹ سلگایا اور ہم سب کے ساتھ چہل قدمی کرنے لگے اور گفتگو کرنے لگے۔ وہ دن اور اس کے بعد پھر کبھی کوئی لڑکا ناشاد صاحب کی کلاس میں دیر سے نہیں پہنچا، بل کہ ان کے آنے سے پہلے ہی کمرۂ جماعت کھچا کھچ بھرا ہوا ہوتا تھا۔

میرا کالج، یونی ورسٹی سے چند کلو میٹر کے فاصلے پر ہے اور میں اکثر ڈاکٹر صاحب کے پاس حاضر ہوتا رہتا ہوں۔ یہ قربت اتنی بڑھ گئی تھی کہ آج بھی ایم فل کی تکمیل کے بعد ہفتے میں ایک دو بار تو ضرور میں ڈاکٹر صاحب کے پاس جاتا ہوں اور دیر تک ان کی گفتگو سے استفادہ کرتا ہوں۔ ان کا درویشانہ اور عالمانہ مزاج میرے لیے ہمیشہ مشعل راہ بنا ہے۔ میں نے اس بات کو اکثر محسوس کیا ہے کہ جب بھی غمِ روزگار یا کالج کی کھچ کھچ سے میرا دل پریشان ہوتا ہے تو میں ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔ وہ اس طرح میرا باطنی علاج کرتے ہیں کہ چشم وزدن میں وہ پژمردگی رفو ہو جاتی ہے اور میں تازہ دم ہو کر اُن کے پاس سے اٹھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ اب تک بدستور قائم ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو ان کی حسِ جمالیات بھی ہے۔ یہ حِس ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ میرے نزدیک ان کی شخصیت و مزاج کا غالب عنصر جمالیات کا ہی ہے۔ تصنیف و تالیف کا عمل ہو یا شعر و نثر کی تخلیقی واردات ہر سطح پر جمالیات کا عکس واضح نظر آتا ہے۔ موسیقی، خطاطی، شاعری سے ان کی رغبت فنونِ لطیفہ کی جمالیات کا آئینہ دار ہے۔ ادب و فن کو وہ ہمیشہ اس

کی جمالیات کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ ان کی پوری زندگی لکھنے پڑھنے میں گزر رہی ہے لیکن اس کام میں وہ ہمیشہ صلے وستائش کی تمنا سے بے نیاز رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ ادب کو اس کی جمالیات اور مقصدیت کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ وہ اکثر کہتے ہیں کہ تحریر ایسی ہو کہ اس میں بات کرنے یا کہنے کا سلیقہ قرینہ موجود ہو تا کہ واضح طور پر قاری تک بات پہنچ سکے چاہے وہ بات نثر میں ہو یا شعر کی صورت میں۔ غیر واضح نظریات یا ادب میں مبہم قسم کے خیالات کی ہمیشہ وہ تردید کرتے ہیں۔ وہ اکثر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہمیں خیر کی تلاش میں رہنا چاہیے اور زندگی کی خوبصورتیوں اور رنگوں کا متلاشی ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب بڑی پہلو دار شخصیت رکھتے ہیں شاعری، تحقیق و تنقید کے کاموں سے تو ہر ایک ان کا معترف ہے ہی لیکن میرے نزدیک ڈاکٹر صاحب کے اندر ایک فنکار چھپا ہوا ہے ایک ایسا تخلیق کار جو کئی جہتوں میں اپنے فن کا اظہار کر دیتا ہے۔ طلبا کے قلوب و اذہان کو پرکھنے میں انھیں خاص طرح کی مہارت حاصل ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایم فل اردو میں جب موضوعات کے تعین کا مرحلہ آیا تو ہر طالب علم کو ڈاکٹر صاحب طلبا کی صلاحیتوں اور رجحانات کو پیش نظر رکھ کر موضوع کا انتخاب کرنے میں رہنمائی کرتے تھے۔ میں بھی موضوع کے انتخاب میں الجھن کا شکار تھا لیکن ڈاکٹر صاحب نے کہا آپ چوں کہ سنگیت شناس ہیں اور ہمارے ہاں جامعات میں موسیقی وادب کے باہمی روابط کے حوالے سے ابھی تک کوئی کام نہیں ہوا، آپ اس طرح کریں کہ نیم کلاسیکی موسیقی کی صنف غزل گائیکی اور اس کے اسالیب پر کام کریں۔ اس کام میں سب سے بڑا اور بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ یہ ایک ایسا موضوع تھا جس کا تعلق سننے سے متعلق تھا اور موسیقی پر ویسے بھی گنتی کی چند کتابیں موجود تھیں اور غزل گائیکی پر تو تحریری مواد نہ ہونے کے برابر تھا۔ میرے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی تھی لیکن ڈاکٹر صاحب بہت مطمئن تھے کہ آپ یہ کام کرلیں گے گھبرائیں نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف اپنے ذاتی کتب خانے سے مجھے موسیقی پر کتابیں فراہم کیں بلکہ ہر دوسرے دن میں ان کے پاس بیٹھتا اور وہ بیگم اختری، استاد برکت علی خان، استاد بڑے غلام علی خان کی گائیکی پر بڑی پُر مغز گفتگو کرتے رہتے، غزل گائیکی میں جتنے اسالیب برتے گئے ہیں ان پر سیر حاصل گفتگو کرتے۔ ان نشستوں کا یہ فائدہ ہوا کہ موضوع میری دسترس میں آتا گیا اور پھر میں لکھتا ہی گیا۔ دورانِ مقالہ مجھے پتا چلا کہ ڈاکٹر صاحب ہندوستانی سنگیت شناسی کا کس قدر ملکہ حاصل ہے۔

ڈاکٹر صاحب زندگی کا ایک بھرپور تصور رکھتے ہیں۔ میں نے ان کے چہرے پر ہمیشہ بشاشت ہی دیکھی ہے۔ جو بھی ان کے پاس آتا ہے وہ گرمجوشی سے آنے والے مہمان کا استقبال کرتے ہیں۔ چائے کا لنگر تو ان کے کمرے میں ہر وقت چلتا ہی رہتا ہے۔ مایوسی کو تو میں نے کبھی ان کے قریب نہیں دیکھا۔ ہمہ وقت قلبِ مطمعنہ کی دولت سے ان کا دل مالا مال رہتا ہے۔ اپنے طلبا سے ہمیشہ ان کا رویہ مشفقانہ رہتا ہے۔ استاد اور شاگرد کے اس تعلق میں ان کی شخصیت ایک خیر خواہ اور شفیق باپ کی طرح نظر آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان ایک سماجی جانور ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی زندگی اس مقولے کی مکمل آئینہ دار ہے۔ ایک دفعہ اٹک جو ان کا آبائی شہر ہے مجھے اپنی رفاقت میں ایک بار وہاں کے ادبی حلقے میں لے گئے (میرے خیال میں وہاں اٹک کے معروف شاعر دانشور اردو و فارسی ادبیات کے عالم غلام محمد نذر صابری صاحب کی برسی کی تقریب تھی)۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب جیسے صاحب علم انسان کے حلقۂ احباب میں ہر

طرح کے انسان شامل ہیں۔ ہر طرح کے سماجی سطح کا حامل انسان ان کا دوست تھا وہ ان کے پاس رکتے، گپ شپ لگاتے، چائے پیتے کاروبار سے متعلق ان سے احوال پوچھتے۔ دورانِ سفر اُنھوں نے اپنے شہر کیمبل پور (اٹک) کے گرد ونواح کے بارے میں مجھے معلومات دیں۔ میں نے پوچھا کہ قلعہ اٹک کے بارے میں مجھے بتائیں۔ انھوں نے قلعے سے متعلق تاریخی حوالے سے بہت کچھ بتایا لیکن مجھے اپنی زندگی سے جڑا ہوا ایک واقعہ سنایا جسے یاد کر کے آج بھی میں لطف لیتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کے زمانہ جوانی میں، میں نے اٹک کی تاریخ اور ثقافت پر کام کا آغاز کیا۔ مختلف عمارتوں، مزارات اور تاریخی یادگاروں کی تصویریں بنانا بھی اس کا حصہ تھا۔ مجھے قلعۂ اٹک کی تصوریں لینا تھیں۔ ان دنوں نہ موبائل تھے نہ اچھے کیمرے۔ اگرچہ میں نے عام سے کیمروں سے متعدد بار قلعے کی تصوریں بنالیں تھیں مگر کوئی بھی تصویر مجھے مطمعن نہ کر سکی۔ وسائل محدود تھے اور اچھا کیمرہ لینا مشکل تھا۔ اتفاق سے ان دنوں میں، مَیں اپنے شہر میں ایک شادی پر لڑکی والوں کی طرف سے مدعو تھا۔ جب میں شادی والے گھر پہنچا تو کسی دوسرے شہر سے بارات آئی ہوئی تھی اس بارات کے ساتھ ایک کیمرہ مین تھا جس کے پاس ایک عمدہ کیمرہ تھا۔ میں نے موقع ملتے ہی اس سے ملاقات کی اور اس سے گزارش کی کہ، وہ میرے ساتھ اٹک قلعے تک جائے اور ایک دو عمدہ تصویریں بنادے تو میں اسے مناسب پیسے ادا کروں گا۔ وہ راضی ہو گیا مگر اسے معلوم نہ تھا کہ قلعہ اٹک شہر سے پندرہ بیس کلو میٹر دور ہے۔ کیمرہ مین کو بتایا تو وہ قدرِ پس و پیش کرنے لگا لیکن آخر مان گیا۔ میں نے ایک دوست کو گاڑی سمیت تیار کر رکھا تھا۔ ہم تھوڑی دیر میں اٹک قلعے پہنچ گئے۔ اٹک قلعہ میں فوج رہتی ہے اس لیے اندر جانا تو مشکل تھا دریائے سندھ کے دوسری طرف سے پورے قلعے کی تصویر کے حصول کے لیے ہم نے دریا کا پُل پار کیا اور قلعے کی تین چار تصویریں بنائیں۔ واپسی پر پل کے عین اوپر سیکورٹی کی گاڑی نے ہمیں رُکنے کا اشارہ کیا۔ شاید تصویریں بناتے ہوئے کیمرے کی لائٹ انھوں نے دیکھ لی تھی۔ ایک فوجی گاڑی سے اتر آیا اور کہنے لگا کہ آپ لوگوں کو معلوم نہیں کہ قلعے کی تصویر بنانے کی اجازت نہیں ۔ میں نے اسے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ اٹک کی تاریخ میں قلعے کی بہت حیثیت ہے اس لیے اس کی تصویر بنائی ہے۔ اُس نے کیمرہ ہم سے لے لیا اور کہا کہ اب کیمرہ آپ کو نہیں مل سکے گا۔ میری حالت بہت خراب ہوگئی اور میں نے اس فوجی کی بہت منت سماجت کی مگر وہ نہ مانا اور ہمیں اپنے انچارج کے پاس لے آیا، ان کے انچارج نے بتایا کہ کہ یہاں تصاویر لینا ممنوع ہے اور یہ ایک سیکورٹی کا معاملہ ہے اور ہم کسی صورت میں عکس بندی کی اجازت نہیں دے سکتے۔ ہاں البتہ اتنا کر سکتا ہوں کہ کیمرہ آپ کو واپس کر دیتا ہوں لیکن اس کے اندر جو فلم ہے وہ نہیں ملے گی۔ انچارج کا یہ فیصلہ تو ہمارے لیے اور بھی پریشان کن تھا کیوں کہ اس فلم میں شادی کی تصوریں تھیں اور کیمرہ مین بے چارہ تو اپنی مزدوری کرنے آیا تھا اور میری وجہ سے وہ مصیبت میں پھنس گیا۔ دوسری طرف ہمیں دیر بھی کافی ہوگئی تھی۔ قوی امکان تھا کہ اب تو باراتیوں نے بھی کیمرہ مین کو ڈھونڈنا شروع کر دیا ہو گا۔ اس کے بعد ہم مایوس ہو کر واپس آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ میں نے کیمرہ مین سے بہت معذرت کی اور ساتھ ان کو طے شدہ رقم سے بھی زیادہ پیش کی لیکن اصل پریشانی پیسوں سے زیادہ شادی کی تصویروں کی تھی جو فلم کے ساتھ ضبط ہو گئی تھیں۔ بارات دلہن لے کر رُخصت ہو گئی۔ آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ باراتیوں

نے کیمرہ مین سے کیا معاملہ کیا ہو گا۔ اس واقعہ کو یاد کر کے آج بھی ڈاکٹر صاحب اس کیمرہ مین کے لیے جذبۂ ہمدردی کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی سرشت میں سخت کوشی اور تحقیقی و تنقیدی بصیرت کا بڑا عمل دخل ہے۔ وہ ادب کے ہر کام کو انتہائی محنت اور استقامت سے سرانجام دیتے ہیں۔ زبان کی ڈاکومنٹیشن میں انھیں خاص طرح کی صلاحیت حاصل ہے۔ چھاچھی بولی کی ڈاکومنٹیشن پر جب وہ کام کر رہے تھے تو وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ مجھے چھاچھی بولی پر کام کرتے ہوئے بہت فیلڈ ورک کرنا پڑا۔ موٹر سائیکل پر موسمی شدت، وسائل کی کمی اور سفری صعوبتوں کے باوجود اٹک اور اس کے دور دراز مضافات میں جاتا تھا اور جو اس بولی کے بولنے والے موجود تھے انھیں ڈھونڈ کر ان سے گفتگو کرتا اور اپنے پاس ان کے لب و لہجے کو ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے محفوظ کر لیتا تھا۔ ریسرچ کا یہ سلسلہ کئی عرصے پر محیط رہا لیکن کسی سطح پر بھی کم ہمتی کو اپنے اوپر طاری نہیں ہونے دیا اور بڑی یکسوئی کے ساتھ اپنے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

قیس ہو کوہ کن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

ایک اچھے استاد کی دیگر صفات کے ساتھ ایک صفت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے برتاؤ، کردار اور رویے سے اپنے طلبا کو ضرور متاثر کرتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد صاحب میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس لیے میں آج بھی ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرتا ہوں تو دل میں ایک منفرد سی طمانیت کو محسوس کرتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے معاملاتِ زندگی کو میں نے بہت قریب سے محسوس کیا ہے اور ہمیشہ ان کی شخصیت کو مثبت اور متوازن پایا ہے۔ "نہج البلاغہ" میں حضرت علیؑ کا قول ہے کہ "مومن اپنی عبادات سے نہیں معاملات سے پہچانا جاتا ہے" دیکھا جائے تو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اس مقدس قول کی عملی تصویر ہے۔

خاموش محنت کش

شوکت محمود شوکتؔ ☆

ہماری روزمرہ زندگی میں کئی ایسے لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے ،جن کی محنت ، لگن اور شوق کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ گوشہ نشینی کی حالت میں بھی ، اپنے مقصد سے مکمل طور پر مخلص رہتے ہیں۔وہ کسی ستائش اور صلے کی پروا کیے بغیر اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور اَن تھک محنت کے باوجود بھی ہشاش بشاش نظر آتے ہیں۔ تاریخ ایسے لوگوں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔

تاہم ، ضلع اٹک کی تحصیل جنڈ کے ایک قدیم قصبہ ''کھڈ شریف''(جسے ہمارے ہمدمِ دیرینہ ثقلین ضیغم، بغداد گردانتے ہیں)میں واقع لائبریری ''کتب خانہ محمد علی کھڈی'' میں ایک محنتی اور اپنے کام سے مخلص ،عمر رسیدہ کتاب دار'' عبدالرحمن'' چند سالوں سے نہ صرف وہاں مقیم ہیں بل کہ اس کتب خانے کی تزئین و آرائش کے لیے دن رات کوشاں رہتے ہیں۔ان سے قبل ، اس لائبریر ی کے لیے جنابِ نذر صابریؒ نے اپنی خدمات کچھ اس انداز سے سر انجام دی تھیں کہ لائبریر ی میں اس وقت موجودہ کتب کی فہرست سازی کی تھی۔تاہم ، عبدالرحمن نے بھی اپنے تئیں اس لائبریر ی کے لیے، اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ، لائبریر ی میں آمدہ نئی کتب اور پہلے سے موجود کتب کو بڑے سلیقے اور طریقے سے الماریوں کی زینت اس طرح بنایا کہ کتابوں کی اصناف کے حوالے سے ان کے گوشے بھی بنائے۔جس سے مطلوبہ کتاب ڈھونڈنے میں آسانی رہتی ہے۔

عبدالرحمن سے گاہے گاہے لائبریری ہی میں ملاقاتیں ہوئیں۔ان ملاقاتوں کے دوران میں انھوں نے دبے الفاظ میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ یہ دنیا چوں کہ فانی ہے اور میرے دَم کا کوئی بھروسا نہیں کہ کب قفسِ عنصری سے روح آزاد ہو، لہٰذا، کہیں پر میرا تذکرہ کر دیا جائے تو ممنون رہوں گا۔آپ کی اس خواہش کا احترام کر تے ہوئے،اب تک کی آخری ملاقات مورخہ ۲ /اکتوبر،۲۰۲۲ء میں انھیں یہ بتایا کہ آپ اپنے کوائف،بذریعۂ مکتوب ارسال کر دیں تو اس پر کچھ قلم فرسائی ہو سکے گی۔یہ ملاقات،اس لحاظ سے بھی اہم رہی کہ مذکورہ تاریخ کو حضرت مولانا فتح الدین کھڈی کا چالیسواں بھی تھا۔ نیز، بھارہ کہو،اسلام آباد سے پروفیسر ثقلین ضیغم اور ایبٹ آباد سے پروفیسر قمر زمان بھی تشریف لائے تھے۔ان دو احبابِ گرامی کے سامنے بھی عبدالرحمن نے اپنی دیرینہ خواہش کا اظہار ایک بار پھر کیا۔

☆ پرنسپل گورنمنٹ انٹر کالج، چھب (جنڈ۔اٹک)

اس کے چند دنوں بعد ، مؤرخہ ۱۱/اکتوبر، ۲۰۲۲ء کو عبدالرحمن نے راقم الحروف کے نام ایک مکتوب میں اپنی مختصر سوانح کے بارے کچھ یوں تحریر کیا، جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

عبدالرحمن ،موضع کوٹے والی، تحصیل پنڈی گھیب(موجودہ جنڈ)، ضلع اٹک میں "گل چمن" کے گھر ۱۹۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ابتداً اپنے گاؤں کوٹے والی کے پرائمری سکول میں داخلہ لیا ،پہلی جماعت پاس کرنے کے بعد بوجہ غربت اپنے والد محترم گل چمن کے ساتھ ضلع مظفر گڑھ کے ایک مشہور قصبے "کروڑ لعل عیسن"(جو کہ ایک مشہور و معروف بزرگ لعل عیسن کے نام سے موسوم ہے)ہجرت کر گئے۔جہاں آپ کے والدِ محترم نے بہ طورِ مزارع زمین کاشت کرنا شروع کی اور آپ (عبدالرحمن) کو موضع ٹبی خورد کے ایک مڈل سکول میں داخل کرا دیا۔وہاں سے مڈل کا امتحان (ملتان بورڈ) اچھے نمبروں سے پاس کرنے کے بعد، آپ نے ثانوی تعلیم کے لیے "کروڑ لعل عیسن" کے ہائی سکول میں داخلہ لیا۔میٹرک کرنے کے بعد آپ پاک آرمی میں بھرتی ہو گئے۔پاک آرمی سے اپنی مدتِ ملازمت مکمل کرنے کے بعد آپ سبکدوش ہوئے۔

پاک آرمی سے سبکدوشی کے بعد آپ نے جامشورو ،سندھ میں ایک ادویات بنانے والی فیکٹری میں عارضی طور پر ملازمت اختیار کی مگر، یہ فیکٹری بند ہونے کے بعد آپ اپنے آبائی گاؤں "کوٹے والی" تشریف لائے اور یہاں آتے ہی آپ ضلع بھکر منتقل ہو گئے۔ ضلع بھکر میں ، کاشت کاری اور زمینوں کی دیکھ بھال کرتے رہے تاہم ۲۰۱۶ء میں واپس جنڈ آ گئے اور یہاں سکونت اختیار کر لی۔۲۰۱۷ء میں کچھ نامساعد حالات کے پیشِ نظر آپ کھڈ شریف ، مولانا فتح الدینؒ کے دربار پر حاضر ہوئے ۔انھوں نے آپ کو اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ کچھ عرصے تک آپ ڈاکٹر محمد ساجد نظامی کے نجی سکول/کالج میں خدمات سر انجام دیتے رہے۔ وہاں سے آپ کو ڈاکٹر محمد ساجد نظامی نے کتب خانہ مولانا محمد علی مکھڈی کی اہم ذمہ داریاں سونپ دیں۔تادمِ تحریر آپ اسی کتب خانے میں ذوق و شوق سے اپنی خدمات سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔آپ نے اپنی آخری ملاقات میں بھی ، جن تین خواہشات کا تذکرہ کیا تھا ان ہی خواہشات کا اپنے مکتوب میں بھی اظہار کیا ہے۔

آپ کی پہلی خواہش یہ ہے کہ" زندگی میں مدینہ شریف کی زیارت کر لیں "۔دوسری خواہش یہ ہے کہ " کتب خانہ مولانا محمد علی مکھڈی کے لیے جہاں تک ممکن ہو سکے ،کام کرتے رہیں "اور تیسری اور آخری خواہش یہ ہے کہ " آپ کو مولانا محمد علی مکھڈیؒ،مولانا فتح الدینؒ اور دیگر اولیائے کرام کے مزارات کے قدموں کی جانب مدفون کیا جائے "۔

آپ دھیمے لہجے میں گفتگو کرنے والے ایک باذوق اور خوش اخلاق شخصیت کے مالک ہیں۔جب بھی کوئی فردِ واحد یا وفد کتب خانہ مولانا محمد علی مکھڈی اپنی علمی و ادبی اور روحانی پیاس بجھانے کی خاطر تشریف لے جاتا ہے ، آپ نہ

صرف اس کی مقدور بھر خاطر تواضع کرتے ہیں۔ بل کہ "وزیٹر بک"(Visitor Book) پر اس کی تشریف آوری اور کتب خانے کے حوالے سے رائے بھی لازمی درج کرواتے ہیں۔ اللہ رب العزت آپ کے ذوق و شوق کو سلامت رکھے اور آپ کو مزید آسانیاں عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆

دریچۂ انتقاد

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

کتاب	:	زندگی گیت ہے
شاعر	:	مشتاق عاجز
ناشر	:	اردو جمالیات، اٹک (پاکستان)
اشاعت	:	۲۰۱۸ء
صفحات	:	۱۶۴
مبصر	:	یاسر اقبال

مشتاق عاجز کے گیتوں میں گیت کی شعریات

اُردو اصنافِ سخن میں غزل اور گیت وہ اصناف ہیں جن میں داخلیت اور غنائیت کا عنصر بدرجہ اَتم موجود ہوتا ہے۔ اگر ہم دیگر اصنافِ سخن کے برعکس گیت کو لیں تو یہ وہ صنفِ سخن ہے جس میں نہ صرف شخصی جذبات واحساسات کا بے باک اظہار ملتا ہے بلکہ غنائیت، ترنم، شرینی، زبان کی گھلاوٹ ورچاؤ اور فطری بہاؤ جیسی خصوصیات دیگر اصناف کی نسبت گیت میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ ان خصوصیات کی بنا پر ہی گیت کو غنائی شاعری کہا گیا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب عرشی اپنے مضمون "اردو شاعری میں گیت: تاریخی جائزہ" میں گیت کی انفرادیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"گیت اپنے منفرد تہذیبی ورثے کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتا ہے جس میں محبت اور نغمے کی آمیزش سے پیدا ہونے والی نہایت لطیف ودِل کش روایت شامل ہے۔ چونکہ گیت کا موسیقی سے گہرا ربط ہے، ترنم اور لَے اور جھنکار اور تھاپ وغیرہ اس کے گائے

جانے میں استعمال ہوتے رہے ہیں۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گیت پڑھنے سے زیادہ سننے کی چیز ہے۔ جو موسیقی کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔" (۱)

ادب کی کوئی بھی صنف ہو چاہے اس کا تعلق نثر سے ہو یا نظم سے، موسیقی سے ہو یا مصوری سے اس کی اپنی شعریات ہوتی ہیں لہٰذا کسی بھی فن پارے کو سمجھنے یا پرکھنے کے لیے صحیح معیار اس کی شعریات کی روشنی سے متعین ہوتا ہے۔ یہ شعریات فن پارے کی تخلیق، معنی آفرینی اور اثر آفرینی میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے بقول:

"یہ شعریات ہی ہے جو کسی نظم، غزل، افسانے، اور ناوِل کو اس کی ادبی اور صنفی شناخت دیتی ہے۔ لہٰذا شعریات ان بنیادی اصولوں، رسمیات قوانین، ضابطوں کا مجموعہ ہے جو ہر ادب پارے کی تہ میں مضمر ہوتا ہے اور پوری طرح فعال ہو کر اس ادب پارے کو ممکن بنا رہا ہوتا ہے"(۲)

مشتاق عاجز کی گیت نگاری پر بات کرنے سے پہلے میں گیت کے پس منظر میں وہ تمام عناصر جو اس کی تخلیق کا سبب بنتے رہے ان کو پیش نظر رکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ گیت اپنے مزاج اور لب و لہجے کے اعتبار سے بہت مختلف صنف ہے۔ اردو گیت نگاری کی روایت جس کے ابتدائی نقوش قدیم ہندوستانی تہذیب سے جڑے ہوئے ہیں۔ لہٰذا جب بھی ہم اردو گیت نگاری کی روایت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہندوستانی تہذیب کے جملہ عناصر ہمارے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں۔ ہندوستانی تہذیب اور گیت ایک دوسرے کے اندر شیر و شکر ہیں ۔ اردو گیتوں کو ہندوستانی تہذیب سے الگ نہیں کیا جاسکتا، بلکہ یہ گیت نگار کے لیے بھی لازم ہے کہ اسے ہندوستانی تہذیب و معاشرت کا بھرپور ادراک ہو۔ ہندی تہذیب و معاشرت کی تشکیل میں ہندوستانی موسیقی کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ بلکہ ہندو مذہب کی بنیاد بھی سنگیت پر ہے۔ اگر ہم قدیم ویدوں کا مطالعہ کریں تو یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ گیت کی روایت سام وید کے گانوں یا بھجنوں سے جا کر ملتی ہے۔ اگر ہم گیتوں کی وجہ تخلیق کو ان مقدس ویدوں میں تلاش کریں تو یہ بات بھی مسلم ہے کہ یگیہ کے موقع پر مغنی پروہت مناسب آہنگ کے ساتھ دیوتا کی مناجات کے بھجن یا مذہبی گیت گاتا تھا، ان گیتوں میں متعلقہ راگوں کا بصری تصور موجود ہوتا تھا۔ پروفیسر وہاب اشرفی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"ویدک عالموں کا خیال ہے کہ راگ اور گیت کا باہمی تعلق بہت گہرا ہے۔ راگ گیت سے ہی نکلتا ہے۔ ان کے نزدیک گیت ایک گربھ کی مانند ہے جس سے راگ جنم لیتا ہے۔ اگرچہ ایک ہی گیت کو مختلف راگوں میں گایا جاسکتا ہے اور ایک ہی راگ استعمال مختلف گیتوں کے لیے ہو سکتا ہے، پھر بھی کچھ گیت ایسے ہیں جن سے مخصوص قسم کا راگ ابھرتا ہے۔" (۳)

مذکورہ بیان سے ایک تو یہ وضاحت ہو جاتی ہے کہ ابتدا میں گیتوں کو مذہبی رنگ دیا جاتا تھا اور دوسری بات یہ کہ ہندو مذہب میں پنڈت یا عالم بننے کے لیے راگ کی تعلیم و تربیت کو کیوں ضروری قرار دیا گیا۔ اس کی ایک تو بنیادی وجہ یہ ہے کہ مقدس

ویدوں میں سام وید ایک ایسا وید ہے جس میں بھجن، مناجات اور مذہبی گیت راگ راگنیوں سے مشروط ہیں۔ راگ کے علم کے بغیر ایک پنڈت کا ان مناجات یا مذہبی گیتوں کو پڑھنا یا گا کر ان کے مطالب کو واضح کرنا ناممکن ہوتا تھا۔ دوسری اہم وجہ ہندو مذہب کے مطابق سنگیت کا علم دیوی دیوتوں کی عنایت ہے اس لیے ہندوؤں نے نہ صرف سنگیت کی مذہبی حیثیت کو تسلیم کیا بلکہ ہندی تہذیب و ثقافت کی ترویج و ترقی کو فروغ دینے میں سنگیت اور اس کے علم کو برتنا ضروری قرار دیا۔ اگر ہم گیت نگاری کی ارتقائی صورتحال کو دیکھیں تو شروع شروع میں گیت مندر میں مقید تھے۔ گیتوں پر مذہب کی اجارہ داری تھی۔ بعد میں مسلمان سنگیت کاروں نے گیت کو مندر سے آزاد کرا کر اسے مقامی معاشرت کے اظہار کا ذریعہ بنایا تو عوامی جذبات و احساسات کو گیت کے ذریعے اظہار کا موقع ملا۔ شاعری و موسیقی کا یہ پہلا درجہ تھا جب یہ دونوں اصناف جمودی دور سے نکل کر ایک متحرک دور میں داخل ہوئیں۔ جہاں شاعری اور موسیقی دونوں کو عوامی جذبات و احساسات کے اظہار میں آزادی نصیب ہوئی۔ گیت کی تاریخ ہزاروں برس پر محیط ہے۔ شاعری کی تخلیق میں موسیقی کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ ہر خطے کی شاعری کا عروضی نظام اس خطے کی موسیقی کے مطابق ہوتا ہے۔ شاعری جب عرب سے نکل کر فارس میں داخل ہوئی تو اہلِ فارس نے بحروں میں ترمیم کر کے انھیں فارسی آہنگ کے مطابق ڈھالا، یہیں عروضی نظام جب ہندوستان پہنچا تو ہندی موسیقی کے آہنگ میں ڈھل گیا۔ آج ہم اگر اردو شاعری کے عروض کا جائزہ لیں تو ہر بحر میں ہندی موسیقی کا آہنگ نظر آتا ہے۔

شاعری کی تخلیق میں موسیقی کا عمل دخل تو ہے ہی گیت کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کے تخلیقی عمل میں موسیقی کے جملہ عناصر کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ لفظوں کی بندش میں آہنگ و تال کا تاثر پوری طرح پیش کیا جاتا ہے۔ ایلیٹ نے شاید اس لیے کہا تھا کہ ایک شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ رموزِ موسیقی سے مکمل طور پر آشنا ہو، عملی طور پر آگاہی ہونا اور چیز ہے لیکن اس کے شعور میں آہنگ کا واضح تصور موجود ہو۔ شاعری کی تاثیر اور اس کی جمالیات میں موسیقی کا ہمیشہ کلیدی کردار رہا ہے۔ اصنافِ سخن میں گیت ہی وہ صنف ہے جو ایک طرف تو ہندی تہذیب و ثقافت سے جڑی ہوئی ہے تو دوسری طرف ہندی سنگیت سے معمور ہے۔ گیت خالص طور پر ہندی صنفِ سخن ہے۔ مقامیت کے ساتھ اس کا گہرا رشتہ ہے۔ اصنافِ سخن میں اگر کوئی صنف ہندوستان کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے تو وہ صرف گیت ہے۔ اگرچہ دوہا اور ماہیا بھی مقامی اصنافِ سخن ہیں لیکن گیت وہ صنف ہے جس میں ہندی تہذیب و معاشرت کا مکمل اظہار ملتا ہے۔ گیتوں کو ہمیشہ غیر متمدن معاشرے کی پیداوار کہا گیا۔ غیر متمدن معاشرے کی اصل خوبی اس کے سادہ چال چلن اور رکھ رکھاؤ میں ہوتی ہے۔ پُر تکلفی اور نام نہاد بناوٹ و تصنع سے پاک ان سادہ معاشروں میں زندگی کا ایک صحت مند تصور موجود ہوتا ہے، جہاں رشتوں میں اخلاص اور بھائی چارے بغیر کسی لالچ کے پروان چڑھتے ہیں۔

جہاں تک گیتوں کے موضوعات کا تعلق ہے تو ہندی تہذیب و ثقافت کا دامن لوگ گیتوں سے بھرا پڑا ہے۔ معاشرت کے رسم و رواج، خوشی و غم کے تمام پہلو، میلے ٹھیلوں کی رونقیں، موسموں کے رنگ، مقامی روز مرہ کی چیزیں، مقامی تہوار، الغرض ہر عمر کے لوگوں کے جذبات کی گیتوں میں فراوانی نظر آتی ہے۔ موضوعات کے حوالے سے زیتون بانو کہتی ہیں:

"لوگ گیت گھر کے آنگن سے لے کر کھیت کھلیان تک بکھرے ہوتے ہیں۔ ان کا یہ سلسلہ بچوں، بالوں اور دوشیزاؤں تک ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ بوڑھوں اور جوانوں کے جذبات کی عکاسی بھی کرتے ہیں، ماں بچے کو سُلاتے وقت لوری دیتی ہے تو اس کے لبوں پر گیت کے بول مچل اٹھتے ہیں۔ پنگھٹ پر دوشیزائیں پانی بھرنے جاتی ہیں تو ان کے پازیبوں کی چھنک ان کے خوابیدہ احساسات کو جگاتی ہے اور آپ ہی آپ ان کے ہونٹوں پر گیتوں کے بول لہرانے لگتے ہیں، کوئی نوجوان تاروں بھرے آسمان کے نیچے جب کسی کی خیالی تصویر دھیان میں لاتا ہے تو اس کے دلی جذبات لفظوں کا روپ دھار کر گیت بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ان گیتوں میں کسی علاقے کی تہذیب و ثقافت کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں اور وہاں کے رہنے والوں کے خدوخال کا عکس بھی" (۴)

گیت جیسی صنف کو فروغ دینے میں دکن کے صوفی شعرا نے بنیادی کردار ادا کیا۔ جن میں شیخ بہاء الدین باجن، قاضی محمود دریائی، برہان الدین جانم، علی عادل شاہ ثانی اور ہاشمی بیجاپوری کے نام قابل ذکر ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ اور ابراہیم عادل شاہ کے گیت مقامی رنگ میں رَچے بسے ہوئے ہیں۔ صوفی شعرا میں امیر خسروؒ جو نہ صرف ہندوستانی سنگیت کے رمز شناس تھے بلکہ عملی سطح پر بھی کئی ہندوستانی راگوں کے موجد تھے۔ گیت کو باقاعدہ ایک صنف کی حیثیت سے متعارف کرانے میں امیر خسروؒ اساسی حیثیت کے حامل ہیں۔ امیر خسروؒ کے گیتوں میں ہندی معاشرت کے جملہ خدوخال کی جھلک نظر آتی ہے۔ شمالی ہند میں گیتوں کی اہمیت کا اندازہ اندر سبھا کے گیتوں سے ہوتا ہے۔ امانت لکھنوی کے ہاں گیتوں میں لوک گیت کی روایت اور نسائی لب و لہجے کے ساتھ موسیقیت کا بھرپور تاثر ملتا ہے۔

واجد علی شاہ نے رقص و موسیقی میں دلچسپی کی بنیاد پر نہ صرف خود گیت لکھے بلکہ عملی خدمات بھی پیش کرتے رہے۔ بیسویں صدی تک آتے آتے گیت نے اردو شاعری میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کر لیا۔ اردو گیت کو بام عروج بخشنے میں میراجی کے گیتوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ حالاں کہ میراجی سے پہلے بھی اردو شعرا گیت میں طبع آزمائی کر رہے تھے جن میں حسرت موہانی، آرزو لکھنوی، سوامی مارہروی، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی شامل تھے۔ میراجی کے معاصر شعرا میں مطلبی فرید آبادی، عرش ملسیانی، مقبول احمد پوری، اندر جیت شرما، قیوم نظر، الطاف مشہدی، خاطر غزنوی، قتیل شفائی، عبدالحمید بھٹی، جمیل الدین عالی اور مسعود حسن خاں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعرا سے قطع نظر میراجی کو گیت سے ایک فطری نسبت تھی جس وجہ سے ان کے مزاج کو گیت نگاری خوب راس آئی۔

گیت دراصل ہندی صنفِ سخن ہے۔ اس لیے اردو گیتوں کو ہندی بحروں کے مطابق لکھا گیا لیکن بعد میں گیت کو نظم کے پیرائے میں لکھنے کی روش بھی چل پڑی۔ مگر گیت کی اصل خوبصورتی اور اثر آفرینی ہندی لب ولہجے میں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ گیت کا وہ کلاسیکی انداز جو ہندی آہنگ میں ہو وہ موجودہ اردو فلمی گیتوں سے زیادہ اثر انگیز ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں اگر ہم گیت نگاری کو اس کے کلاسیکی رنگ میں دیکھتے ہیں تو وہ رنگ ہمیں "مشتاق عاجز" کے ہاں نظر آتا ہے۔

مشتاق عاجز کے گیتوں کا مطالعہ کرنے سے قاری کا ذہن امیر خسروؒ کے گیتوں کی طرف چلا جاتا ہے۔ خسرو نے گیت نگاری کے لیے جو معیار اور روپ سروپ متعین کیا موجودہ دور میں اگر ہم خسروی روپ کو دیکھیں تو وہ ہمیں مشتاق عاجز کے گیتوں میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ گیت نگاری کے حوالے سے ان کی کتاب "زندگی گیت ہے" ملاحظہ کریں تو ان گیتوں میں آپ کو واضح طور پر خسروی آہنگ کی بازگشت سنائی دے گی۔ اس مجموعہ کلام سے پہلے بھی مشتاق عاجز کے جو مجموعہ ہائے کلام شائع ہوئے ان کے عنوانات اصطلاحاتِ موسیقی پر ہیں۔ جن میں الاپ اور سمپورن قابلِ ذکر ہیں۔ اس سے ایک تو یہ بات بھی باور ہو جاتی ہے کہ مشتاق عاجز سنگیت کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ "زندگی گیت ہے" میں انھوں نے جگہ جگہ اصطلاحاتِ موسیقی کو بطورِ تشبیہات و استعارات کے استعمال کیا ہے۔ بعض گیت تو راگ راگنیوں کے بصری تصور کا حسین مرقع ہیں۔ ذیل میں ان کے گیتوں کے مجموعہ کلام "زندگی گیت ہے" کا تعارف و تبصرہ گیت کی شعریات کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے۔

"زندگی گیت ہے" مشتاق عاجز کا مجموعہ کلام جس کا انتساب سُر اور لے کے نام ہے، اس میں کل ۹۷ گیت ہیں۔ ان گیتوں میں ہندی لب ولہجہ غالب نظر آتا ہے۔ ہندی الفاظ و تراکیب کے ساتھ ساتھ مشرقی معاشرت کے حسین مرقعے موجود ہیں۔ مشتاق عاجز اپنے ان گیتوں میں مشرق کی ان معاشرتی اور تہذیبی اقدار کی تلاش میں ہیں جو مغربی کلچر کے اثرات میں کہیں گم ہو چکی ہیں۔ رشتوں میں وہ اخلاص، معاشرتی بھائی چارہ، وہ انسان دوستی جو مشرقی معاشرت کے اصول ہوا کرتے تھے جہاں معاشرے میں رہنے والے بلا تفریق ایک آنگن کے افراد معلوم ہوتے تھے۔ جہاں دُکھ سُکھ، خوشی و غم سانجھے ہوتے تھے اب اس کی جگہ ایک ایسے معاشرے نے لے لی ہے جہاں ذاتی اغراض و مقاصد کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اب عظمتِ رفتہ کی اقدار کی جگہ، تعصب، لالچ و ہوس، دھوکہ بازی اور ذاتی مفاد نے لے لی ہے۔

مشتاق عاجز کے گیت ملے جلے عوامی جذبات کا پرتو ہیں جن میں ایک طرف عشق و محبت کی حرارت محسوس ہوتی ہے تو دوسری طرف انسانی جذبات کی وارفتگی موجزن ہے۔ گیتوں میں موضوعات کی ہریالی و زرخیزی بدرجہ اتم موجود ہے اور زندگی کا تصور بھرپور انداز سے متحرک نظر آتا ہے۔ گیتوں کا سفر گھر آنگن سے شروع ہوتا ہوا، کھیت کھلیانوں سے ہوتا، پنگھٹ پر دوشیزاؤں کی پازیبوں کی جھنکار سے اُن کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کرتا چلا جاتا ہے۔ مشتاق عاجز کے گیتوں کے بارے میں محمد یعقوب آسی نے بجا فرمایا ہے:

"مجھے یہاں سمپورن کی بوباس اور چاشنی تازہ محسوس ہو رہی ہے ــــــــــــــــــ"

گیتوں میں دھرتی کے رومان میں دھڑکتی ہوئی دھڑکن اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعر اپنے رومانوی اور محسوساتی تجربات کو قاری سے شیئر کرنا چاہتا ہے:

تُو ہے میرے شبد کی شوبھا
گیت میں تیری باس
تو بن سُر ہے سُونا سُونا
تو بن راگ اداس
تُو ہے مان مری رچنا کا
تُو میرا وشواس
تُو آشا، تُو آس

(زندگی گیت ہے۔ ص ۲۲)

گیتوں میں باہمی پیار و محبت، امن، بھائی چارہ اور انسان دوستی کا پیغام دیتے ہوئے کہتے ہیں:

اے اندھیرو سنو، اے اُجالو سنو!
دنیا والو سنو، گورو، کالو سنو!
مسجدو، مندرو، دھرم شالو سنو!
پریم کا دیوتا سب کا من میت ہے
زندگی پریم ہے، زندگی پریت ہے
زندگی گیت ہے
زندگی آتما کا مدُھر گیت ہے
زندگی پریم ہے ـــــــ

(زندگی گیت ہے۔ ص ۲۴)

برصغیر میں ماں ہمیشہ ایک شفیق دیوی کی مانند رہی ہے۔ جس کے سینے کی حرارت بچے کے لیے سکون و محبت کا باعث بنتی ہے۔ گود میں بچے کو لے کر لوری گا کر سُلانے سے ایک ہندوستانی ماں کا تصور اُجاگر ہوتا ہے۔ مشتاق عاجز کے ہاں بھی ایسی لوریاں موجود ہیں جن میں ممتا کی جھلک نظر آتی ہے۔ ایسی ہی ایک لوری ملاحظہ کریں:

سو جا رے میا کے جیون سہارے
سو جا رے سو جا میری آنکھوں کے تارے
سو جا رے، سو جا رے سو جا رے، سو جا
نندیا سجائے توری اکھیوں میں سپنے
بھولے بھالے نینوں پہ خواب واروں اپنے
نینوں پہ خواب واروں اپنے رے سو جا
سو جا رے، سو جا رے ــــــــ

(زندگی گیت ہے۔ ص ۲۵)

بچپن کے معصوم کھیل ؛ جن میں ہم جولیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور چھپن چھپائی، گلی ڈنڈا، ککلی کلیر دی، پگ میرے ویر دی، پٹھو گرم، برسات کے موسم میں کاغذ کی ناؤ بہانا، وہ مخصوص ناموں (تاجی، بالا، بملا، کملا، پارو، ستارہ، پپو، گڈو وغیرہ) سے آوازہ کسنا جیسی معصوم سرگرمیوں سے مشتاق عاجز کے گیت آراستہ ہیں۔ بچپن کے کھیل کے عنوان سے ایک ہم جولیوں کا مکالمہ ملاحظہ کریں:

رانی: اے ری تاجی! گڈو، تارا، بملا، کملا آ و ری
راجا: اورے بالے! پپو، تابی، شنکر، موہن، آ و رے
رانی اور راجا مل کر:

برس گئے بادروا کارے تھم گئی برکھا آؤ
بہہ نکلا گلیوں میں پانی آؤ بہائیں ناؤ

سب مل کر:

گلیوں میں بہتا ہے بارش کا پانی
ٹھنڈی ہوائیں ہیں رُت ہے سہانی

رانی: کاغذ کی ناؤ بناؤ نا راجا
پانی میں ناؤ بہاؤ نا راجا

(زندگی گیت ہے، ص۲۶)

یہی انداز لڑکپن کے گیتوں میں بھی نظر آتا ہے۔ لڑکپن کے گیت جن میں جوانی کی اُمنگیں اور جذبات و احساسات کی فراوانی ہے۔ دو رومانوی کردار راجا اور رانی کے مکالموں کے ذریعے ایک طرف جوانی کے خوابیدہ احساسات کو بیدار کیا گیا ہے تو دوسری طرف ان مکالموں کے پس پردہ زندگی کے حقیقی تصور کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ ذیل میں گیت کا ایک مکالمہ دیکھیں جس میں ندی کے کنارے ریت کے گھروندے بنانے میں ایک رومانوی تصور بھی ہے اور دوسری طرف ریت کا گھر زندگی کی ناپائیداری کی علامت بھی ہے۔ ملاحظہ کریں:

رانی: آؤ بنائیں ریت گھروندے
ندی کنارے جائیں
آؤ نا راجا گھر گھر کھیلیں بستی نئی بسائیں
ندی کنارے جائیں

راجا: ریت گھروندوں کی بستی میں کون بسے گا رانی
ایک جگہ کب رہ سکتے ہیں ریت کے گھر اور پانی

(زندگی گیت ہے، ص۳۰)

ایک اور جگہ ایک ایسی ہندوستانی لڑکی کی تصویر پیش کی ہے جو ہندوستانی شرم و حیا کے پردے میں لپٹی ہوئی ہے لیکن ساتھ ساتھ محبوب و عاشق سے اظہار بھی چاہتی ہے۔ مشتاق عاجز کے ہاں ایسے گیتوں کی مثالیں بہ کثرت ہیں جن میں لکھنوی معاشرت کا روپ سروپ نظر آتا ہے۔ جہاں عورت اپنے جذبات کا اظہار مختلف بولوں کی تاویلوں کے ذریعے کرتی ہے۔ ایسے گیتوں میں ٹھمری (موسیقی کی صنف) کی تمام خوبیاں موجود ہوتی ہیں۔ مشتاق عاجز کے گیت سے ایک مثال ملاحظہ کریں جس میں معاملہ بندی اور چھیڑ چھاڑ کا ایک رومان پرور منظر ہے:

بالی عمریا موری بالی عمریا چھیڑو نہ موہے سنوریا
لچکے کمریا موری چھلکے گگریا چھیڑو نہ موہے سنوریا

(زندگی گیت ہے، ص)۴۰

ٹھمری انگ کا ایک اور گیت ملاحظہ کریں جس میں رقص و تال کا بھرپور التزام رکھا گیا ہے:

چھنن چھنن چھن پائل باجے، کھن کھن کنگنا بولے
ہائے کھن کھن کنگنا بولے
پون چلے تن ڈگمگ ڈولے، من کھائے ہچکولے
کھن کھن کنگنا بولے
ترک ترک من مورا ناچے باجے دور مرکیا
چین چرائے نیند اُڑائے چھیل چھبیلا چھلیا
بنتی کرتی رہ جاؤں میں من مُرلی سنگ ہولے
کھن کھن کنگنا بولے

(زندگی گیت ہے، ص ۴۱)

مشتاق عاجز کے گیتوں میں ایک خوبی یہ ہے کہ تغزل سے معمور ہیں۔ غنائیت، ترنم، لب و لہجے کی مٹھاس کا ایک خوشگوار تاثر پایا جاتا ہے۔ یہ تاثر ان کے ہاں ان گیتوں میں زیادہ نظر آتا ہے جو ٹھمری انگ سے آراستہ ہیں۔

مشتاق عاجز نے اپنے گیتوں میں جس مکالماتی اسلوب کی بنیاد ڈالی ہے اردو گیتوں میں یہ ایک نیا تجربہ ہے گو کہ یہ مکالماتی انداز مقامی زبانوں میں جو گیت وٹے ہیں ان میں پہلے سے موجود ہے لیکن عاجز نے اردو گیتوں میں ایک مسلسل مکالمے کی فضا پیدا کر کے ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ گیتوں میں میلے ٹھیلوں اور تہواروں کے خوبصورت روایتی مرقعے پیش کیے ہیں:

میا! چنری دلا دے ری دھانی
کہ میلہ لگا گاؤں میں
گوری لاگے ری گاؤں کی رانی
وہ چھب ہو اداؤں میں
میا چنری دلا دے ری دھانی

(زندگی گیت ہے، ص ۶۳)

جیسا کے شروع میں کہا گیا ہے کہ گیت اور راگ کا تعلق بہت قدیمی ہے۔ راگ کی کیفیت و تاثر کو گیت کے بولوں سے واضح کرنے کا رُجحان ہی گیت کی تخلیق کا سبب بنا۔ لہٰذا گیت اور راگ کا ایک دوسرے سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مشتاق عاجز نے گیتوں میں جگہ جگہ جس طرح اصطلاحاتِ سنگیت کو برتا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مشتاق عاجز ایک طرف گیت کی شعریات کا

بھرپور ادراک رکھتے ہیں تو دوسری طرف سُر لفظ اور تال کے سنگم سے موسیقی پیدا کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ راگ میگھ ملیار کی کچھ تصویریں ملاحظہ کریں:

ساون چھیڑے میگھ ملار　　　　من میں لاگے تیز کٹار

منوا مانگے پی کا پیار

بن میں ناچن لاگا مور　　　　بگیا میں کویل کا شور

امرت رس کی پڑی پھوہار

منوا مانگے پی کا پیار

(زندگی گیت ہے، ص ۶۵)

ٹولی کا گیت یا کورس کا گیت یہ گیت گروپ کی شکل میں ہم آہنگ آواز کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی موسیقی میں خصوصاً لکھنو میں جو ڈرامے یا سبھائیں پیش کی جاتی تھیں ان میں دورانِ ڈرامہ یا سبھا اس طرح کے گیت پیش کرنے کا عام رواج تھا۔ اندر سبھا کے جتنے بھی گیت ہیں سب کورس کی شکل میں ہیں۔ مشتاق عاجز نے گائیکی کے اس اسلوب کو پیش نظر رکھتے ہوئے کورس کے گیتوں کو بھی مذکورہ مجموعے میں شامل کیا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

کورس (سکھیاں):

او رے سجن متوارے

نین کجرارے

پکاریں تو آ جا سجنیا کے دوارے

آ رے

آ جا سجنیا کے دوارے

(زندگی گیت ہے، ص ۷۴)

دنیا کی بے ثباتی، موت جیسی اٹل حقیقت اور عروج و زوال کے تصورات کو روز مرہ کی مثالوں کے ساتھ گیتوں میں پیش کیا ہے۔ اس طرح کا موضوع ہمیں نظیر اکبر الہ آبادی کے ہاں "بنجارہ نامہ" میں ملتا ہے۔ مشتاق عاجز نے بھی انسان کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتے ہوئے اسے دُنیاوی مال و متاع، تکبر و رعونت کے چکروں سے نجات دلا کر زندگی کے اصل مقاصد کی طرف اشارہ کیا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ کریں:

دُنیامایاجال رے بھیادُنیامایاجال

آج بنا پھرتا ہے راجا کل ہو گا کنگال

رے بھیا، دُنیامایاجال

کپڑا لتا، زیور گہنا سب ماتی سب مایا

سونا روپا، روپ جوانی، کس بل ڈھلتی چھایا

پل دو پل ہیں چاند سے چہرے ریشم جیسے بال

رے بھیا، دُنیامایاجال

(زندگی گیت ہے، ص۱۳۸)

صوفیانہ روح سے مملو اِن گیتوں میں جن میں مقصدِ حیات کے ساتھ ساتھ مخلوقِ خدا سے بلا تفریق محبت کا تصور اور زندگی کو مثبت رویوں کے ساتھ گزارنے کا پیغام دیا گیا ہے۔ ایسے سنجیدہ پند و نصائح پر مبنی گیتوں کے علاوہ پہلیاں، رُخصتی کے گیت جو شادی بیاہ کے موقعوں پر گائے جاتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر خاص کر جب بیٹی یا بہن کی ماں باپ کے گھر سے رُخصتی ہو رہی ہوتی ہے تو گھر والوں کے علاوہ خود دلہن جس طرح کے کرب و کیفیت سے دوچار ہوتی ہے مشتاق عاجز نے شادی بیاہ کے گیتوں میں ایسے موقعوں کے خوب مرقعے پیش کیے ہیں:

لینے آئے چار کہار

چل ری سجنی ساجن دوار

پگلی! جھوٹی پریت جگت کی

تو بن بیٹھی میت جگت کی

یگ یگ سے ہے ریت جگت کی

چھوڑ کے جانا یہ سنسار

چل ری سجنی ساجن دوار

(زندگی گیت ہے، ص۱۵۲)

انسان جب سے اس کرۂ ارض پہ تشریف لایا، جبر و قدر کا مسئلہ اس کے لیے ایک چیلنج بنا ہوا ہے۔ انسان ہمیشہ سے تقدیر کے ہاتھوں کھلونا بنتا آ رہا ہے۔ تقدیر کو مسخر کرنے کا خواب انسان کا بہت پرانا ہے۔ اس خواب کو پورا کرنے کے لیے مذاہب نے انسان کے سامنے کچھ گوشوں کو منور کر رکھا ہے لیکن ابھی یہ معمہ پوری طرح حل نہیں ہو سکا۔ بعض فلسفیوں کا کہنا ہے کہ انسان اختیار رکھتا

ہے۔ بعض انسان کو بے بس، بے اختیار، مجبور مانتے ہیں۔ ہر دور میں شعرا نے فلسفہ جبر و قدر کو موضوعِ سخن بنایا۔ مشتاق عاجز بھی اپنے گیتوں میں فلسفہ جبر و قدر کی تاویلات کرتے نظر آتے ہیں۔:

تقدیر کے ہاتھوں میں ہے انسان کھلونا
انسان کی تقدیر میں ہنسنا کبھی رونا
تقدیر کے ہاتھوں میں ہے انسان کھلونا
ہیں آنکھ میں آنسو کبھی ہونٹوں پہ ہنسی بھی
ملتے ہیں مقدر ہی سے غم اور خوشی بھی
جیون کبھی پھولوں کبھی کانٹوں کا بچھونا
انسان کی تقدیر میں ہنسنا کبھی رونا

(زندگی گیت ہے، ص۔ ۱۴۲)

الغرض مشتاق عاجز نے اپنے گیتوں میں زندگی کے ہر پہلو ہر گوشے کو روشن رکھنے کی کوشش کی ہے۔ زندگی کی وہ اقدار جو زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ گرد آلود ہو کر آنکھوں سے اوجھل ہو چکی ہیں۔ مشتاق عاجز نے اپنے گیتوں میں اُن اقدار کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ جملہ محاسن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے جو مشتاق عاجز کے گیتوں پر رائے دی ہے اس کی اپنی اہمیت ہے۔ بقول ڈاکٹر ستیہ پال آنند:

"میرے لیے مشتاق عاجز کے گیتوں کو پڑھنا ایک اچنبھا تھا، میں نے بہت سے شاعر دوستوں کے گیت پڑھے ہیں لیکن وہ تاثر کبھی نہیں ملا جو اس شاعر کے گیتوں نے میرے ذہن پر مرتسم کیا۔ ان گیتوں کو پڑھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہوا کہ گیتوں کے بولوں میں ہی کہیں ساز بج رہے ہیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی پڑھتے ہوئے میں گنگنانے لگا۔ تحت اللفظ سے ترنم تک جانے میں مجھے کوئی الجھن نہیں ہوئی۔"(۵)

حوالہ جات

۱۔ اردو ریسرچ جنرل Refereed journal for Urdu online/اشاعت: یکم جولائی ۲۰۱۹

۲۔ناصر عباس نیر،ڈاکٹر:ساختیات کی اہم اصطلاحات،مشمولہ ادبی تھیوری ایک مطالعہ ،مرتبہ قاسم یعقوب،سٹی بک پوئنٹ، کراچی،۲۰۱۷ص۔۱۷۳

۳۔وہاب اشرفی،ڈاکٹر:تاریخ ادبیات عالم جلد دوم،ص۔۲۱۲،یورپ اکادمی،اسلام آباد،۲۰۰۶،ص۔۲۱۲

۴۔زیتون بانو:ڈیرا اسمٰعیل خان کے لوگ گیت، مشمولہ سنگ میل، پشاور،شمارہ نمبر ا،اگست ۱۹۷۳،ص۔۵۱

۵۔مشتاق عاجز:زندگی گیت ہے،ادارہ جمالیات،اٹک،۲۰۱۸،ص۔۱۱

گوشۂ

حضرت مولانا فتح الدین چشتی نظامی رحمۃ اللہ علیہ

کوائف نامہ

اسم گرامی	:	مولانا محمد فتح الدین چشتی نظامی
ولادت باسعادت	:	۱۹۴۲ء
مقام پیدائش	:	مکھڈ شریف
والدِ مکرم	:	حضرت مولانا محمد فضل الدین چشتی نظامی
جد امجد	:	حضرت مولانا محمد احمد الدین چشتی نظامی
نانا	:	حضرت مولانا محمد الدین چشتی نظامی
اساتذہ کرام	:	حضرت مولانا محمد فضل الدین چشتی، حضرت مولانا محمد الدین چشتی، حضرت مولانا محمد احمد الدین چشتی
تعلیم	:	ایم۔اے (عربی) / فاضل علوم اسلامی
کہاں سے تعلیم حاصل کی	:	مکھڈ شریف، چکڑالہ، داؤد خیل، ڈیرہ اسماعیل خان، ملتان
مرشد کریم	:	حضرت مولانا محمد احمد الدین چشتی
برادران مکرم	:	آپ والدین کی اکلوتی نرینہ اولاد تھے
والد مکرم کا وصال	:	۲، شعبان بروز منگل ۱۴۲۹ھ / ۸، اگست ۲۰۰۸ء
والدہ محترمہ کا وصال	:	۱۷ ربیع الاول ۱۹۸۷ء
مہار شریف قیام	:	۱۰ سال (۱۹۶۳ء تا ۱۹۷۲ء)

خلافت	:	والدِ مکرم حضرت مولانا محمد فضل الدین چشتی
شادی مبارک	:	ترگ شریف (عیسیٰ خیل میں اپنے چچا حضرت خواجہ غلام زین الدین چشتی نظامی کی صاحبزادی سے طے ہوا۔
رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے	:	۱۹۷۵ء
اولاد	:	تین بیٹے، دو بیٹیاں
اولیائے چشت کے آستانوں پر حاضری	:	تونسہ مقدسہ، مہار شریف، پاک پتن شریف
مدارس کا قیام	:	الھدیٰ مدرستہ البنات کھڈ انجرا، تراپ، کھڈ روڈ (کانی)
تنظیم سازی	:	الھدیٰ ویلفیئر سوسائیٹی کھڈ شریف (اٹک)
کھڈ شریف ڈسپنسری کا اجرا	:	۱۹۸۳ء
سالانہ فری آئی کیمپ کا اجرا	:	۱۹۸۳ء
وصال مبارک	:	۲۴، محرم الحرام بروز منگل ۱۴۴۴ھ / ۲۳، اگست ۲۰۲۲ء
مقام وصال	:	سی۔ ایم۔ ایچ راولپنڈی (آئی۔ سی۔ یو)
نمازِ جنازہ کی امامت	:	خانوادہ پیر پٹھان کے چشم و چراغ حضرت خواجہ غلام اللہ بخش خان تونسوی مد ظلہ العالی
مقام تدفین	:	کھڈ شریف

(خانقاہ حضرت مولانا محمد علی کھڑی کے داخلی دروازے کے غربی جانب۔ کھڈ شریف)

پیر فتح الدین چشتی نظامی: ایک روشن چراغ تھا نہ رہا

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد ☆

کھڈ شریف کے نام سے پہلی بار میرے کان کب آشنا ہوئے؟ یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے تاہم بچپن اور لڑکپن کی سرحد پر میں نے اس دیارِ گوہر بار کا نام کئی لوگوں سے سماعت کیا۔ اس زمانے میں گاؤں دیہات کی فضا میں آستانوں اور خانقاہوں کا احترام عام تھا اور پیروں فقیروں سے عقیدت وارادت کا چراغ ہر گھر اور ہر دِل میں روشن تھا۔ بے سروسامانی اور معاشی تنگ دستی کے باوجود گاؤں کے باسی سال میں ایک دو بار قریب ودور کے آستانوں اور درباروں پر حاضر ہوتے اور پیروں فقیروں کی زیارت سے سکون پاتے۔ خانقاہوں میں ہونے والی تقریبات اور سالانہ عرسوں میں شرکت کو ایک اہم مذہبی فریضے کا وقار حاصل تھا۔

میرا گاؤں پنڈی گھیب تحصیل میں پڑتا ہے، ایک زمانے تک کھڈ شریف اسی تحصیل کا حصہ رہا، اس لیے بسال شریف، ناڑا شریف، چورہ شریف، نتھیال شریف اور میرا شریف کی طرح کھڈ شریف کا ذکر بھی ہر گاؤں قریے میں ہوتا رہتا۔ اس زمانے میں کھڈ شریف کا نام کہیں میں نے سنا، اس دور میں کھڈ شریف کو دیکھنے یا وہاں جانے کا مجھے بھی موقع نہیں ملا۔ گاؤں سے نے ہم لوگ شہر آکر بس گئے اور پھر ایک طویل عرصے تک کھڈ شریف کا نام بھی ساعتوں سے نہیں ٹکرایا۔ میٹرک تک آتے آتے میں نے شعروادب کی محفلوں میں آنا جانا شروع کر دیا اور خوش نصیبی سے بہت جلد اٹک شہر کی سب سے ہمہ رنگ علمی وادبی شخصیت حضرت نذر صابری کے قدموں میں بیٹھنے کی عزت حاصل ہونے لگی۔

صابری صاحب شاعر اور ادیب ہی نہ تھے بلکہ عالم تھے، عارف تھے، صوفی تھے نسخہ شناس تھے اور ان کا سینہ معارف کا گنجینہ تھا۔ ان کی محفلوں میں جن دیارواَمصار اور نفوسِ قدسیہ کا ذکر مسلسل ہوتا تھا، ان میں کھڈ شریف اور مولانا محمد علی کھڈی بھی شامل ہیں۔ کھڈ شریف اور مولانا محمد علی کھڈی سے صحیح تعارف انھی محفلوں میں ہوا۔ حضرت نذر صابری ضلع بھر کی خانقاہوں اورآستانوں سے نہ صرف واقف تھے بلکہ وہ کئی آستانوں پر متعدد بار حاضر بھی ہو چکے تھے۔ اسی طرح جہاں جہاں کتب خانے یا قلمی کتابوں کے ذخیرے تھے، وہ بھی ان کی نگاہ میں تھے۔ وہ مجلسِ نوادراتِ علمیہ کے زیر اہتمام اٹک جیسے دور افتادہ اور پس ماندہ علاقے میں مخطوطات کی دو نمائشوں کا انعقاد کر کے بڑے بڑے فضلا اور مخطوطہ شناسوں کو حیران کر چکے تھے۔ انھوں نے میکی ڈھوک، گڑھی افغاناں، کھڈ شریف اور کئی دوسرے کتب خانوں میں موجود خطی کتابوں کی فہرست سازی کا کام اپنے ذوق وشوق سے کیا تھا اور اس حوالے سے وہ ملک بھر میں معروف تھے ضلع بھر کے کتب خانوں اور آستانوں میں سب سے زیادہ انھیں کھڈ شریف اور مولانا محمد علی

☆ ایسوسی ایٹ پروفیسر، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کھڈی سے انس تھا اور ان کے تذکرے سے ان کی اکثر محفلیں مشک بار رہتیں۔

کھڈ شریف سے ان کی محبت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں جب رسل و رسائل کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں اور کئی کئی میل پیدل چلنا پڑتا تھا، وہ کئی بار کھڈ شریف تشریف لے گئے۔ کیمبل پور سے کھڈ ریلوے اسٹیشن تک ریل کا سفر کرتے اور پھر اسٹیشن سے آستانہ مولانا محمد علی کھڈی تک کئی میل کا سفر پاپیادہ کرتے۔ راستہ پہاڑی اور دشوار گزار تھا مگر ان کے جذب و شوق نے کئی باران راستوں کو سر کیا۔ کھڈ شریف، مولانا محمد علی کھڈی اور خطی کتابوں کا ذکر ان کی زبان سے سن سن کر مجھے اور میرے دوسرے دوستوں کے دِل میں بھی کھڈ شریف کو دیکھنے اور مولانا محمد علی کھڈی کے آستانے پر حاضری دینے کی آرزو پیدا ہوئی۔ ہمارے ذوق و شوق کو دیکھتے ہوئے صابری صاحب اکثر کھڈ شریف کا پروگرام ترتیب دیتے مگر ان کی معیت میں سفر ہمارے نصیب میں نہ تھا، اس لیے ہر بار پروگرام ملتوی ہو جاتا۔ اس عرصے میں ایک بار کھڈ شریف کے سجادہ نشین پیر فضل الدین کھڈی (غالب امکان ہے کہ یہ صاحبزادہ مولانا فتح الدینؒ ہوں کیوں کہ ۸۰ء کے بعد دادا جی بہت کم سفر کیا کرتے۔ زیادہ تر والدِ گرامی کا آنا جانا اٹک رہتا تھا۔ ساجد نظامی) اٹک آئے۔ میں اور صابری صاحب سول بازار میں واقع انڈس بار میں بیٹھے تھے۔

پیر صاحب وہاں سے گزرے تو صابری صاحب نے دیکھ لیا، مجھے فوراً انھیں روکنے کے لیے دوڑایا اور پھر خود بھی ننگے پاؤں ہوٹل سے باہر نکل آئے اور نہایت والہانہ انداز میں ان سے گلے لگ گئے اور پھر انھیں اپنے ساتھ ہوٹل لے آئے۔ پیر صاحب کے ساتھ دو خادم بھی تھے۔ پیر صاحب جلدی میں تھے مگر صابری صاحب کے اصرار پر انھیں چائے کے لیے رکنا پڑا۔ اس دوران ان سے نہایت محبت آمیز باتیں کرتے رہے مگر کہیں کہیں کھڈ شریف کے کتاب دار کا ذکر آتا تو صابری صاحب کا چہرہ قدرے سرخ اور گفتگو قدرے تلخ ہو جاتی۔ صابری صاحب کا کہنا تھا کہ مولوی کتابوں کے دشمن ہوتے ہیں اور اس خزانے سے نہ خود فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ کسی اور کو اجازت دیتے ہیں۔ آپ جیسے سجادہ نشین حضرات نہ جانے کیوں کتابوں کی حفاظت کے لیے ان موذیوں کو رکھ لیتے ہیں۔ پیر صاحب نہایت تحمل اور خوش دلی سے صابری صاحب کی باتیں سنتے رہے اور انھیں بار بار کھڈ آنے کی دعوت دیتے رہے۔ آدھ گھنٹے کی نشست رہی ہو گی مگر پیر صاحب کے چلے جانے کے بعد بھی صابری صاحب سرشار اور شاداب رہے۔ یہ رنگ ان کی دلی خوشی کا ترجمان تھا اور کئی کئی دنوں کے بعد اس وقت نمود کرتا تھا، جب وہ اپنی کسی پسندیدہ شخصیت سے ملتے تھے یا انھیں کوئی خاص کتاب ملتی تھی۔ اس ملاقات کے بعد بھی کھڈ شریف کے پروگرام بنتے اور ٹوٹتے رہے، ایک آدھ بار وہ تشریف لے گئے مگر میں اس سفر میں ان کے ساتھ نہ جا سکا۔ یوں ان کی معیت میں کھڈ شریف جانے کا خواب خواب ہی رہا۔

وقت گزرتا رہا اور پھر ایک طویل عرصے کے بعد جب ساجد نظامی اور ان کے چھوٹے بھائی خالد کا تعلیم کے سلسلے میں اٹک آنا جانا عام ہوا تو یہ صاحبزادگان نہایت ادب و احترام کے ساتھ صابری صاحب کے پاس آنے جانے لگے، ان محفلوں میں مجھے بھی ان سے ملنے کا موقع ملا اور پھر ان سے میرا تعلق گہرا ہوتا چلا گیا۔ ساجد نظامی صاحب اپنے عجز و انکسار اور اخلاص و ایثار کے باعث دل کے قریب آ گئے اور جب وہ اپنے تعلیمی معاملات کے سلسلے میں میرے پاس تواتر و تسلسل سے آنے جانے لگے تو بار بار کھڈ شریف کی دعوت

دیتے۔ان کی پر خلوص دعوت بالآخر مجھے کھڈ شریف کھینچ کر لے گئی اور پھر تو یہ راستہ میرے لیے جیسے اجنبی نہیں رہا۔ متعدد بار مجھے کھڈ شریف حاضر ہونے اور ساجد نظامی کے دادا پیر فضل الدین کھڈی اور ان کے والد گرامی پیر فتح الدین کھڈی سے ملنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ان بزرگوں کا سلوک عام پیروں اور بزرگوں سے قدرے مختلف تھا، سچ میں وہ سر تا پا شفقت اور محبت تھے۔ عجز وانکسار کا نمونہ اور سادگی کا پیکر۔اُن کے ہاں نہ کسی مخصوص جبہ و دستار کا کروفر تھا نہ کسی امتیازی رنگ و آہنگ کا شور و غوغا۔سادہ سی ٹوپی اور عام سالباس پہنے وہ محبت اور فقیرانہ گفتگو کرتے تھے۔ پیر فضل الدین چشتی سے میری دو یا تین ملاقاتیں ہی ہو سکیں۔ان کے خاص حجرے میں ان سے نہایت مختصر سی گفتگو کا شرف بھی مجھے حاصل ہوا مگر یہ گفتگو مزاج پرسی اور دعا کی درخواست تک محدود رہی۔البتہ پیر فتح الدین چشتی سے ملنے ملانے اور باتیں کرنے کے کئی مواقع میسر آئے اور دیر تک ان کی صحبت میں بیٹھنے کی عزت حاصل ہوئی۔ان کی گفتگو میں نرمی اور مٹھاس کے ساتھ ساتھ قدرے دھیما پن تھا، ان کی باتیں بہت غور سے سننا پڑتی تھیں۔ میں موقع محل کی مناسبت سے کوئی بات پوچھتا تو نہایت مشفقانہ انداز میں گفتگو فرماتے، احوال پرسی کرتے اور دعا دیتے۔ایک بار مولانا محمد علی کھڈی کے مزار مقدس کی تعمیر کے حوالے سے گفتگو ہونے لگی، انھوں نے تعمیرِ مزار کے بارے میں ان باتوں کا تفصیل سے ذکر کیا جو انھوں نے اپنے بزرگوں سے سن رکھی تھیں، معماروں اور کاشی کاروں کی ہنر مندی کے واقعات سنائے اور بتایا کہ مزار کی تزئین و آرائش میں جو فیروزی ٹائلیں لگی ہیں وہ اونٹوں کے ذریعے ملتان سے لائی گئی تھیں۔ دیر تک بزرگوں کی خدمات اور سرگرمیوں کا ذکر نہایت محبت آمیز انداز میں کرتے رہے۔

ان سے اجازت لے کر باہر نکلے تو ساجد نظامی صاحب بہت خوش تھے اور کہنے لگے کہ آج آپ کی وجہ سے مزار شریف کی تعمیر کی بابت کئی باتیں ہمیں پہلی بار معلوم ہوئی ہیں۔ میں نے اپنے ذوق وشوق سے جب کتب خانہ مولانا محمد علی کھڈی میں موجود پنجابی کے خطی نسخوں کی وضاحتی فہرست کو کتابی صورت میں شائع کرنا چاہا تو ساجد نظامی صاحب سے درخواست کی وہ قبلہ والد صاحب سے اس پر تعارفی تحریر لکھوا دیں، انھوں نے میری خواہش کے احترام میں ان سے درخواست کی، پیر صاحب نے نہایت محبت سے ابتدائیہ لکھ دیا جو ساجد نظامی صاحب سے کہیں گم ہو گیا۔میرے توجہ دلانے پر انھوں نے دوبارہ ان سے درخواست کی، انھوں نے بارِ دگر یہ کرم کیا اور محبت سے دوبارہ تقریظ لکھ دی، جس میں میرے کام کی تحسین اور حوصلہ افزائی فرمائی۔ایک بار ساجد صاحب کے حکم پر میں نے کھڈ شریف کے مدرسے کے طلبہ سے خطاب کیا، پیر صاحب کی طبیعت کئی روز سے خراب تھی، ہمارے منع کرنے کے باوجود وہ شروع سے آخر تک محفل میں موجود رہے۔میری طالب علمانہ گفتگو کو پسند فرمایا اور دعاؤں کے بیش قیمت تحائف سے سرفراز فرمایا۔

مریدوں اور خدمت گزاروں کے ساتھ ان کا برتاؤ نہایت دوستانہ اور فقیرانہ تھا۔ میں نے انھیں کبھی غصے یا ناراضی کی حالت میں نہیں دیکھا۔ انھیں کئی عوارض اور بیماریوں نے گھیر رکھا تھا اور علاج معالجے کے لیے انھیں راول پنڈی اور اسلام آباد کے ہسپتالوں اور دواخانوں میں کئی کئی دن زیر علاج رہنا پڑا اور ان کے کئی اپریشن بھی ہوئے مگر صبر و رضا ہمیشہ ان کے ساتھ سفر میں

رہے۔ان کا چہرہ تکالیف کے ایام میں بھی شکر کی روشنی سے جگمگ جگمگ کرتا رہا۔ وہ صحیح معنوں میں بزرگانِ سلف کا نمونہ اور اولیائے پیشین کی یادگار تھے۔ نام ونمود سے بے نیاز اور صلہ وستائش کی تمنا سے آزاد رہ کر انھوں نے خلقِ خدا کی رہبری اور رہنمائی کی۔ ان کا آستانہ فقر کی روشنی سے مستنیر رہا اور خلقِ خدا میں فیض تقسیم ہوتا رہا۔ ۲۳ اگست ۲۰۲۲ء کو رات کے دس بجے مجھے ان کے وصال کی خبر ملی، دیر تک ان کا متبسم اور شفیق چہرہ میری آنکھوں میں روشن رہا، ان سے ہونے والی ملاقاتیں اور ان کی صحبت میں گزرے لمحے ایک ایک کرکے یاد آتے رہے۔

اگلے دن جنازے میں شرکت کے لیے میں کھڈ شریف پہنچا۔ غسل دے کر ان کی میت مولانا محمد علی کھڈی کے مزار کے زیر سایہ رکھ دی گئی تھی۔ خلقِ خدا کا ہجوم ان کے آخری دیدار کے لیے امڈ آیا تھا۔ میں بھی بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور ان کے پرسکون اور متبسم چہرے کی زیارت کی۔ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے لوگوں کے ہجوم میں حضرت علامہ محمد اقبال کا لافانی شعر میرے حافظے میں چمک رہا تھا:

نشانِ مردِ حق دیگر چہ گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

دُرویشِ بے ریا

محمد ساجد نظامی

آپ کی ولادت ۱۹۴۲ء میں حضرت مولانا فضل الدین رحمہ اللہ علیہ کھڈی کے ہاں کھڈ شریف میں ہوئی۔ آپ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ آپ کی ولادت کے بعد چار ہمشیرہ ہوئیں۔ آپ سے چھوٹی اور بہنوں میں سب سے بڑی ہمشیرہ کا وصال ۱۳ رمضان المبارک ۱۹۹۶ء کو ہوا۔ قرآنِ مجید کی تعلیم اپنے نانا حضرت مولانا محمد الدین کھڈی (م۔۱۹۷۵ء) سے حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد اور دادا حضرت مولانا محمد احمد الدین کھڈی (م۔۱۹۶۹ء) کے زیر نگرانی ہوئی۔ عصری علوم کے حصول کے لیے کھڈ شریف کے علاوہ داؤد خیل، چکڑالہ، ڈیرہ اسماعیل خان اور ملتان کا سفر کیا۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد قریباً دس سال حضرت قبلہ عالم نور محمد مہاروی کی نگری مہار شریف (تحصیل چشتیاں، ضلع بہاولنگر) میں رہے۔ ۱۹۷۵ء میں حضرت خواجہ غلام زین الدین (م۔۱۹۷۸ء) کی صاحبزادی کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ اللہ رب العزت نے آپ کو تین بیٹوں اور دو بیٹیوں سے نوازا۔ آپ اپنے دادا حضرت مولانا محمد احمد الدین کھڈی کے حلقۂ ارادات میں داخل ہوئے۔ ولادت سے لے کر اپنے دادا حضور کے وصال (۱۹۶۹ء) تک قریباً ۲۸ سال تک ان کے زیر تربیت رہے۔ سفر و حضر میں ان کا ساتھ میسر رہا۔ آپ کو اپنے والدِ مکرم حضرت مولانا محمد فضل الدین کھڈی (م۔۲۰۰۸ء) سے خلافت عطا ہوئی۔ اپنے والدِ مکرم کے وصال کے بعد خانقاہ حضرت مولانا محمد علی کھڈی کے چھٹے سجادہ نشین مقرر ہوئے۔ ۱۴ سال خانقاہ کی خدمت دل و جان سے کی۔ آپ کی شخصیت اپنے اسلاف کا عملی نمونہ تھی۔ علم و فضل کے علاوہ جو وصف آپ کی ذات میں بہت نمایاں تھا وہ خدمتِ خلق کا حقیقی جذبہ تھا۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے کھڈ شریف جیسی دور افتادہ بستی میں تعلیم و صحت کے شعبوں میں گراں قدر خدمات سر انجام دیں۔

خانقاہ معلیٰ میں علمی و تعمیراتی سرگرمیاں آپ کی ذات کی مرہونِ منت ہیں۔ اسلامی علوم کے ساتھ عصری علوم کی ترویج و ترقی میں شب و روز کوشاں رہے۔ کھڈ شریف اور اس کے گردونواح میں تعلیم و صحت ہر دو شعبوں میں ان کی خدمات قابلِ ستائش ہیں۔ فری ڈسپنسری اور ۴۲ سال تسلسل کے ساتھ فری آئی کیمپ کا انعقاد اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ جو تا حال بحمد اللہ جاری ہے۔

خانقاہِ معلیٰ حضرت مولانا کھڈی پر قائم عظیم و قدیم کتب خانہ کی جدید بنیادوں پر دیکھ بھال کا اہتمام ہو یا گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، اٹک کے کتابدار جناب نذر صابری (م۔۱۱ دسمبر ۲۰۱۳ء) سے کتب خانہ کی فہرست سازی کا مرحلہ ہو، ہر ایک کام کے لیے آپ کی کاوشیں ہمیشہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔ آپ کی انھیں کاوشوں کی بدولت آج کتب خانہ کے خطی نسخہ جات

اور دیگر اہم تاریخی دستاویزات کو آن لائن کرنے کے کام کا آغاز ہو چکا ہے۔ سہ ماہی "قندیل سلیمان" پوری آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ مخطوطات و مطبوعات کی فہرست سازی پر بھی کام ہو رہا ہے۔

خانقاہِ معلیٰ حضرت مولانا کھڈی پر جامعہ عالیہ دینیہ کے نام سے اسلامی علوم کی درس گاہ آپ کی سرپرستی میں دینی علوم کی ترویج میں اپنی خدمات کا دائرہ بڑھا رہی ہے۔ دینی و عصری علوم کے حسین امتزاج سے مزین تین ادارے کھڈ شریف، انجرا اور کھڈ روڈ (کانی) میں اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ جن اداروں سے سینکڑوں طلبا و طالبات اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد معاشرے کا بہترین فرد بن کر پاکستان کی تعمیر و ترقی میں اپنا فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔

علاقہ بھر کی عوام کے لیے تعلیم اور صحت کے حصول کے لیے حقیقی کاوشیں آپ کی زندگی کا مقصد رہیں۔ آپ اکثر اپنی گفت گو میں فرماتے تھے کہ یہ جذبہ میرے دادا حضور نے عطا فرمایا اور انھیں کے حکم کی تعمیل میں اپنی زندگی وقف کیے بیٹھا ہوں۔ اس خدمتِ خلق کی بدولت انھیں یہ مقام نصیب ہوا کہ وہ مخدوم ہوئے۔

"ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد"

تونسہ مقدسہ، مہار شریف، پاکپتن شریف اور سلسلہ چشتیہ کی دیگر خانقاہوں پر باقاعدگی کے ساتھ حاضری آپ کی زندگی کا معمول رہا۔ متعدد بار حج بیت اللہ اور عمرہ شریف کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔ روضہ رسول ﷺ کی حاضری زندگی کا افضل ترین مقصد گردانتے تھے۔ جب بھی عمرہ شریف اور حج کے لیے تیاری بنتی تو اپنے قریبی دوستوں کو بھی اس مبارک سفر کے لیے تیاری کی دعوت دیتے۔ میں نے اکثر انھیں اس سفر کے لیے دوستوں کو عجب سرشاری کے عالم میں باخبر کرتے دیکھا اور سنا ہے۔ معروف نعت گو شاعر جناب عبدالستار نیازی فیصل آبادی کی مشہور نعت کا یہ مصرع گنگنا کر احباب کو اس مبارک سفر کی تیاری کی نوید سناتے کہ

بیڑا مدینے والا لیندا پیا تاریاں
جس نے مدینے جانڑاں کر لو تیاریاں

یہ مصرے زبان پر ہوتے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہو رہی ہوتی۔ سبحان اللہ

آپ کی ذاتِ والا صفات کی یادیں اِک پھُل جھڑی کی مانند ذہن نارسا پر کھِلتی چلی جاتی ہیں۔ آپ کی زندگی اپنے اسلاف کا نمونہ تھی۔ نشست و برخاست اور گفت و شنید میں اپنے بزرگوں کی مثال تھے۔ زندگی میں اِک ٹھہراؤ سا تھا۔ عاجزی و انکساری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ نوجوانی میں علمی و سماجی کاموں کا اِک جنون تھا جو کبھی اُنھیں ٹِک کر بیٹھنے نہ دیتا تھا۔ ہر وقت سفر میں رہتے تھے۔ کبھی لوگوں کے انفرادی کاموں کے لیے سرگرداں نظر آتے تو کبھی اجتماعی کاموں میں جُتے نظر آتے۔

بڑے نَرم دل تھے۔ کسی کی تکلیف لمحہ بھر برداشت نہ کر سکتے تھے۔ چاہے تپتی دوپہر ہوتی یا یخ بستہ رات کوئی مصیبت کا مارا مدد کو پکارتا تو انھیں ہمیشہ اپنے لیے تیار پاتا۔ کوئی بھی وقت یا مسئلہ انھیں غریب پروری اور مصیبت زدہ کی مدد کرنے سے روک نہیں سکتا تھا۔ ہمیشہ مستعد و تیار رہتے۔ میں نے اپنے لڑکپن کی یخ بستہ راتوں میں انھیں کھڈ کی واٹر سپلائی اسکیم کے لیے تگ و دو کرتے دیکھا

تھا۔ سیاہ ہتھیلیوں پر تیل کی تہہ جمی تھی اور آپ بے تابی کے ساتھ ٹربین اور جنریٹر کے مستریوں کے ساتھ دوڑتے پھرتے تھے کہ کئی دنوں سے اہلِ کھڈ کو پانی نہ مل سکا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے شہر بھر کی شدتِ پیاس لیے ہوئے ہیں۔ پھر کئی گھنٹوں، بلکہ دنوں اور ہفتوں کی محنت کے بعد وہ لمحہ آیا کہ پانی کی بوندیں ٹینک کے پیٹ کو سیراب کرنا شروع کرتیں ہیں۔ اور اِدھر والدِ مکرم کا چہرہ آفتاب کی مانند دمکتا چلا جاتا ہے۔ ایک لامحدود خوشی ہوتی جو انھیں بیٹھنے نہ دیتی۔ یہ خوشخبری شہر بھر میں پہنچاتے کہ اب کوئی لب پیاسا نہیں رہے گا۔

سالانہ فری آئی کیمپ کا اہتمام تو جیسے اُن کا عشق تھا۔ سال کے آغاز سے ہی اہتمام شروع کر دیتے۔ اندھوں کو آنکھیں اور بے سہارا کو کندھوں پر اُٹھانا کوئی اُن سے سیکھے۔ کھڈ شریف کے ساتھ ساتھ یہ ذوق و شوق ترگ شریف اور بندیال شریف تک بھی منتقل کیا کہ علاقہ بھر کے غریبوں اور بے سہاروں کے لیے سالانہ فری آئی کیمپ کا اہتمام ہو۔

دوست احباب کو نیکی اور خیر کی ترغیب دلانا بذاتِ خود ایک نیکی ہے۔ والدِ مکرم کے مزاج میں یہ خوبی بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی کہ خود تو سراپا خیر تھے ہی دوسروں کو بھی خیر میں شامل کرتے۔ خیر بانٹتے اور خیر بانٹنے کی ترغیب بھی دلایا کرتے۔ سراپا خیر تھے۔ اللہ رب العزت ہمیں بھی خیر تقسیم کرنے کی توفیق ارزانی کرے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

تذکرہ درویشِ دورِ حاضر

حافظ علامہ محمد اسلم کھڈی☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حب درویشاں کلیدِ جنت است
دشمنِ ایشان سزائے لعنت است

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے ہر دور میں کچھ صاحبِ کردار وصاحب مراتب لوگ پیدا فرماتا رہتا ہے۔ تاکہ دیگر حضرات ان کی انمول زندگی کے مشاہدہ سے اپنی آخرت کی سمت صحیح متعین کر سکیں۔ ایسے ہی اوصافِ جمیلہ کے محاملین میں سے ایک شخصیت یادگار اسلاف درویش ابنِ درویش حضرت پیر فتح الدین چشتی نظامی کی بھی تھی۔ آپ کی زندگی علم، عمل، حلم، سخا اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عبارت ہے۔ آپ کے متعلق یہ کہا جائے کہ آپ رحمتہ اللہ علیہ اسرارِ معرفتِ الٰہی ومحبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساقی اور خوشہ چین تھے تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔

آپ سے چند یادگار ملاقاتیں

راقم این سطور ۲۰۰۷ء سے آستانہ عالیہ حضرت مولانا شاہ محمد علی کھڈی رحمتہ اللہ علیہ کی درسگاہ میں خدمتِ تدریس کے لیے حاضر ہے۔ اوائل ایام میں تو فقط آپ سے مختصر دعا وسلام کا تعلق رہا۔ البتہ جب ۲۰۱۱ء میں، میں نے اپنی فیملی کھڈ شریف لانے کا پروگرام بنایا تو میں نے حضرت پیر محمد ناصر گل صاحب چشتی نظامی سے رہائش کے متعلق درخواست پیش کی۔ آپ نے یہ بات کسی طریقے سے حضرت پیر فتح الدین چشتی نظامیؒ تک پہنچائی۔ ماہِ ربیع الاوّل کا آغاز تھا تاہم حضرت پیر فتح الدین چشتی نظامیؒ نے ایک دن نمازِ فجر کے بعد مجھے طلب فرمایا۔ دیگر کوئی بات نہیں فرمائی۔ موجودہ مکان (جس میں ہم رہائش پذیر ہیں) کی طرف تشریف لائے اور مجھے بھی ساتھ لے آئے۔ جب ہم حویلی میں پہنچے تو آپ نے تمام کمروں کے تالے کھول کر ہمیں حویلی کا مشاہدہ کرایا اور ساتھ ہی فرمانے لگے کہ یہ مکان آپ کی رہائش کے لیے ہے۔ یہاں تین طرف پانی کا علیحدہ انتظام ہے۔ بجلی کی بھی سہولت میسر ہے۔ آپ پر کسی

☆ صدر مدرس، شعبہ درسِ نظامی، خانقاہِ معلیٰ حضرت مولانا محمد علی کھڈی

قسم کا کوئی پانی یا بجلی کا بل نہیں ہے۔ اور مزید فرمایا کہ اس مکان میں حضرت استاذ الکل علامہ عطا محمد بندیالوی بھی رہائش پذیر رہیں ہیں۔ میرے دل میں مزید مسرت اور اعتقاد پیدا ہوا۔

مصرع چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک

اور آخر میں بہت اعلیٰ جمیلہ ارشاد فرمایا کہ "آپ اس مکان میں مہربانی فرمائیں اپنی فیملی لے آئیں"۔

خود بھیک دیں اور خود کہیں کہ منگتے کا بھلا ہو۔ بعد ازاں گاہے بگاہے آپ کی ملاقات وزیارت سے مستفید ہوتا رہتا تھا۔ چار سال قبل ماہِ رمضان شریف کھڈ شریف گزارنے کا اتفاق ہوا۔ ایک دن آپ نے افطار سے قبل حکم فرمایا کہ افطاری اکھٹے کریں گے۔ آپ نے افطار سے قبل حضرت امام مالک ؒ کا مشہور واقعہ (کہ امام مالک ؒحضورِ اقدس ﷺ کے ادب کی وجہ سے مدینہ شہر میں کبھی بھی گھوڑے پر سوار نہ ہوئے اور نہ کبھی حج کے علاوہ مدینہ شریف سے باہر قدم رکھا اور حدیث شریف کبھی بھی بغیر وضو کے بیان نہ فرماتے) بیان فرمانے کے بعد حضرت پیر صاحب کی آنکھوں سے آنسو بارش کی طرح جاری تھے۔ یہ عشق رسول ﷺ اور درِ رسول ﷺ کے ساتھ محبت کی اعلیٰ دلیل ہے۔

خدمتِ مخلوقِ خدا

آپ میں دیگر اوصاف کی طرح مخلوقِ خدا کی خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اگر آپ کے پاس کوئی سائل اپنی حاجت لے کر حاضر ہوتا تو آپ ضرور اپنی استطاعت کے مطابق اس کی خدمت فرماتے۔ شہر کھڈ شریف کے لیے واٹر سپلائی کا انتظام آپ کا مرہونِ منت ہے۔ نیز مدت مدیدہ سے فری آئی کیمپ بھی آپ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔

یہ تمام اُمور آپ کی سعی جمیلہ کی بدولت معرضِ وجود میں آئے وگرنہ کھڈ شریف کے باشندگان میں سے بڑے بڑے لوگ سرکاری مراتب پر فائز رہے لیکن یہ کام نہ کر سکے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ان خدمات میں دراصل آپ کے داداجی حضرت مولانا احمد دین کھڈی کا بہت ہاتھ تھا۔ حضرت پیر فتح الدین کھڈی نے راقم کو ایک مجلس میں بتایا کہ جب میں چھوٹا بچہ تھا تو مجھے داداجی نے پاس بلا کر استفسار فرمایا کہ بڑے ہو کر کیا کرو گے تو میں نے جواباً عرض کیا کہ عالمِ دین بنوں گا۔ آپ نے فرمایا پھر کیا کرو گے عرض کیا کہ دین کی خدمت کروں گا۔ میری یہ بات سن کر کچھ خاموشی کے

بعد آپ فرمانے لگے کہ یہ بہت اچھی بات ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس کے ساتھ ساتھ مخلوقِ خدا کو زیادہ نفع پہنچانے والا کام کرو۔ تاہم آپ نے دینی خدمات کے ساتھ ساتھ ان مذکورہ بالا اُمور کی طرف بھی خاص توجہ فرمائی۔

آپ کے معمولات:

آپ کے معمولات میں سے اہم چیز جس نے مجھے بہت زیادہ آپ کا گرویدہ بنایا وہ نماز کی سخت پابندی تھی۔ آپ بہ حالتِ صحت تمام نمازوں میں سب سے قبل مسجد میں موجود ہوتے تھے۔ گاہے بگاہے آپ کو ذکرِ بالجہر کی چاشنی سے مستفید ہوتے ہوئے دیکھا گیا۔ اگر موجود نمازیوں میں سے کوئی نمازی غیر حاضر ہوتا تو اُس کے متعلق ضرور استفسار فرماتے۔ اور فرمایا کرتے ہمارے آباؤاجداد نمازِ باجماعت کی بہت پابندی فرماتے تھے۔ یہ تھی آپ کے مزاج گرامی میں عبادت اور ایمان کی حلاوت۔ علاوہ ازیں آپ تمام وظائف و اوراد کی بھی بہت پابندی فرماتے تھے۔ دلائل الخیرات، اورادِ فتحیہ، حزب البحر اور درودِ مستغاث شریف آپ کے روزانہ کے اوراد میں شامل رہے۔ البتہ اخیر عمر میں نظر کی کمزوری کی وجہ سے آپ نے یہ معمولات ترک فرما دیے تھے۔ البتہ نمازِ باجماعت کی غیر حاضری سوائے مرض الموت کی چند نمازوں کے نہ ہوئی۔

قرآن شریف کی تلاوت روزانہ کا معمول تھا۔ اس میں کبھی ناغہ نہ کیا۔ میری معلومات کے مطابق روزانہ پانچ پاروں کی تلاوت فرمایا کرتے۔ آپ صرف قرآن کی تلاوت ہی نہ فرماتے تھے بلکہ ترجمہ و تفسیر بھی زیر مطالعہ رہتیں۔ یہ معلومات مبالغۃ آرائی پر مبنی نہیں بلکہ یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے۔ اکثر دورانِ مطالعہ مجھے بھی طلب فرما لیا کرتے اور فرماتے کہ یہاں سے یہ مسئلہ واضح ہوتا ہے، اِس آیت سے فلاں بات کی طرف اشارہ ہے وغیرہ۔ ایک دن آپ سورۃ "التغابن" پ ۲۸ کی تلاوت فرما رہے تھے۔ میرا وہاں سے گزر ہوا تو آپ نے مجھے طلب فرما کر آیت نمبر ۱۶-۱۵ کا حصہ:

ومن یوق شح نفسه فاولئك هم المفلحون۔

کی تفسیر پوچھی۔ تفسیر پر گفت گو نے آپ کی طبیعت کو بشاش کر دیا۔ ایک دن آپ سورۃ "النور" پ ۱۸ کی تلاوت فرما رہے تھے تو قرآن بند کر کے فرمانے لگے کہ اگر ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی پاک دامنی پر ایک آیت بھی اتر آتی تو یقین کے لیے کافی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے کمال محبت و شفقت سے متعدد آیات نازل فرمائیں۔ لہٰذا بد بخت ہے وہ آدمی جو ذہن میں کسی بات کا تصور بھی کرے۔

آپ طلبا کو صرف و نحو، ادیب عربی و فاضل عربی کی کتب اور ترجمہ و تفسیر قرآن مجید بھی پڑھاتے رہے لیکن بعد ازاں پیرانہ سالی کی وجہ سے اسباق ترک فرما دیے تھے۔ آپ کو اپنی دینی و علمی اور سماجی خدمات کی بنا پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ایسی شخصیات کسی بھی معاشرے کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ اللہ رب العزت اپنی حبیبِ کریم کے تصدق آپ کی اولاد کو یہ توفیق ارزانی کرے کہ وہ اپنے

بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اُن کے مشن کو جاری وساری رکھیں۔ بحمد اللہ آپ کی مساعی جمیلہ اور دعاؤں کے صدقے آپ کا مشن جاری وساری ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ سلسلہ یونہی دراز رہے۔ آمین

☆☆☆☆☆

حضرت مولانا فتح الدین چشتی نظامی رحمۃ اللہ علیہ

علامہ محمد اسرار الحق بندیالوی☆

معرفت کی الکھ نگری میں حقیقت کی تفہیم کے لیے مجاز کا سہارا لیا جاتا رہا ہے۔ حقیقت اور مجاز کے تعلق کو مشاہدہ کی قوت سے وقتاً فوقتاً بیان کیا جاتا رہا ہے۔ مشاہدہ ایک ایسی قوت ہے کہ جو بظاہر غیر واضح اور غیر اہم اشیا میں بھی معرفت کی نشانیاں تلاش کر لیتی ہے اور ایک سالک کے لیے معرفتِ حق کے راستے کو آسان بنا دیتی ہے۔ جیسے علامہ محمد اقبالؒ، مشاہدے کی دُنیا میں اُترے تو انھیں "شاہین" معرفت کا ایک استعارہ معلوم ہوا۔ شاہین جو بظاہر ایک پرندہ ہے، جو دوسرے پرندوں کی طرح کھاتا ہے، پیتا ہے اور پرواز کرتا ہے، لیکن علامہ محمد اقبالؒ کی نگاہ نے شاہین کی صورت میں ایک صوفی کا عکس دیکھ لیا اور شاہین کی خصوصیات کو ایک صوفی کی خصوصیات قرار دے دیا۔ گویا بظاہر نظر آنے والی ایک غیر اہم شے میں بھی معرفت کی نشانیاں موجود ہوتی ہیں۔ کیوں کہ میرے رب کا فرمان ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَاماً وَّقُعُوْداً وَّعَلٰی جُنُوْبِھِم وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَاخَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلاً سُبْحَانَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾

ترجمہ: وہ جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں (وہ بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے رب! آپ نے (یہ سب کچھ) بے کار (اور بے مقصد) پیدا نہیں کیا، آپ پاک ہیں، پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات میں کسی بھی شے کو باطل پیدا نہیں کیا۔ ہر تخلیق، خالق کی موجودگی کا پتا دیتی ہے۔ معرفت کی نشانیوں میں سے دریا بھی ایک نشانی اور استعارہ ہے۔ اہلِ معرفت و مشاہدہ نے دریا میں بھی فقر کی نشانیاں تلاش کی ہیں، جیسے دریا ایک بنجر، غیر آباد، ویران اور مردہ زمین کو خوشحالی، آبادی اور زندگی بخشتا ہے اسی طرح ایک فقیر بھی غیر آباد، ویران اور مردہ دلوں کو تازگی اور زندگی بخشتا ہے۔ فقیر مردہ دِلوں میں معرفت کا نور انڈیلتا ہے اور دِلوں کی بے نور بستی کو فقر کا ایک چراغ بنا دیتا ہے۔

☆ مدرس جامعہ مظہریہ امدادیہ، بندیال شریف (خوشاب)

کھڈ شریف کی سرزمین میں سے گزرنے والا دریائے سندھ بھی معرفت کے استعاروں میں سے ایک ایسا استعارہ ہے جو اپنے اندر مستعار منہ ہونے کے ساتھ ساتھ مستعار لہ بھی ہے۔ کھڈ شریف کی سرزمین سے گزرنے والا دریائے سندھ اس حوالے سے منفرد استعارہ ہے جو نہ صرف سالکین کے لیے معرفت کی نشانی ہے بلکہ کھڈ شریف کے مخصوص خطہ ارض میں، دریا بذاتِ خود فقر کی ایک نشانی اوڑھے ہوئے ہے۔ معرفت کی نشانیوں میں سالکین کے لیے غور و فکر کا ایک سامان ہوتا ہے۔ سالک معرفت کی خصوصیات اپنے اوپر طاری اور لاگو کر کے معرفتِ حق کے راستے پر اپنا سفر جاری و ساری رکھتا ہے۔ لیکن کھڈ شریف کا دریا ایک ایسا انوکھا دریا ہے کہ جو اپنی خصوصیات (زرخیزی، شادابی، مردہ زمین کو زندہ کرنا وغیرہ) نہ صرف سالکینِ فقر کو مہیا کر رہا ہے بلکہ کھڈ شریف کے عارفین اور فقرا کی خصوصیات اپنے اوپر طاری کیے ہوئے ہے، جو کہ خلافِ فطرت ہے۔ یہی خلافِ فطرت عمل متلاشیانِ حق کے لیے حیرت اور معرفت کا انوکھا استعارہ بھی ہے۔

دریا کی فطرت میں شور ہے، دریا جب سنگلاخ چٹانوں سے ٹکراتا ہے تو چٹانوں کی سختی اور رکاوٹ دریا کے پانی کی قوت کو مزید اُبھارتی ہے۔ جس کے نتیجے میں شور کا پیدا ہونا ایک فطری عمل ہے۔ لیکن کھڈ شریف میں دریا نے خلافِ فطرت عمل اختیار کیا ہوا ہے۔ دریا کا پُرجوش پانی چٹانوں کو کاٹتا ہوا پہاڑ کے سینے کو چیرتا ہوا گزر تو رہا ہے لیکن خاموشی کے ساتھ۔ دریا کی یہی خاموشی سالکین کے لیے حیرت کا سامان لیے ہوئے ہے، کیوں کہ آج تک تو یہ سنا گیا تھا کہ دریا کی خصوصیات سالکین اختیار کرتے ہیں لیکن یہاں معاملہ اُلٹ نظر آیا۔

کھڈ شریف کے بزرگانِ دین، عارفین و فقرا نے اعتدال کے راستے پر چلتے ہوئے اور انسانی جذبات کی اونچ نیچ کو ختم کرتے ہوئے، اپنے مزاجوں میں جو اعتدال اور سکون پیدا کیا ہے اس کا مظہر نہ صرف کھڈ شریف کے صاحبزادگان ہیں بلکہ کھڈ شریف سے گزرنے والا منہ زور، طاقت ور دریائے سندھ بھی ہے، جو شور کی قوت کی صلاحیت ہونے کے باوجود بھی اعتدال اور سکون کے ساتھ کھڈ شریف کی سرزمین سے گزر رہا ہے۔ گویا کھڈ شریف ایک ایسا منفرد آستانہ ہے جہاں کے باسی چاہے وہ ذوی العقول ہوں یا غیر ذوی العقول، ذی روح ہوں یا غیر ذی روح، کھڈ شریف کے فقرا کی نسبت کے صدقے ان میں جذبات کی اُتھل پتھل اور شور کی بجائے اعتدال، سکون اور خاموشی نظر آتی ہے۔

انھیں برگزیدہ شخصیات میں سے ایک شخصیت پیر طریقت حضرت مولانا محمد فتح الدین چشتی نظامی کھڈی رحمۃ اللہ علیہ (سجادہ نشین آستانہ عالیہ کھڈ شریف) کی بھی ہے۔ کہ جن کی ساری زندگی راہِ اعتدال پر گزری۔ ان کی زندگی میں جذبات کا بے جا شور شرابا نظر نہیں آتا۔ ان کی شخصیت سادگی اور عجز و انکساری کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھی۔ ان کی ذات

انتقام، انا، خود نمائی، تکبر جیسے رذائل کے شور شرابے سے کوسوں دور تھی۔ جس طرح دریائے سندھ نے کھڈ شریف کے مخصوص خطۂ ارض میں احترامِ بزرگانِ کھڈ شریف میں اپنی بالقوۃ آواز اور شور مچانے کی صفت کو بالفعل نہیں بننے دیا اسی طرح حضرت مولانا محمد فتح الدین چشتی نظامی کھڈی رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے بزرگوں کی نسبت کا بھرم رکھتے ہوئے، "نفی" کے مقام کو طے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کا کردار نفسانی خواہشات کی مکمل نفی کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ انھوں نے ساری زندگی نفسانی خواہشات کو غالب نہیں ہونے دیا۔ یہی وہ عمل ہے کہ جس کے نتیجے میں اللہ کے برگزیدہ بندے مقام "لَا" سے مقامِ "اِلَّا اللہ" تک پہنچ جاتے ہیں۔ جب اللہ کے نیک بندے ماسوا اللہ کی نفی کرتے ہیں تو پھر ان میں اللہ تعالیٰ اپنی رحمانی صفات پیدا فرما دیتا ہے۔ حضرت مولانا محمد فتح الدین چشتی نظامی کھڈی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی رحمانی صفات کا مظہر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر بزرگانِ کھڈ شریف، پیران پیر غوثِ اعظم دستگیر، حضرت پیر شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کا مظہر نظر آتے ہیں:

"لَا يَجُوْزُ لِشيخٍ اَنْ يَجْلِسَ عَلَى سَجَّادَةٍ وَيتَقَلَّدُ بِسَيْفِ الْعِنَايَةِ حَتّٰى يُكَمِّلَ فِيهِ اثْنَتَا عَشَرَةَ خَصْلَةً۔"

ترجمہ: کسی بھی پیر کے لیے جائز نہیں کہ وہ مسندِ طریقت و سجادگی پر بیٹھ جائے اور رہنمائی کی تلوار پہن لے حتیٰ کہ بارہ صفات اور خصائص کو پورا نہ کر لے۔

"خَصْلَتَانِ مِنَ اللهِ ﷻ وَخَصْلَتَانِ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ و خَصْلَتَانِ مِنْ اَبِیْ بَكْرٍرضی الله عنہ وَخَصْلَتَانِ مِنْ عُمَرَرضی الله عنہ وَخَصْلَتَانِ مِنْ عُثْمَانَ رضی الله عنہ وَ خَصْلَتَانِ مِنْ عَلِیٍّ رضی الله عنہ۔"

ترجمہ:

دو صفتیں اس (پیر) میں اللہ رب العزت والی ہونی چاہئیں اور دو صفتیں نبی کریم ﷺ والی ہونی چاہئیں اور دو صفتیں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ والی ہونی چاہئیں اور دو صفتیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ والی ہونی چاہئیں اور دو صفتیں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ والی ہونی چاہئیں اور دو صفتیں حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ والی ہونی چاہئیں۔

"فَاَمَّا اللَّتَانِ مِنَ اللهِ تعالىٰ يَكُوْنُ سَتَّاراً، غَفَّاراً۔"

ترجمہ: ہر پیر کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت ستاری اس میں ہو اور صفت غفاری بھی اس میں ہو یعنی مریدوں کے عیبوں پہ پردہ ڈالنا اور ان کی غلطیوں سے درگزر کرنا ایک پیر کامل کی نشانی ہے۔

"واَمَّا اللَّتَانِ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ يَكُوْنُ شَفِيْقاً رَفِيْقاً۔"

ترجمہ: حضور سرور کائنات ﷺ کی دو صفات بھی ایک پیر کامل میں موجود ہوں کہ وہ شفیق اور نرمی کرنے والا ہو۔

بزبانِ قلندرِ لاہوریؒ:

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُر سوز — یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

"واَمَّا اللَّتَانِ مِنْ اَبِيْ بَكرٍ رضی اللہ عنہ يَكُوْنُ صَادِقاً ،مُتَصَدِّقاً۔"

ترجمہ: دو صفتیں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ والی ہونی چاہئیں کہ وہ سچ بولنے والا ہو اور لوگ بھی اسے سچا مانتے ہوں۔

"وَاَمَّا اللَّتَانِ مِنْ عُمَرَ رضی اللہ عنہ يَكُوْنُ اَمَّاراً ،نَهَّاءً۔"

ترجمہ: دو صفتیں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ والی ہونی چاہئیں کہ وہ بہت زیادہ نیکی کا حکم دینے والا اور گناہوں سے روکنے والا ہو، یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر شدت سے قائم ہو۔

"واَمَّا اللَّتَانِ مِنْ عُثْمَانَ رضی اللہ عنہ يَكُوْنُ طَعَّاماً للطَّعَامِ ،مُصَلِّياً بِاللَّيْلِ وَالنَّاسِ نِيَام۔"

ترجمہ: دو صفتیں اس میں سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ والی ہونی چاہئیں کہ وہ کھانا کھلانے والا ہو، بے حد سخی ہو اور جب لوگ سو رہے ہوں تو وہ رات کو قیام کرنے والا ہو۔

بقولِ عارفِ کھڑی شریف رحمۃ اللہ علیہ

رات پوے تے بے درداں نوں نیند پیاری آوے

درد منداں نوں یاد سجن دی ستیاں آن جگاوے

وَاَمَّا اللَّتَانِ مِنْ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ يَكُوْنُ عَالِماً شُجَاعاً۔"[٢٤]

ترجمہ: اور دو صفتیں اس میں سیدنا علی المرتضیٰ شیر خدا رضی اللہ عنہ والی ہونی چاہئیں کہ وہ عالم بھی ہو اور شجاع و بہادر بھی ہو۔

اب ان اوصافِ جمیلہ کو مدِ نظر رکھیں اور قبلہ محب الفقرا، حضرت صاحبزادہ محمد فتح الدین چشتی نظامی کھڈی رحمۃ اللہ علیہ کی حیاتِ مبارکہ کے شب و روز کا بغور ملاحظہ فرمائیں تو واللہ آپ اِن اوصاف جمیلہ کا مظہر اتم نظر آتے ہیں، شاید اسی لیے مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ:

پیرِ کامل صورتِ ظلِ الٰہ　　　　یعنی دیدِ پیر، دیدِ کبریاء

پیکرِ محبتِ بے ریا، منبعِ خلوص وسخا

محمد شاہد ظفر بندیالوی☆

اجڑ گیا ہے چمن، لوگ دِل فگار چلے

کوئی صبا سے کہو ، اب نہ بار بار چلے

یہ کون سیر کا ارماں لیے چمن سے گیا

کہ بادِ صبح کے جھونکے بھی سوگوار چلے

اللہ رب العزت کے برگزیدہ بندوں کی زندگیاں ہمیشہ سے انسانیت کے لیے مشعلِ راہ رہی ہیں اور ایسی بابرکات شخصیات ، انسانیت کے روحانی ارتقاء کے لیے راہ مہیا کر کے حسین یادوں کے انمٹ نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔اس پُر آشوب دور میں ایسی پاک طینت ذوات کی زیارت وصحبت میسر آجانا انتہائی مشکل امر ہے۔ایسی ہی بزرگ اور کم یاب شخصیات میں ایک نام، پیر طریقت، رہبر شریعت، حضرت پیر محمد فتح الدین چشتی نظامی کھڈی رحمۃ اللہ علیہ (سجادہ نشین آستانہ عالیہ کھڈ شریف) کا بھی ہے۔آپ رحمۃ اللہ علیہ کی ذات، بزمِ صوفیاء کی زینت، درویشی وسادگی کی آبرو، متوکلین وعاجزین کا تجمل، دنیوی بے رغبتی واخلاص کا تزک و حشم، محبت، صلہ رحمی اور سخاوت کا پیکر تھی۔انسانی وجود میں متعدد صفات کا جمع ہونا اچنبھے کی بات ہے لیکن قدرت نے جس مسند کے لیے آپ کا انتخاب فرمایا یہ اسی کا تقاضا تھا کہ آپ کی شخصیت میں بے شمار صفاتِ عظیمہ مجتمع ہوگئی تھیں۔

مجھ حقیر نے انہیں ماموں جان ہونے کے ساتھ ساتھ استاد کی حیثیت سے بھی دیکھا،ان سے کچھ عرصہ اکتساب فیض کیا،ان کے ہم راہ عمرہ کی سعادت بھی نصیب ہوئی، علم دین کا طالب ہونے کے ناطے مجھے خاص محبت وشفقت سے نوازتے تھے۔آپ رحمۃ اللہ علیہ کی سادگی اور عاجزی کا یہ عالم تھا کہ اکثر آستانہ اور مدرسہ میں مریدین وطلباء کی بنفس نفیس خدمت کرتے نظر آتے۔توکل اور غنا کا حال یہ تھا کہ آپ کی محفل میں کبھی دنیاوی بحث نہیں ہوتی تھی، مجھ ناچیز کی معلومات کے مطابق آپ کو کئی دفعہ علاقے کے جاگیر داروں نے زمینیں دینا چاہیں کہ آستانے کے مصرف میں لے آئیں تو ہر بار فرماتے کہ مجھے ان کی قطعاً ضرورت نہیں آپ کسی ضرورت مند کو دے دیں۔بے ریا وبے غرض محبت کا ایسا پیکرِ عظیم تھے جس کی

☆ پی۔ایچ ڈی سکالر شعبۂ علوم اسلامیہ، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

مثال نہیں ملتی، خانوادے کے افراد اور متوسلین سے بلا تفریق بے لوث محبت فرماتے۔ خاندانی مسائل و اختلافات میں صبر و تحمل، در گزر اور صلہ رحمی سے کام لینا آپ ہی کا خاصہ اور انفرادیت تھی۔ ان تمام اوصاف کے علاوہ اللہ رب العزت نے آپ کو وصفِ سخاوت سے حصہ وافر عطا فرمایا تھا۔ متعلقین اور رشتے داروں پر حتی الوسع خرچ فرماتے تھے، عموماً سخاوت کرتے وقت بتقاضائے بشری انسانی ذہن میں بدلے کا تصور آجاتا ہے یا بعد میں کسی موقع پر احسان بھی جتلا دیا جاتا ہے لیکن آپ کی ذات بدلے یا احسان کے تصور سے منزہ و مبرا تھی۔ وہ نیکی و احسان کر کے ہمیشہ بھلا دیتے تھے۔

موجودہ خود رَو مشائخ کے برعکس آپ کی زندگی دو کاموں سے عبارت تھی، پہلی عبادت اور دوسری خدمتِ خلق۔ عبادت میں ایسا انہماک اور اخلاص بہت کم شخصیتوں میں دیکھنے کو ملتا ہے کہ سردی، گرمی، بارش اور بیماری کی پرواہ کیے بغیر پانچ وقت کی نماز نہ صرف خود باجماعت ادا فرماتے بلکہ آستانے پہ آئے ہوئے ہر خاص و عام کو سختی سے باجماعت نماز پڑھنے کی تلقین فرماتے۔ انھوں نے اپنے آرام کو آہِ سحر گاہی پہ قربان کر رکھا تھا۔ شدید کمزوری اور تکلیف کے باوجود اس رمضان المبارک میں بھی اکیس روزے رکھے، روکنے کی کوشش کی جاتی تو فرماتے مجھے مت روکو! شاید کہ یہ میرا آخری رمضان ہو۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے چار حج اور متعدد عمرے ادا کیے۔ قرآن کی تلاوت کا معمول بھی غضب کا تھا جس کا اندازہ آپ کی حیات کے آخری مہینوں میں لگایا جا سکتا ہے کہ آنکھ کی تکلیف کے باوجود تین سے پانچ پارے روزانہ تلاوت فرماتے تھے، علاوہ ازیں اپنے پیر و مرشد و جد اعلیٰ، ولی کامل، پیر طریقت، حضرت خواجہ احمد دین کھڈی رحمۃ اللہ علیہ کے بتائے گئے وظائف اور سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے دیگر اوراد کی باقاعدگی فرماتے۔ یہی وجہ تھی کہ جب بیماری کی شدت میں غنودگی طاری ہوتی تو زبان سے قرآن پاک یا درود شریف کا ورد جاری رہتا۔ اُن کی ایک بڑا ہی نادر وصف جس کا مجھ ناچیز نے ہر ملاقات میں مشاہدہ کیا کہ ان کے چہرے پہ ہمیشہ اطمینان و تیقن طاری رہتا، میں حلفاً کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ساری زندگی میں کسی شخص کو اتنا مطمئن اور پُر یقین نہیں دیکھا۔ بہت کچھ حاصل کر سکنے کی استطاعت ہونے کے باوجود معمولی اور مختصر پر خوش اور مطمئن رہتے۔ ہمہ وقت عبادت، ذکر اور تقویٰ کی ناؤ میں سوار رہتے، یوں لگتا تھا کہ اخروی زندگی کا وافر سامان لیے برسوں سے کسی آنے والے کے انتظار میں ہوں۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ کی حیات کا ایک واضح اور نمایاں پہلو خدمتِ خلق بھی تھا۔ لالچ و طمع کے بغیر، کسی بدلے کی امید نہ رکھتے ہوئے مخلوقِ خدا کی خدمت کرنا بڑی ہی غیر معمولی بات ہے۔ رفاہ عامہ کے کاموں کی لمبی فہرست ہے جو آپ کے پر خلوص اور اعلیٰ کردار کی غمازی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ کھڈ شریف میں پانی کا شدید مسئلہ تھا، آپ نے حالات کی ناسازی

کے باوجود انتہائی محنت اور جاں فشانی سے واٹر سپلائی سکیم کا اجراء کروایا جو آج بھی قائم ودائم ہے اور اس میں مزید بہتری آچکی ہے۔ علاقے میں تعلیم نسواں کا سلسلہ مفقود تھا، آپ نے بڑی محنت و خلوص سے گاؤں میں دو اسکول بنائے اور قرب وجوار کے علاقے میں تین اسکولز قائم کیے جس سے پورا علاقہ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوا۔ صحت کے شعبے میں بھی آپ نے خصوصی توجہ فرمائی اور آج سے چار دہائیاں قبل آپ نے آئی کیمپ لگوانا شروع کیا جہاں پہ غریب مریضوں کا مفت آپریشن کیا جاتا ہے اور اس بار بیالیسواں آئی کیمپ آپ کی زیر سرپرستی منعقد ہوا، اور آج تک آپ ہزاروں غریب اور مستحق مریضوں کا مفت آپریشن کروا کر ڈھیروں دعائیں سمیٹتے رہے۔ آپ سے تعلق رکھنے والے لوگ باخوبی جانتے ہیں کہ آپ جس مقصد کے لیے دعا فرمادیتے، بار گاہِ خداوندی میں اسے ضرور شرف قبولیت حاصل ہو کر رہتا۔ خدائے لم یزل کے حضور، آپ کی مقبولیت کی اس سے بڑھ کر اور کیا نشانی ہو سکتی ہے اور مقبولیت کیوں نہ ہوتی، کیونکہ ان کی ساری زندگی ذکرِ خدا اور عبادت بے ریا میں گزری، اور زیست کا بیشتر حصہ خلقِ خدا کی خدمت و مدد میں گزرا۔ آپ کی رحلت خانوادے اور تمام متعلقین و مریدین کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے، اللہ رب العزت لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

آپ کی رحلت کے بعد آپ کے بڑے بیٹے، میرے برادر اکبر حضرت صاحبزادہ پروفیسر ڈاکٹر محمد ساجد محمود نظامی صاحب زید شرفہ، خانقاہ معلیٰ حضرت خواجہ شاہ محمد علی کھڈی رحمۃ اللہ علیہ کے سجادہ نشین ہیں۔ آپ صحیح معنوں میں اپنے والد ذی وقار کے خَلَفِ رشید ہیں۔ متعدد صفات عالیہ میں اپنے والد بزرگوار کے صحیح وارث و جانشین ہیں۔ اللہ رب العزت میرے برادر محترم کو اپنے والد ذی شان اور حضرت خواجہ شاہ محمد علی کھڈی رحمۃ اللہ علیہ کی اخلاقی، علمی اور روحانی میراث کا صحیح وارث بنائے اور آپ کے مشن کو جاری وساری رکھنے اور مزید اوج و بلندی پر پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔۔۔

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

یاسر اقبال شعبۂ اردو، اسلام آباد

پیر فتح الدین صاحبؒ ہماری ظاہری زندگی سے کچھ ماہ پہلے ہی ہم سے پردہ فرما گئے ہیں لیکن ان کی موجودگی کا احساس ہمیں ہر لحہ چہار سو ہوتا رہتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں اور اپنی فکر و نظر سے ہماری رہنمائی فرما رہے ہیں اور یہی ایک صاحب معرفت، صاحبِ توفیق بزرگ کا اعجاز ہوتا ہے۔ خانقاہ محمد علی مکھڈیؒ، مکھڈ شریف کا رشد و ہدایت کا یہ چراغ اپنے ظاہری وجود کے ساتھ تو گل ہو گیا لیکن اپنی فکر و تعلیمات کے اعتبار سے آج بھی خانقاہ معلیٰ میں روشن و تابندہ ہے۔ جن لوگوں کو حضرت کی صحبت میں بیٹھنا نصیب ہوا ان کے اذہان و قلوب ہمیشہ آپ کی تعلیمات و فکر سے منور رہے ہیں۔ مجھ ناچیز کو اکثر اپنے مرشد خانے میں حاضری کا شرف ملا ہے اور کئی مرتبہ حضرت کی قدم بوسی سے ہم کنار ہوا ہوں۔ ویسے تو میری ارادت مندی خانقاہِ معلیٰ محمد علی مکھڈیؒ کے تمام بزگانِ چشت سے کئی پشتوں سے چلی آرہی ہے اس لیے دل میں مکھڈ شریف کے لیے عقیدت و محبت کی کونپلیں ہمیشہ پھوٹتی رہتی ہیں۔ جب دنیاوی جھنجھٹ سے دل اکتا جاتا ہے تو دل مکھڈ شریف کی راہ لیتا ہے۔

خانقاہ مکھڈ شریف کے بزرگان چشت میں مجھے زیادہ تر پیر فتح الدین صاحبؒ کی قربت نصیب ہوئی ہے اس کی کئی وجوہات ہیں۔ میں جب بھی مکھڈ شریف میں حاضری دیتا پیر فتح الدین کی زیارت کرتا اور دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہتا۔ میں نے بہت قریب سے حضرت کی زندگی کا مشاہدہ کیا۔ ان کی شخصی صفات میں سے کئی ایسی ہیں جن کو میں قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

زندگی کے آخری ایام میں وہ خانقاہ معلیٰ میں مقیم ہو کر رہ گئے تھے اور ہمیشہ زائرین کے لیے اپنے آپ کو وقف کیے رکھا۔ شروع میں ایک دن، میں نے پیر فتح الدین صاحب سے مکھڈ شریف کا تاریخی تعارف پوچھا تو انھوں نے مجھے اس شہر کے بارے میں بتانا شروع کیا اور رکیا حافظہ تھا۔ (ماشاءاللہ) آپؒ نے اس شہر کی قدامت اور اس کے جغرافیائی منظرنامے کی اس طرح وضاحت کی کہ آج بھی لفظ بہ لفظ یاد ہے۔ آپ نے فرمایا! مکھڈ شریف ضلع اٹک میں دریائے سندھ کے کنارے پر سنگلاخ اور چٹیل پہاڑوں کے درمیان ایک چھوٹا سا تاریخی شہر ہے۔ یہاں کی مقامی آبادی کا ذریعہ معاش تجارت رہا ہے۔ زمانہ قدیم سے ہی یہاں کے باشندے دریائے سندھ کے ذریعے تجارت کرتے رہے ہیں جس کے آثار آج بھی دریا سندھ کے کنارے پر موجود "پتنوں" (پتن کی جمع) کی شکل میں نظر آتے ہیں جہاں تجارتی کشتیاں لنگر انداز ہوتی تھیں۔ یہاں کے بازار کا اپنا اختصاص و امتیاز ہے، تمام بازار چھتا ہوا اور مکھڈ کی پرانی آبادی کی بل کھاتی گلیاں جنھیں ایک خاص انداز سے چھتا گیا، آج بھی عظمتِ رفتہ کی یاد دلاتی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ گرمیوں کی دوپہر تھی اور میں نے پیر فتح الدینؒ کے پاس بیٹھا مکھڈ شریف کی تاریخ سن رہا تھا اور جیسے ہی گفتگو تمام ہوئی میں نے مکھڈ کا بازار اور شہر کی گلیوں کو دیکھنے چل

پڑا۔ واپس آیا نمازِ ظہر ادا کی اور پھر حضرت کی خدمت میں جا بیٹھا حضرت نے پوچھا کہ ہاں! شہر دیکھ آئے ہو؟ کیسا لگا؟ میں نے کہا حضور جیسا آپ نے شہر سے متعلق بتایا ویسا پایا۔ پیر فتح الدین صاحب کی شخصیت کی ایک خاص بات جو مجھے منفرد لگی وہ یہ تھی کہ آپ کا اندازِ گفتگو اور شخصی اطوار روایتی بزرگوں والے نہیں تھے۔ آپ ایک بیدار مغز شخصیت کے مالک اور زمانے کے نبض شناس تھے۔ آپ ہمیشہ نئی نسل کے لیے فکر مند رہتے تھے۔ تمام عمر بہ نفسِ نفیس درس و تدریس کی خدمات سر انجام دیتے رہے آپ کو نئے زمانے کی نئی اقدار اور کروٹ لیتے ہوئے تہذیب و تمدن میں ہمیشہ نسلِ نو کی فکر رہتی تھی۔ آپ کے بقول بچوں کی تربیت کے لیے گھر کے ماحول کو پاکیزہ ہونا چاہیے کیوں کہ گھر ہی بچے کی ابتدائی درس گاہ ہوتی ہے۔ آپ ہر اُس کام کو سراہتے تھے جس میں مخلوقِ خدا کا فائدہ اور آسانی ہوتی۔ ایک دفعہ حضرت اپنے ارادت مندوں میں جلوہ افروز تھے کہ ایک مرید نے سیاسی گفتگو چھیڑ دی اور مخالف پارٹی پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ عوام بھوک سے مر رہی ہے یہ ہیں کہ پل، سڑکیں اور میٹرو بسیں چلانے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ حضرت کو سنتے ہی جلال آگیا آپ نے فرمایا کہ اگر ان کاموں سے مخلوق خدا کو فائدہ پہنچے والا ہے تو کوئی برا نہیں ہو رہا۔ پھر فرمایا اب دیکھو مقامی ٹرانسپورٹ میں لوگ سفر کرتے ہیں تو کنڈیکٹروں کے ناروا سلوک کے ساتھ ساتھ ہر طرح کی خواری برداشت کرتے ہیں لیکن میٹرو بس میں لوگ باعزت ہو کر سفر کریں گے نہ ہی عزت نفس مجروح ہو گی الٹا سفر کی آسانی بھی ہو گی۔ لہذا ہمیں ذاتی اختلافات اور تعصبات سے بالاتر ہو کر تمام مخلوقِ خدا کی بہتری کا سوچنا چاہیے۔

حضرت کی طبیعت کو سماع سے ایک خاص تعلق تھا۔ سماع فہمی کا یہ حال تھا کہ دورانِ سماع حضرت کی آنکھیں ہمیشہ اشک بار رہتی تھیں ۔حافظے کا معیار یہ تھا کہ پورا کا پورا کلام حضرت کو ازبر ہوتا جہاں کہیں قوال سے مصرع یا لفظ آگے پیچھے ہوتا حضرت فوراً اصلاح فرما دیتے۔ عموماً دورانِ سماع حضرت سوز و کیف کی صورتحال سے دوچار رہتے تھے۔ مجھے بھی حضرت کو سنانے کا شرف ملا ایک دفعہ میں کھڈ شریف میں نے کھڈ شریف میں شب بسری کا پروگرام بنایا اور ساتھ اپنا ہارمونیم بھی لے گیا۔ نمازِ عشا کے بعد حضرت کی فرمائش پر میں نے مولانا محمد علی کھڈیؒ کی سہ حرفیاں راگ بھیرویں میں ہیر کی طرز پر پڑھیں تو حضرت بہت خوش ہوئے اور دعا دی۔

عمر کے آخری حصے اب جب بھی میں کھڈ شریف حاضر ہوتا حضرت کے پاس بیٹھنا ضروری سمجھتا۔ آخری ایام میں زیادہ تر آپ کم گفتگو فرماتے تھے بس حال و احوال اور رسمی سلام دعا کے بعد خاموش ہو جاتے لیکن یہ خاموشی زیادہ طویل نہیں ہوتی تھی تھوڑی دیر کے بعد کوئی نہ کوئی علم و حکمت کا جملہ زبان سے صادر ہو جاتا تھا۔ اس طرح کبھی عالم استغراق اور کبھی عالمِ حواس کی صورتحال سے حضرت کی طبعت دوچار ہوتی رہتی تھی ۔ حضرت پیر فتح الدینؒ کا مزاج درویشانہ اور طبیعت قناعت پسندانہ تھی۔ ارادت مندوں نے سخت حالتِ بیماری میں بھی آپ کو ہمیشہ صابر و شاکر پایا۔ تمام عمر سادگی میں بسر کر دی۔ تصنع و بناوٹ سے ہمیشہ دور رہے۔ ہمیشہ مخلوق خدا کے لیے مہربان رہے اور کھڈ شریف میں علمی و فکری خدمات سر انجام دیتے رہے لیکن صلے کی تمنا اور ستائش سے بے نیاز ہو کر۔۔۔ اللہ تعالیٰ کی آپؒ پر کروڑوں رحمتیں ہوں۔ آپ بھلے آپ کا گھرانہ بھلا۔

چلی سمت غیب سے کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا

مگر ایک شاخ نہالِ غم جسے دل کہو سو ہری رہی

حضرت مولانا پیر محمد فتح الدین چشتیؒ

پروفیسر بشیر احمد رضوی

خانقاہ مُعلّٰی حضرت مولانا الشاہ محمد علی صاحب چشتی نظامیؒ اپنی مخصوص روایات اور منفرد مزاج کی بدولت وطن عزیز کی خانقاہوں میں بالعموم اور چشتی خانقاہوں میں بالخصوص امتیازی مقام کی حامل ہے۔ علم و عمل، تدریس و تبلیغ، وعظ و نصیحت، زہد وللھیت اور فقر غیور کی ادائے قلندرانہ و درویشانہ اس خانوادے کے ہر فرد کا طرہ امتیاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے خانقاہی نظام کے اشد نقاد جب مکھڈ شریف کی خانقاہ چشتیہ کے شب وروز کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں:

جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

اس ناچیز کو جب ۱۹۷۸ء میں اپنے والد گرامی (استاد حاجی میاں احمد صاحب مرحوم و مغفور) کی معیت میں حضرت ثانی صاحبؒ کے عرس کے موقع پر مکھڈ شریف کی پہلی حاضری نصیب ہوئی تو دیگر مشائخ کی زیارت کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا پیر محمد فتح الدین صاحب کا دیدار بھی نصیب ہوا۔ حضرتؒ کا دور شباب تھا۔ سرخ و سپید چہرے پر سیاہ ترشی ہوئی ریش مبارک بہت دلکش منظر پیش کر رہی تھی لیکن حضرت میں روایتی صاحبزادگی والی کوئی ادا نہ تھی بلکہ خانقاہ کے ایک عام درویش کی طرح کا طرز عمل تھا۔ نماز عشاء سے قبل جب لنگر کھلایا گیا تو حضرت خود روٹیوں کا ٹوکرا اٹھائے زائرین کو روٹیاں بانٹ رہے تھے۔

اس سے قبل نکتہ چینوں کی باتیں سن سن کر یوں لگتا تھا جیسے دنیا خانقاہی نظام سے اکتا چکی ہے اور اب ادھر کچھ بھی نہیں بچا لیکن جب حضرت فتح الدین صاحب کا بے تکلف انداز دیکھا اور نہایت سادہ الفاظ میں عالمانہ گفتگو سنی تو دل پکار اٹھا:

اپنے صحرا میں آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

بعد ازاں جب بھی حضرت سے شرف ملاقات حاصل ہوتا آپ تاریخ و سیرت سے اپنا حاصل مطالعہ بڑے ہی دلکش انداز میں بیان فرمایا کرتے تھے۔ آپ کی گفتگو نہایت بامقصد اور متانت و سنجیدگی کا مرقع ہوتی تھی۔ آپ برصغیر کی آزادی کی تحریکوں سے بہت اچھی طرح واقف تھے اور اس میں مشائخ کے کردار خاص طور پر اپنے جد بزرگ حضرت مولانا احمد دین صاحبؒ کے مجاہدانہ کردار سے بخوبی آشنا تھے اور ہمیشہ اپنے انہی اکابر کے طریقے کے پابند اور انہی کی فکر صحیح کے ترجمان بن کے رہے۔

ملک پاکستان میں نظام مصطفٰی کے نفاذ کے داعی علمائے حق کے طرف دار تھے اور جب ایک سیاسی جماعت نے نیا پاکستان

☆ شعبہ انگریزی، گورنمنٹ کالج، پنڈی گھیب (اٹک)

بنانے کے نعرے سے اپنی انتخابی مہم کا آغاز کیا تو حضرت پیر فتح الدین صاحب نے اپنا ردعمل یوں کہہ کے ظاہر فرمایا کہ ہمیں پرانا پاکستان ہی چاہیے نیا پاکستان بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

حضرت مولانا پیر فتح الدین صاحبؒ اپنے عالی مرتبت آبائے کرام اور باکرامت مشائخ عظام کی طرح جاہ پرستی سے نفور اور جاہ پسندوں اور دنیاداروں سے ہمیشہ دور رہتے تھے۔ کسی دنیاوی منصب والے کی خوشامد سے اپنے مقام اور اپنے بزرگوں کے وقار کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ کبھی بھی بئس الفقیر علی باب الامیر کا داغ بدنما اپنی عبائے فقر پر نہیں لگنے دیا۔

موضع لنگڑیال میں ایک محفل میں مجھے بیان کرنا تھا اور حضرتؒ مہمان خصوصی و صدر محفل کی حیثیت سے تشریف فرما تھے۔ دوران گفتگو حضرت میاں ابراھم صاحب لنگڑیالیؒ کا ذکر خیر فرمایا اور حضرت مولانا محمد علی صاحبؒ سے ان کی نسبت کو بیان کیا اور اسی گفتگو میں فرمایا کہ "کھڈ شریف میں کچھ بھی نہیں اور سب کچھ ہے"۔ آپ کے ارشاد کا مقصد یہ تھا کہ بظاہر کھڈ شریف میں مال دنیا کی ریل پیل نہیں لیکن جو رب تعالی کے بھروسے پر ادھر بیٹھے ہوئے ہیں انہیں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوتی بلکہ قانع وشاکر بن کے خدمت دین محمدی ﷺ میں مصروف ہیں۔ حضرتؒ متصلب سنی حنفی بزرگ تھے اور محمد مصطفی ﷺ کے محامد و محاسن کا بیان اور نعت شریف سن کر بڑا لطف لیتے اور اپنی قلبی محبت کا اظہار فرماتے تھے۔

پنڈی گھیب میں مولانا صاحبزادہ معین شہزاد صاحب کے زیر اہتمام ایک محفل ہو رہی تھی جس میں نعت و بیانات کے علاوہ قوالی بھی شامل تھی۔ اس محفل میں حضرت مولانا پیر صالح گل صاحبؒ اور مولانا پیر فتح الدین صاحبؒ بھی موجود تھے۔ دوران سماع مشائخ چشت کے آداب سماع کو مد نظر رکھتے ہوئے سماعت فرما رہے تھے۔ اسی دوران مجھ سے فرمایا قوال سے کہیں قوالی "بھر دو جھولی مری یا محمد ﷺ سنائے۔ آپ کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ آپ کی اس فرمائش سے آپ کے ذوق سلیم کے ساتھ ساتھ آپ کے عقیدے کا بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ نبی کریم ﷺ کو زندہ اور غلاموں کی مدد پر قادر مانتے تھے۔

حضرت پیر فتح الدین صاحبؒ کی بندہ نوازی کا ایک واقعہ ہدیہ قارئین کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ۲۰۱۷ء میں جب حرمین شریفین کی حاضری و عمرہ کی ادائیگی سے بہرہ اندوز ہو کر یہ عاجز واپس آیا تو چند دن بعد نماز ظہر کے وقت مسجد میں اطلاع ملی کہ حضرت پیر صاحب کھڈ شریف غریب خانے پر تشریف لائے ہیں۔ یہ جان کر بڑی خوشی حاصل ہوئی کہ مجھ جیسے عام سے بندے سے ملاقات کے لیے حضرت صاحب نے میرے گھر قدم رنجہ فرمایا ہے۔ میں حاضر خدمت ہوا تو میری حیرت کو دیکھ کے فرمایا کہ آپ کے والد صاحب کی ہمارے ساتھ عقیدت و محبت ایسی تھی جسے ناپا تولا نہیں جاسکتا۔ میں اسی تعلق کو نبھاتے ہوئے آپ سے ملنے آیا ہوں۔ ع:

بر کریماں کارہا دشوار نیست

۱۹۹۹ء میں جب اس ناچیز نے فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے حرمین شریفین جانا تھا روانگی سے قبل کھڈ شریف حاضر ہوا۔ جب حضرت مولانا پیر صالح گل صاحبؒ کی خدمت میں اپنے سفر سعادت منزل کا ذکر کیا تو بڑے خوش ہوئے اور فرمایا سرکار کی بارگاہ

میں مجھ مسکین کا سلام پیش کیجے گا۔ حضرت صالح گل صاحب سے مل کے جب حضرت مولانا پیر محمد فتح الدین صاحب کے قدموں میں حاضر ہوا تو فرمانے لگے۔ مواجہہ شریف پر کلمہ شہادت پڑھ کر نبی کریم ﷺ کو اپنے ایمان کا گواہ بنائیے گا۔ مجھے اس رہنمائی سے بڑا نور و سرور حاصل ہوا۔ الحمد للہ فجزاہ اللہ خیرا۔

یہ چند گزارشات اپنے برادران طریقت کی خدمت میں پیش کی ہیں تاکہ ذکر صلحاء میرے لیے اصلاح فکر و عمل کا ذریعہ بن جائے۔

وہ شہسوارِ طریقت وہ راہِ حق کا نقیب

ارشد محمود ناشادؔ

وہ شہسوارِ طریقت وہ راہِ حق کا نقیب
شکستِ روح کا دارو ، دل و نظر کا طبیب

وہ جس کے فیض سے روشن رہا چراغِ کھڈ
وہ جس کے لطف سے سرشار تھے امیر و غریب

وہ خوش کلام تھا ، سنتے تھے سارے اُس کی بات
وہ خوش مزاج تھا رہتی تھی خَلقْ اُس کے قریب

دل و نگاہ کی دُنیا کا حکمراں تھا وہ
نہ کوئی اس کا مخالف ، نہ کوئی اُس کا رقیب

مجھے بھی اس کی زیارت کا ہے شرف حاصل
متاعِ حسن سے روشن رہا ہے میرا نصیب

وہ رفتگاں کی نشانی تھا ، عجز پیکر تھا
سادگی کا نمونہ ، ادا ادا میں عجیب

وہ جس کے فیض سے ہوتے رہے ہیں دل سیراب
وہ جس کی دید سے ملتا رہا قرار و شکیب

بجھا دیا ہے ہوائے قضا نے آخر کار
چراغِ شہر محمد علی ولي نجیب
-----.۲۰۲۲ء------
دُعا ہے لب پہ کہ ہو "سرفراز خُلد بریں"
---۱۴۴۴ھ---
خدا کرے کہ ہو قربِ حبیب اس کا نصیب

نورِ چشمِ فضل دیں

محمد انور بابر

شہ سلیمان تونسوی ہیں آفتابِ چشتیہ
ضوفشاں جس کے اُجالوں سے ستارے بے شمار

نور چشمِ فضل دیں ، احمد محمد سرپرست
ان گلابوں سے چمن میں تا ابد چشتی بہار

اے کہ زین الدین جیسے کامل ہیں تیرے سُسر
اس لیے باغِ مکھڈی میں ہے بہارِ نو بہار

آستانہ ہے ترگ میں جن کا ایسا کہ جہاں
علم و حکمت کے خزینے بنتے ہیں لیل و نہار

خدمتِ خلقِ خدا میں زندگانی کی بسر
سیرتِ خیر الوری ﷺ سے خُلقُ میں تیرے نکھار

خوش بیان و خوش ادا ، نازِ مکھڈ ، بالغ نظر
عالم و فاضل ، مدرس ، باعمل ، عالی وقار

خالد و ساجد نظامی اور زاہد ہیں پِسر
تازہ ہوا احمد محمد فضل کا یوں مرغزار

آپ کا خواجہ محرم سال ہجری (۱۴۴۴) میں وصال
خانقاہِ مولوی میں غربی جانب ہے مزار

خواجگانِ چشت کا بابرؔ بھی ہے ادنیٰ گدا
جو طلب گارِ کرم ہے ، ہو نظر والا تبار

قطعہ تاریخِ وصال

بشیر رضوی

حیف از ما رفتہ است
شیخِ کامل ، فتح دیں

گنجِ عرفانِ خدا
شد نہاں اندر زمیں

حق نما و حق نگر
صاحبِ حق الیقیں

خوش مزاج و خوش نگر
خلق پاکاں را امیں

در محرم رفتہ است
سوئے فردوسِ بریں

سال وصلش یاد کُن
فخر اقراں ، حصن دیں

۲۱۲+۱۲۳۲(۱۴۴۴)

مستمندم بر درش
اومر انعم المعین

بزم او بزم کرم
من زِ بزمش خوشہ چیں

سبز بادا گورِ او
تا بقائے آب و طیں

رحم فرماید بر اُو
رحمۃ اللعالمیں

تا بود اندر جناں
با نیاگاں ہم نشیں

NIZAMIA DAR-UL-ISHA'AT KHANQAH-E-MO'ALLA
HAZRAT MOLANA MUHAMMAD ALI MAKHADI (R.A).
MAKHAD SHAREEF (ATTOCK)